لاہور میں دفن خزینے

حمیر ہاشمی
محمد اسلم انصاری
ممتاز حسین نعیم

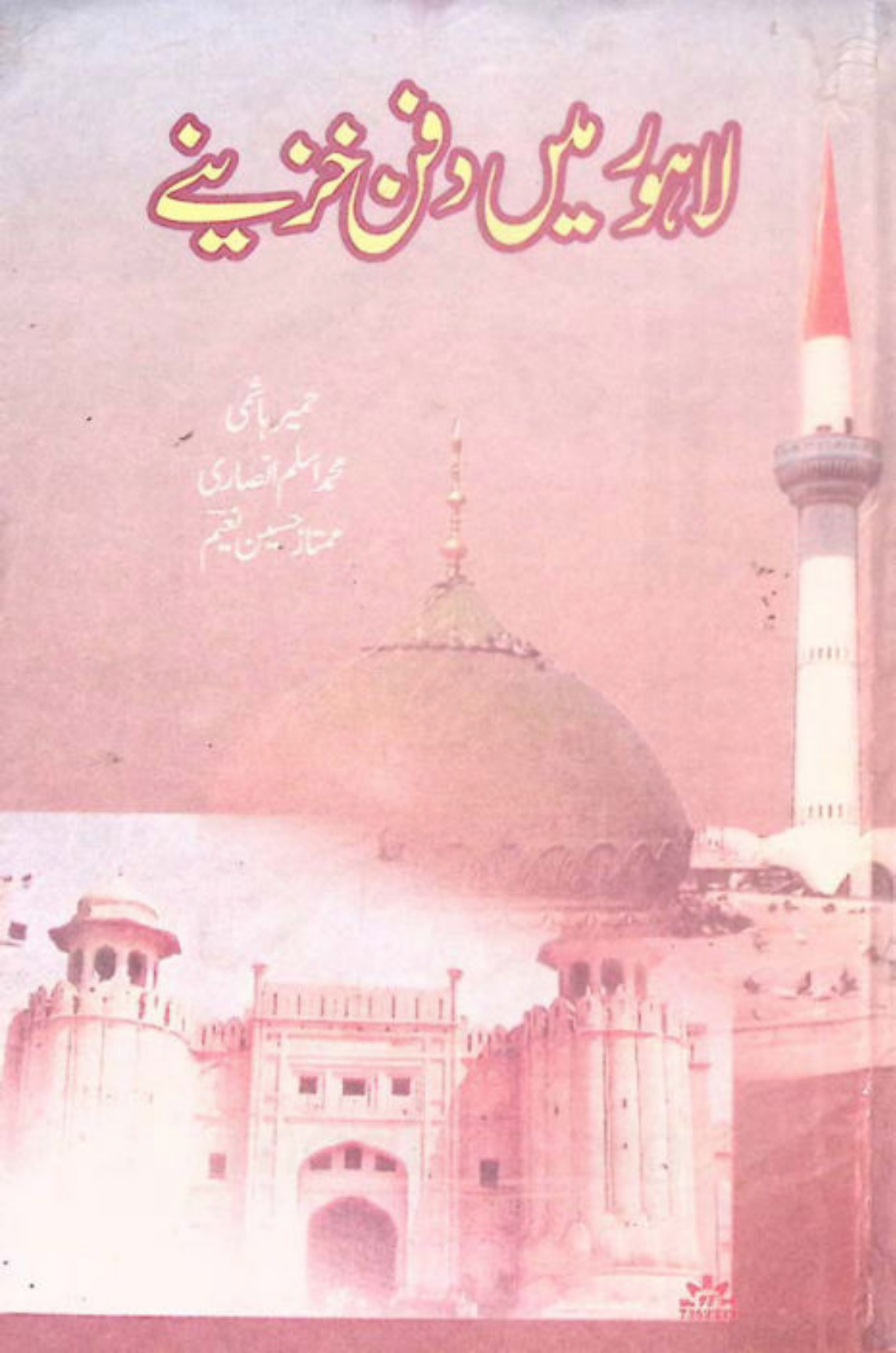

لاہور میں دفن خزینے

حمیر ہاشمی

ایم۔اے نفسیات (پنجاب)

ایم۔اے نفسیات (امریکہ)

سابق اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اطلاقی نفسیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

سابق صدر، شعبہ نفسیات، گورنمنٹ کالج، لاہور

محمد اسلم انصاری

ایم۔اے جغرافیہ

سابق وائس پرنسپل، صادق پبلک سکول، بہاولپور

ممتاز حسین نعیم

ایم۔اے اردو

ایم۔اے تاریخ

لیکچرار گورنمنٹ دیال سنگھ کالج، لاہور

علم و عرفان پبلشرز، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	.....	لاہور میں دفن خزینے
تالیف	.....	حمیر ہاشمی۔ محمد اسلم انصاری ممتاز حسین نعیم
ناشر	.....	علم و عرفان پبلشرز' لاہور
اہتمام	.....	راجہ نعمان
پرنٹرز	.....	گنج شکر پرنٹرز' لاہور
بار اول	.....	ایک ہزار
سن اشاعت	.....	1998ء
قیمت	.....	-[redacted] روپے

ملنے کا پتہ

علم و عرفان پبلشرز

C-7 مارتھر سٹریٹ '9- لوئر مال' عقب میاں مارکیٹ'

اردو بازار لاہور فون 7352332

انتساب!

وطنِ عزیز پاکستان کے نام

لاہور میں دفن خزینے

(لاہور میں دفن معروف علمی، ادبی، سیاسی، سماجی شخصیات کے حالات، ان کی خدمات کی تفصیل اور مقابر کی نشاندہی)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

(غالب)

فہرست

(شخصیات کی فہرست مختلف شعبہ جات کے زیرِ عنوان حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے)

پیش لفظ ۱۱
حرف وضاحت ۱۳
تعارف شہر لاہور ۲۵

صوفیاء کرام:

۱۔ حضرت داتا گنج بخشؒ ۲۹
۲۔ حضرت میاں میرؒ ۳۳
۳۔ حضرت مادھولال حسینؒ ۳۸
۴۔ حضرت شاہ ابو المعالیؒ ۴۳
۵۔ حضرت موج دریا بخاریؒ ۴۶
۶۔ سید عزیز الدین مکیؒ ۴۷
۷۔ سید شاہ جمال قادریؒ ۴۸
۸۔ سید مٹھا لاہوریؒ ۵۰
۹۔ شاہ عنایت قادریؒ ۵۱
۱۰۔ شیخ محمد طاہر بندگیؒ ۵۵

مذہبی سکالرز اور علماء کرام:

۱۱۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ۵۷
۱۲۔ مولانا احمد علی لاہوری ۶۳
۱۳۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی ۶۵

۱۴۔ مولانا محمد مالک کاندھلوی ۶۹
۱۵۔ علامہ سید صفدر نجفی ۷۱
۱۶۔ مولانا سید دیدار علی شاہ ۷۵
۱۷۔ مولانا سید احمد ابوالبرکات ۷۹

سیاسی / سماجی شخصیات:

۱۸۔ بیگم جہاں آراء شاہنواز ۸۲
۱۹۔ چوہدری افضل حق ۸۵
۲۰۔ سرسکندر حیات ۸۷
۲۱۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی ۹۱
۲۲۔ ایاز غزنوی لاہوری ۹۶

تاریخی شخصیات:

۲۳۔ غازی علم دین شہید ۹۹
۲۴۔ قطب الدین ایبک ۱۰۴
۲۵۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ۱۰۷
۲۶۔ ملکہ نور جہاں ۱۱۲
۲۷۔ نورالدین محمد جہانگیر ۱۱۶

اہل قلم شخصیات:

۲۸۔ آغا حشر کاشمیری ۱۲۱
۲۹۔ آغا شورش کاشمیری ۱۲۶
۳۰۔ اختر شیرانی ۱۳۱
۳۱۔ احسان دانش ۱۳۵
۳۲۔ استاد دامن ۱۴۰
۳۳۔ تصدق حسین خالد ۱۴۵
۳۴۔ چراغ حسن حسرت ۱۴۸
۳۵۔ حبیب جالب ۱۵۴

۳۶۔ حفیظ جالندھری	۱۵۷
۳۷۔ حمید نظامی	۱۶۲
۳۸۔ خدیجہ مستور	۱۶۵
۳۹۔ خواجہ دل محمد	۱۶۸
۴۰۔ خلیفہ عبدالحکیم	۱۷۳
۴۱۔ سیف الدین سیف	۱۷۶
۴۲۔ سعادت حسن منٹو	۱۸۰
۴۳۔ سید وقار عظیم	۱۸۹
۴۴۔ سید سجاد باقر رضوی	۱۹۳
۴۵۔ سجاد حیدر	۱۹۶
۴۶۔ سید امتیاز علی تاج	۱۹۹
۴۷۔ سید عابد علی عابد	۲۰۵
۴۸۔ ساغر صدیقی	۲۱۰
۴۹۔ سید عبداللہ	۲۱۵
۵۰۔ شیخ سر عبدالقادر	۲۱۹
۵۱۔ شیخ محمد اکرام	۲۲۴
۵۲۔ شوکت تھانوی	۲۲۸
۵۳۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	۲۳۴
۵۴۔ ظہیر کاشمیری	۲۳۹
۵۵۔ عبدالحمید عدم	۲۴۱
۵۶۔ عبدالمجید سالک	۲۴۵
۵۷۔ علامہ محمد اقبال	۲۴۸
۵۸۔ عبدالسلام خورشید	۲۵۳
۵۹۔ فیض احمد فیض	۲۵۸
۶۰۔ کنہیالال ہندی	۲۶۷
۶۱۔ مولوی فیروزدین	۲۶۹
۶۲۔ مولانا غلام رسول مہر	۲۷۴

۶۳۔ میاں بشیر احمد ۲۷۹

۶۴۔ مہر غلام بھیک نیرنگ ۲۸۲

۶۵۔ محمد طفیل ۲۸۶

۶۶۔ مولانا محمد حسین آزاد ۲۸۹

۶۷۔ محمد دین تاثیر ۲۹۵

۶۸۔ ایم۔ اسلم ۳۰۰

۶۹۔ مولانا صلاح الدین احمد ۳۰۳

۷۰۔ ناصر کاظمی ۳۰۷

۷۱۔ نظام دین ۳۱۰

۷۲۔ واصف علی واصف ۳۱۴

مصور:

۷۳۔ استاد اللہ بخش ۳۱۸

۷۴۔ ایناموکا احمد ۳۲۱

۷۵۔ شاکر علی ۳۲۴

۷۶۔ عبدالرحمٰن چغتائی ۳۲۸

کھلاڑی:

۷۷۔ رستم زماں گاما پہلوان ۳۳۲

افواج پاکستان:

۷۸۔ میجر شبیر شریف شہید (نشان حیدر) ۳۳۴

پیش لفظ

شہر لاہور پنجاب کا دل ہے اور پوری دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ یہ شہر نہ صرف یہ کہ اپنی ثقافت بارہ دروازوں، تہواروں زندہ دلان شہریوں، کھانوں، کھیل تماشوں، رنگینیوں، سینما گھروں، باغات اور تھیٹروں کی وجہ سے مشہور ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تہذیبی، علمی ادبی، سیاسی اور مذہبی روایات کا بھی امین ہے۔ اگر یہ شہر ایک طرف صوفیائے کرام کی سرزمین ہے تو دوسری طرف علم و ادب کا گہوارہ ہونے کے ناطے کالجز کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ اس شہر میں مختلف ادوار میں بے شمار گنج ہائے گراں مایہ افراد نے جنم لیا جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اپنے کارناموں کی زریں داستانیں بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

ہم نے اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب مرتب کرنے کی سعی کی ہے کہ اس شہر کے ان آسودۂ خاک درخشندہ ستاروں کی بزم سجا کر گلدستہ لاہور تیار کیا جائے جس میں ان تمام مذہبی، علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی شخصیات کا تذکرہ کیا جائے جن کی زندگیاں ہمارے اس شہر کی عظمت کی ضامن ہیں تاکہ ہم اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں اپنے ان محسنوں کے کارناموں اور آخری آرام گاہوں سے آگاہ ہو سکیں۔

ہم نے اس کتاب میں حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ایسی تمام ہستیاں جو اپنے اپنے فن میں یکتا اور کامل تھیں ان کی زندگی کے مختصر حالات، کارنامے اور ان کی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کرنے کے بعد ان کی قبروں کی درست نشاندہی کی جائے تاکہ اس کتاب کے قارئین میں تحریک پیدا ہو کہ وہ اپنے ان عظیم المرتبت بزرگوں کی قبروں کی زیارت فرمائیں اور ان کی خدمات کو خراج

تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے افکار پر عمل پیرا ہوں تاکہ ہم بھی ان یگانہ روزگار شخصیتوں کی طرح زمین کا بوجھ اٹھانے والوں میں شامل ہو جائیں نہ کہ محض اس زمین کا بوجھ بنے رہیں۔

لاہور میں دفن عظیم شخصیات میں سے ۱۰۰ افراد کا انتخاب کر کے ہم اس کتاب میں ان کی حیات اور خدمات جامع انداز میں پیش کر رہے ہیں۔

کتاب کی تکمیل میں مواد اکٹھا کرنے کے علاوہ ایک مرحلہ قبروں کی درست نشاندہی کا تھا جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے پیش نظر یہ مقصد بھی تھا کہ کتاب کو پڑھنے والا اگر کسی شخصیت کی قبر کی زیارت کرنا چاہتا ہے تو وہ آسانی سے مطلوبہ مرقد تک پہنچ سکے۔

ہماری کتاب میں شامل زیادہ تر شخصیتیں قبرستان میانی صاحب میں آرام فرما ہیں۔ یہاں قبروں کی نشاندہی کے سلسلے میں سید محمد صفدر صاحب اسسٹنٹ سیکورٹی آفیسر قبرستان، میانی صاحب اور سیکورٹی آفیسر محمد کلستر صاحب نے ہر ممکن تعاون کیا' ہم ان کے ازحد شکر گزار ہیں۔

اس کتاب کی تکمیل کے سلسلے میں وہ تمام دوست احباب جنہوں نے تعاون کیا ان کا بہت بہت شکریہ۔ فرداً فرداً ہر شخص کا نام اس لیے نہیں دیا جا رہا ہے کہ ہمارا مقصد اپنے اسلاف کا نام زندہ کرنا ہے' اپنی ناموری نہیں۔

کتاب کے آخر میں کتابیات کی فہرست بھی بڑی احتیاط سے درج کی گئی ہے۔ جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کتاب اور مصنف' مولف کا مکمل نام درج ہو لیکن اگر سہواً کسی کتاب یا مصنف کا نام رہ گیا ہو تو ان سے پیشگی معافی چاہتے ہیں وہ افراد اس کو کار خیر تصور کر کے درگزر فرمائیں۔

اب آپ ان خزینوں سے آگہی حاصل کریں جو ہمارے شہر لاہور میں دفن ہیں مگر شہر کی ہنگامہ خیزی کی بدولت عہد پارینہ کا قصہ بنتے جا رہے ہیں۔ آئیں آج ان خزانوں تک پہنچ کر مالا مال ہو جائیں۔

مولفین

حرف وضاحت

حمیرہاشمی

اب سے کچھ عرصہ پہلے کچھ لوگوں کی تحریک پر میں نے ایک مقامی سکول میں ملازمت اختیار کی۔ اپنے نفسیاتی مطب کے گوشہ عافیت سے نکل کر سکول میں ملازمت کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ تقریباً" دس برس کی گوشہ نشینی کے بعد دل میں واپس "نارمل" دنیا میں جانے کی خواہش بیدار ہوئی تھی۔ اور پھر جب سکول کی نوکری کی آفر ہوئی تو سوچا کہ اس ملازمت کے ذریعے معصوم ذہنوں کو بقول شخصے "زہر آلود" بھی کیا جا سکے گا۔ یعنی وہی کام کیا جا سکے گا جس کی سزا کے طور پر سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ اور وہ اپنی اس کومٹمنٹ کی بنا پر دنیائے علم میں لافانی ہو گیا اور پھر یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ شاید "نارمل" دنیا میں جانے کی خواہش کی بھی تسکین ہو سکے گی اور ظاہر ہے اس کام کا مناسب معاوضہ یعنی تنخواہ بھی ملے گی! چنانچہ سکول کی ملازمت کی پیشکش قبول کر لی۔ یہ الگ بات ہے کہ قبولیت کے چند ہی روز بعد یہ انکشاف ہوا کہ دراصل "نارمل" دنیا تو وہ ہے جس کو مجھ سمیت بہت سے ماہرین نفسیات "غیر نارمل" کہتے ہیں۔ اور جس دنیا کو دنیا والے "نارمل" کہتے ہیں حقیقت میں وہ "ابنارمل" ہے۔ سکول کی اس دنیا میں باقی دنیا کی طرح ہی دھوکہ دہی، بے جا الزام تراشی، دوسروں سے نفرت، علم دشمنی، صداقت کشی، مصلحت کوشی اور انسان دشمنی جیسی درجنوں مغلظات بھری پڑی ہیں اور جو لوگ "مریض" بن کر میرے نفسیاتی مشورے حاصل کرتے رہے دراصل وہی وہ لوگ تھے جو درج بالا روش نہ اختیار کر سکے اور یوں "مریض" بن گئے۔ یہ سب کچھ جان کر اور محسوس کر کے سخت افسوس ہوا اور مایوسی بھی۔ لیکن اول یہ کہ

فیصلہ ہو چکا تھا اس لیے اس پر' بیرونی مشکلات اور اندرونی مایوسی کی وجہ سے عمل پیرا نہ ہونا' غالباً" بزدلی کی نشانی ہوتی اس لیے اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ اور دوم اور زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کام کے ذریعے نوجوان لوگوں سے رابطہ رہتا' نئی سوچ نئے طور طریقے دیکھنے میں آتے۔ پھر طلبا کے معصوم سوالات متجسس چہرے' جاننے کی خواہش' اور ایک آئیڈیل ازم' یہ تمام ایسی چیزیں تھیں جو میرے لیے بہت ہی پرکشش تھیں اور اب بھی ہیں اور میں ان کے درمیان بڑی خوشی سے اپنی تمام زندگی گزار سکتا ہوں۔ چنانچہ جب ملازمت قبول کر کے اپنی زندگی کے اس پہلو کے نفع و نقصان کا موازنہ کیا تو احساس ہوا کہ بے شک اس میں بہت سے منفی عناصر موجود تھے۔ لیکن اس میں موجود مثبت عناصر کا تناسب ان سے کہیں زیادہ تھا۔ اس لئے سوچا کہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اس ملازمت میں رہتے ہوئے بھی اس کے منفی اثرات کم اور مثبت اثرات زیادہ کئے جائیں۔ اس کا ایک راستہ یہ تھا کہ ان منفی عناصر پر اپنی توجہ کم مبذول کی جائے اور ان کاموں میں زیادہ توجہ اور وقت صرف کیا جائے جو میرے نزدیک مثبت کام تھے۔ اسی سوچ کی ایک کڑی موجودہ کتاب کے لکھے جانے کی تحریک تھی۔

جب سے یہ دنیا ایک گلوبل ویلج یا عالمی گاؤں بنی ہے۔ تب سے ہمارے نوجوان جہاں اپنے خطے کے گھٹن بھرے ماحول سے آزاد ہوئے ہیں وہیں وہ دنیا کے دوسرے خطوں کے تعصبات اور منفی رجحانات سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب سے ہمارے ذرائع ابلاغ دن کے چوبیس گھنٹے تمام دنیا کی ایک مسلسل اور لامتناہی تصویر کشی کرنے لگے ہیں۔ اسی وقت سے اس تصویر کشی کے مثبت اور منفی پہلو ہمارے ذہنوں پر گہرا اثر کرنے لگے ہیں۔ جہاں ہمارے بچے اور نوجوان تازہ ترین حالات اور عمدہ ترین خیالات سے آگاہی حاصل کرنے لگے ہیں وہیں وہ دوسروں کے بدترین خیالات اور مکروہ کرداروں سے بھی متاثر ہو رہے ہیں مزید یہ کہ یہ سلسلہ وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف جاری رہے گا بلکہ اس کے اثرات میں اضافہ بھی ہوتا چلا جائے گا۔ ذرائع ابلاغ کے اثرات کو معمولی جاننا یا یہ سمجھنا کہ ہمارے ذہن اس سے متاثر نہیں ہوتے' حقیقت سے روگردانی ہے۔ اس لیے

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دریا میں چھلانگ لگا دی جائے اور اپنی بات جیسے بھی ممکن ہو کہہ دی جائے اور اس امر کا بھی اہتمام کیا جائے کہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں ذاتی اور کاروباری دونوں مشکلات حائل ہوں گی۔ لیکن موجودہ دور میں جنگ یا جہاد کی غالباً یہی صورت رہ گئی ہے۔ اسی سوچ کے تحت یہ بھی دیکھا گیا کہ ہمارے ملکی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ اپنے پروگراموں کے ذریعے جو ہیروز دکھاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر افراد ہیروز تو درکنا انسان بھی کہلانے کے مستحق نہیں۔ اس لیے اگر ہمیں اپنے لوگوں اور خاص طور پر اپنے بچوں کو اپنے ہیروز سے متعارف کروانا ہو تو ہمیں یہ کام ایسے سرانجام دینا چاہیے کہ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ماضی کے ہیروز کون تھے؟ ہم ان کو ہیرو کیوں کہتے ہیں یا وہ کونسے ایسے کارہائے نمایاں تھے جو انہوں نے سرانجام دیئے جن کی بنا پر وہ عوام میں معتبر ٹھہرے؟ کیا ہیروز صرف مرد ہوتے ہیں؟ کیا فلمی ایکٹر ہی ہیروز ہیں؟ کیا کوئی سائنس دان' شاعر یا کوئی مغنیہ ہیرو (یا ہیروئن) نہیں ہو سکتا؟ کیا کوئی مذہبی شخصیت (باوجود ہمارے مختلف تعصبات کے) ہیرو کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے؟ کیا صرف مسلمان مذہبی شخصیت ہی ہیرو ہو سکتی ہے اور کیا عیسائی ہندو یا بدھ مت کی پیروکار مذہبی شخصیات ہیروز نہیں ہو سکتیں؟ یہ اور اس قسم کے درجنوں سوالات ہیں جو اس وقت ذہن میں آئے جب ہم نے اپنے بچوں کو اپنے ہیروز سے متعارف کرانے کے بارے میں اور بچوں کے اس موضوع سے متعلق تجسس کے بارے میں سوچا۔ چنانچہ تمام دنیا کے ذرائع ابلاغ کی یلغار اور اس جنگ میں حصہ لینے کی خاطر مذکورہ سکول سے متعلق ہم تین اساتذہ نے طے کیا کہ ہمیں اپنے خطے' اپنے ملک یا پھر کم از کم اپنے شہر کے ماضی کے ہیروز کا تعارف اپنے پڑھنے والوں سے ضرور کروانا چاہیے۔ یہ کتاب اسی سوچ کا ایک عملی نتیجہ ہے۔

اس ضمن میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ہیرو ہے کون؟ اگر ہم اپنے ذاتی معاشرتی یا ملکی' تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر اس سوال پر غور کریں اور ایک معروضی نکتہ نظر سے دیکھیں تو اس سوال کا جواب کچھ یوں ہو گا کہ کسی گروہ' معاشرے یا تمام دنیا کا ہیرو وہ شخص ہو گا جس کے قول اور فعل سے

بنی نوع انسان کو کوئی فائدہ پہنچا ہو۔ وہ شخص جس کے اعمال سے چند لوگوں کو فائدہ پہنچا ہو وہ ہیرو تو ضرور ہو گا لیکن محض چند لوگوں کے لیے بہ نسبت اس شخص کے جس کی ذات یا فعل و قول سے زیادہ لوگوں کو فائدہ حاصل ہو۔ پھر یہ بھی کہ ایک شخص کے اعمال سے جو فائدہ دوسرے لوگوں کو پہنچا ہو اس کی طوالت یا مدت کیا تھی؟ یعنی اگر فائدہ وقتی تھا تو فائدہ پہنچانے والا فرد ہیرو تو ضرور ہے لیکن کسی ایسے فرد کے مقابلے میں کمتر ہے جس کے اعمال سے دوسرے لوگوں کو فائدہ ہوا ہو اور اس کے ثمرات لوگوں کو زیادہ دیر تک حاصل رہے ہوں۔ تو گویا ہمارے نزدیک ہیرو وہ لوگ ہیں جو اپنی ذات یا اپنے قول و فعل سے دوسروں کے لیے زندگی آسان بناتے ہیں اور ان کا قد یا رتبہ اس پیمانہ سے متعین ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتنے افراد کو کتنی مدت تک فائدہ پہنچاتے رہے۔ عظیم ہیروز وہ ہیں جن کے اقوال و افعال سے بنی نوع انسان کو ابدی فوائد حاصل ہوئے ہیں اور نسبتاً" کم قد آور وہ ہیروز ہیں جن کے اقوال و افعال سے انسان کو نسبتاً" کم مدت کے لیے فوائد بہم پہنچے ہیں۔ فائدے سے ہماری مراد دو باتیں ہیں۔ اولاً" یہ کہ افراد کی زندگی میں آسودگی اور اطمینان میں اضافہ ہوا ہو اور ثانیاً" یہ کہ افراد کی زندگیوں میں موجود مشکلات مایوسی اور رنج و غم میں کمی واقع ہوئی ہو۔ چنانچہ جہاں کسی سائنس دان کی ایک ایجاد سے افراد کی زندگیوں میں آسودگی پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ عمل ہماری تعریف کی رو سے اس سائنس دان کو ہیرو بناتی ہے تو وہاں جب کسی استاد کے علم کی روشنی پھیلانے کے عمل سے افراد کی زندگیوں میں مایوسی اور مشکلات کم ہوتی ہیں تو استاد کا یہ عمل بھی استاد کو ہیرو بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے اور جب کسی ادیب کی تحریر کی بنا پر قاری کے ذہن میں امید اور روشنی کی کرن نمودار ہوتی ہے تو یہ امر بھی اس ادیب کو ہیرو کے درجے پر پہنچا سکتا ہے۔ یا جب کسی کھلاڑی کو انسانی طبعی حدود کی قید کو پار کر کے دیکھنے سے دوسرے افراد میں اس عمل کی تقلید کی تحریک پیدا ہوتی ہے وہ بھی اس کھلاڑی کو ہیرو بنانے کی ضامن ہے۔ جسمانی حدود کی قید کو پار کرنا یقیناً اتنا ہی بڑا کارنامہ ہے جتنا کہ انسان کی سوچ کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دینا۔ اور ایسا کرنے والے افراد حقیقی طور پر ہیروز کہلانے کے مستحق ہیں۔

جہاں مہذب دنیا نے اپنے ہیروز کی جانچ کے پیمانے طے کر لیے ہیں وہاں ہمارے معاشرے میں ابھی ایسا نہیں کیا گیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہاں ہیروز کی جانچ کے پیمانے ابھی تک ناقص ہیں۔ ابھی تک ہمارے کچھ ہیرو وہ ہیں جو حکومت وقت میں شامل افراد کے فوائد کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کرتے ہیں۔ ایسے لوگ باکمال تو ضرور ہیں لیکن ہیروز کہلانے کے مستحق نہیں کیونکہ وہ خداداد صلاحیتوں اور اپنے علم اور تربیت کو زیادہ سے زیادہ افراد کو فائدہ پہنچانے کی بجائے' دیدہ دانستہ طور پر چند محدود افراد کے فوائد کی خاطر صرف کرتے ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ قاری کو حقیقی ہیروز کی پہچان کے پیمانے کی آگہی فراہم کی جائے تاکہ وہ نادانستہ طور پر کسی کے پھیلائے ہوئے دام شنیدن میں گرفتار نہ ہو جائے۔

انجیل مقدس میں درج ہے کہ پیغمبر اپنے ہی گھر میں معتوب ٹھہرتا ہے۔ یہی بات کسی ہیرو پر بھی صادق آتی ہے۔ کوئی حقیقی ہیرو اپنے گھر' محلے' شہر اور ملک میں اکثر اوقات زیر عتاب ہی ہوتا ہے۔ پیغمبروں سے لیکر کھلاڑیوں مصوروں اور ادیبوں تک اس قول کی صداقت کی گواہیاں ہیں۔ یہاں اس امر کی مزید مثالیں دینے کی بجائے اگر ہم ان محرکات پر غور کریں جو اس عمل کی اصل وجہ ہیں تو شاید بات بہتر طور پر سمجھی جا سکے گی۔

جہاں کسی قابل ستائش عمل کے لیے لوگوں کے دل میں ایک فرد سے متعلق تحسین کے جذبات پیدا ہوتے ہیں وہیں اس شخص سے بہت سی توقعات بھی وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ ان میں بعض توقعات ایسی ہوتی ہیں جن کو پورا کرنا کسی بھی شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسلیے کوئی بھی ہیرو اپنے سے وابستہ تمام توقعات پوری نہ کر سکنے کی بنا پر اپنے چاہنے والوں میں ہی ایک حد تک غیر مقبول بھی ہوتا ہے۔ پھر مزید یہ کہ کوئی بھی ہیرو مروجہ قوانین اور اصولوں کو چیلنج کرتا ہے ان کو للکارتا ہے اور ان کو دوسروں کی بھلائی کی خاطر تبدیل بھی کرتا ہے۔ اس کے یہ اعمال فرسودہ خیالات' قوانین اور اصولوں کے پیروکاروں کے لیے موت کے پروانے کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اسی امر کا ردعمل ہمیں ہیرو کی طرف

معاشرے کے بعض افراد اور گروہوں کے منفی کردار میں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے جب کوئی فرد سماجی اور معاشرتی اقدار کو للکارے گا تو وہ ان اقدار کے محافظوں کے غیظ و غضب کا نشانہ تو بنے گا ہی۔ اسی بات کی گواہی دوسری الہامی کتابوں سمیت مقدس انجیل میں بھی دی گئی ہے۔

ہر بات کا اپنا ایک مزاج بھی ہوتا ہے۔ آج سے بہت عرصہ پہلے یہ بات یورپی اور ہمارے اپنے مورخین بھی کہہ چکے ہیں۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی نوعیت یا مزاج کی بنا پر کسی وقت بھی اور کسی بھی انداز میں کہی جا سکتی ہیں۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو صرف ایک مخصوص انداز میں کہی جاتی ہیں۔ جو باتیں ہم اس کتاب کے قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں ان کی نوعیت ایسی ہے کہ یہ ریڈیو' ٹیلی وژن یا اخبارات کے ذریعے کہی تو جا سکتی ہیں لیکن ان کا اثر اور ان کے رد اعمال نامناسب ہوں گے یعنی وہ دوسری غیر اہم باتوں کے سیلاب میں بہہ جائیں گی۔ پھر جو باتیں ہمیں کہنا تھیں وہ ایسی تھیں کہ پڑھنے والے شاید بار بار ان کا حوالہ حاصل کرنا چاہتے۔ جو کہ ٹیلی وژن یا ریڈیو سے بالکل ہی ممکن نہیں اور اخبارات کے ذریعے بہت کم عرصہ کے لیے ممکن ہے۔ جبکہ ہماری دلچسپی یہ بھی تھی کہ ہماری بات سننے (یا پڑھنے) والوں کے لیے' اگر حوالہ جات کی یہ سہولت موجود ہو تو پھر ہماری بات نسبتاً زیادہ موثر ثابت ہو سکتی تھی۔ اپنے خطے کے ہیروز کی نشاندہی کرنا اور ان کے ان کارناموں کے ذکر کا اعادہ کرنا جن کی بنا پر وہ تاریخ کے فیصلے میں ہیروز کہلائے' یہ دونوں ایسی ضروریات تھیں جو ٹیلی وژن ریڈیو' اخبارات یا رسائل کے ذریعے ممکن نہیں تھیں۔ چنانچہ اپنی بات کہنے کے لیے کتاب کو ہی ذریعہ اظہار بنایا گیا۔ اس کتاب کے لکھنے کی ایک بڑی وجہ یہی تھی۔

اور پھر ہر معاشرے کا ایک ماحول بھی ہوتا ہے جو مختلف اوقات میں بدلتا بھی رہتا ہے۔ ہمارے معاشرے کا موجودہ اجتماعی ماحول کچھ اس قسم کا ہے کہ کہنے والے کے لیے ایک مدلل اور تعصبات سے پاک بات کہنا فی الحال ممکن نہیں۔ اپنے نکتہ نظر کی دلیل نہ دے سکنے کی ایک مثال ہمارے ذرائع ابلاغ کا وہ ماحول ہے جہاں وقت کی قلت کو سب سے بڑا عذر بنا لیا گیا ہے۔ اور یوں مروجہ نقطہ ہائے نظر کے

خلاف کسی بھی اظہار خیال پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ پھر ذاتی، گروہی اور ملکی تعصبات سے پاک بات جو "سچ" پر بھی مبنی ہو وہ کہنے کے لیے بلند حوصلگی اور آئیڈیل ازم بھی درکار ہیں۔ اور یہ دونوں خصوصیات فی الحال ہمارے معاشرے میں عوامی یا اجتماعی سطح پر تقریباً" ناپید ہیں۔ اس لیے اپنی بات کہنے کے لیے ان ذرائع کو ذریعہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ اسی بنا پر کتاب کو ذریعہ اظہار بنانا مناسب سمجھا گیا۔

قدیم انسان الفاظ کی قوت سے بہت حد تک واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مناسب الفاظ ایک قریب المرگ شخص کو روبصحت کر سکتے ہیں۔ اور ایک ہنستے کھیلتے تندرست شخص کو بیمار بنا سکتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ الفاظ کے غیر مناسب استعمال سے لوگ قتل کے جرم کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں۔ انہی کے ذریعے محبوبہ کا پتھر دل موم کیا جا سکتا ہے۔ افواج کا حوصلہ بڑھا کر ہاری ہوئی جنگ جیتی جا سکتی ہے اور الفاظ ہی ایک انسان کو جانور یا دیوتا بنا سکتے ہیں۔ موجودہ صدی کی دوسری اور تیسری دہائیوں کے دوران یہ بات لیبارٹری کے تجربات سے عیاں ہوئی کہ الفاظ انسان کے طبیعیاتی اعمال پر بھی گہرا اثر رکھتے ہیں۔ تجربات نے ظاہر کیا کہ الفاظ کسی شخص کا نظام انہضام درہم برہم کر سکتے ہیں۔ اس کے نظام تنفس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور حد تو یہ کہ محض الفاظ کے ذریعے ہی کسی شخص کے جسم پر تیسرے درجے کے زخم بھی پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ پھر اسی صدی کی چوتھی، پانچویں اور چھٹی دہائیوں میں ماہرین نفسیات اور ماہرین طب نے اپنے مختلف ادوار کے تجربات کی روشنی میں اس امر پر اتفاق کر لیا کہ انسان کی تبدیلی کا ایک بہت بڑا ذریعہ اور طریقہ الفاظ کا بروقت اور مناسب استعمال ہے۔ گویا بیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات نے جہاں انسان کو ایٹمی قوت سے روشناس کرایا ہے وہیں انہی تحقیقات نے الفاظ کی قوت کا راز بھی انسان پر افشاء کیا ہے۔ اب جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ الفاظ، بنی نوع انسان میں تبدیلی کا ایک اہم ترین ذریعہ ہیں تو پھر کسی الفاظ کے غازی کو اپنے ان ہتھیاروں کے مناسب استعمال کے بارے میں کاہلی یا لاپرواہی نہیں اختیار کرنی چاہیے۔ اس کتاب کے لکھنے کا ایک جواز یہ بھی تھا۔

ذرائع ابلاغ جہاں معلومات اور تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں وہاں وہ سامعین، ناظرین اور قارئین کو سوچ، کردار اور اقدار کا ایک معاشرتی طور پر قابل قبول، نمونہ یا ماڈل بھی پیش کرتے ہیں۔ ہمارے اخبارات، رسائل کتب، ریڈیو ٹیلی وژن اور فلم ایسے ذرائع ہیں جن میں پیش کردہ کردار معاشرے کے ہیرو، ہیروئن یا ولن ہوتے ہیں۔ اب اگر پچھلے بہت سے برسوں کے دوران پیش کردہ مواد کا جائزہ لیا جائے تو کیا یہ بات درست نہیں کہ ہمارے ذرائع ابلاغ میں پیش کردہ کرداروں کی ایک کثیر تعداد ایسے افراد کی ہے جن کی زندگی کا مشن محض اپنے محبوب کی قربت ہے؟ کیا ہمارے جہالت غربت اور جرائم سے پر معاشرے میں ہمارے ہیروز محض ایسے ہی ہونے چاہئیں جو ان بڑے بڑے معاشرتی مسائل سے روگردانی کرتے ہوئے، محض محبوب کی محبت اور جدائی میں تڑپتے نظر آئیں؟ کیا ہم حقیقی معنوں میں دلیر اور بہادر لوگ نہیں تلاش کر سکتے؟ کیا صرف موجودہ ایوانوں میں بیٹھے ہوئے ٹیکس نادہندگان سمگلر، کمیشن ایجنٹ اور قرض نادہندگان ہی ہمارے ہیروز ہیں جیسا کہ ہمارے ذرائع ہمیں باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا ایک سائنس دان اپنے پیشے سے مخلص استاد، موسیقار، کھلاڑی، مصور، فن کار یا مذہبی سکالر ہمارا ہیرو نہیں کہلا سکتا؟ اپنے ذرائع ابلاغ کے پیدا کردہ جعلی ہیروز اور حقیقی ہیروز سے متعلق ان سوالات سے ایسا لگتا ہے گویا ہمارے معاشرے کی بساط ہی الٹ دی گئی ہے۔ یہاں وہ چیز جو کسی مہذب معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے ہماری عزت و تکریم کا مرکز بنی بیٹھی ہے اور قابل نفرت شخص یا کردار باعث تحسین ٹھہرا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہمارا ملک داستان امیر حمزہ کے کسی خیالی کردار یا کسی جادوگر کے قبضے میں آ گیا ہے جس نے جادو کے ذریعے اس کی بساط ہی الٹ دی ہے۔ اور بہت سی چیزیں جو قابل نفرت ہیں، قابل تجسس بن گئی ہیں۔ وہ لوگ جو پستہ قد ہیں وہ دراز قد دکھائی دینے لگے ہیں اور گدھوں کو گھوڑوں پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ بقول حافظ۔

طوق زریں ہمہ در گردن خرمی بینم

چنانچہ اس خیال سے کہ شاید اس کتاب میں پیش کردہ افراد کے حالات

زندگی ہمیں اس سحر سے آزاد کروانے میں اسم اعظم کی حیثیت رکھتے ہوں اس کتاب کے لکھنے کا مشکل کام سرانجام دینا طے پایا۔

کتاب کے مندرجات کے بارے میں ایک طریقہ کار یہ وضع ہوا کہ تینوں مصنفین اپنے اپنے خیال کے مطابق ان افراد کی ایک فہرست مرتب کرتے جن کا ذکر، ان کے خیال میں اس تصنیف میں شامل ہونا چاہیے۔ پھر ایک میٹنگ میں ان لوگوں کی شمولیت یا غیر شمولیت کے بارے میں بحث کی جاتی۔ تینوں مصنفین کو اپنی آرا کے اظہار کی کھلی آزادی تھی۔ ہم اپنے خیالات کا برملا اظہار بھی کرتے۔ اس بحث کے دوران مندرجات میں شمولیت اور عدم شمولیت کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل دیئے جاتے اور پھر اس بحث کے نتیجہ میں ایک متفقہ فہرست تیار کی جاتی۔ پھر جن لوگوں کے بارے میں لکھنا طے ہو جاتا ان حضرات کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتیں۔ پھر لکھنے کا کام ہوتا۔ اس کے بعد ہم علیحدہ علیحدہ لکھے ہوئے مواد کا فرداً فرداً مطالعہ کرتے اور بعد میں پھر ایک اور میٹنگ کا اہتمام کرتے۔ اس دوسری میٹنگ میں مندرجات پر بحث کی جاتی اور کاٹ چھانٹ کے بعد اس مواد کو متفقہ طور پر کتاب کا حصہ بنانے پر اتفاق کر لیا جاتا۔ گو یہ سلسلہ خاصہ وقت طلب تھا لیکن چونکہ اس طریقہ کار میں ایک سے زیادہ ذہن شامل تھے اس لیے ہم نے سمجھا کہ متفقہ طور پر طے شدہ مسودہ ہی کسی ایک شخص کی کوشش سے بدرجہا بہتر ہو گا۔

مصنفین میں شامل جناب محمد اسلم انصاری صاحب علی گڑھ اور پنجاب یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد معلمی کے پیشہ سے منسلک ہوئے اور پھر اپنی بیشتر زندگی اسی پیشہ میں گزار دی۔ وہ پہلے بہاول پور اور پھر لاہور میں پاکستان کے چوٹی کے سکولوں سے وابستہ رہے ہیں اور آج کل بھی یہی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

جناب ممتاز حسین نعیم صاحب پنجاب یونیورسٹی سے ڈبل ایم اے کرنے کے بعد لاہور کے ایک نمایاں پرائیویٹ سکول سے بحیثیت استاد منسلک رہے۔ اب ترقی کر کے لاہور ہی میں ایک کالج میں استاد مقرر ہو گئے ہیں اور اپنے سرکاری

فرائض کے ساتھ ساتھ لکھنے کا کام بھی کرتے ہیں۔

میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے اور پھر ٹاؤسن سٹیٹ کالج بالٹی مور' امریکہ سے نفسیات میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ مشاورتی نفسیات میں تربیت حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے نفسیات کے شعبہ جات میں پڑھانے کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ ملک پر ڈکٹیٹر شپ کے قبضے کے نتیجے میں جہاں میرے خاندان والوں' دوست احباب اور دوسرے ہم خیال لوگوں کو اذیتیں ملیں وہاں مجھے بھی اس سے پیدا شدہ ریاستی جبر کا نشانہ بننا پڑا۔

ان برسوں میں ہمہ وقت نفسیاتی معالج کی حیثیت سے میری سرگرمیاں میرے مطب تک محدود رہیں اور پھر چند سال پہلے ایک پرائیویٹ سکول میں بطور پرنسپل ملازمت کی پیش کش ہوئی۔ جس کا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں' اس وقت سے لیکر اب تک میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں معلمی کے فرائض ادا کرتا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ نفسیاتی مشاورت کا شغل بھی جاری ہے۔ اس سے پہلے کچھ کتابیں لکھ چکا ہوں۔ نفسیاتی تحقیق میں بھی مصروف رہتا ہوں۔ انہی تحقیقات پر مبنی مقالہ جات پاکستان' امریکہ اور کینیڈا کے کچھ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی نصابی کتب میں شامل ہیں۔ گویا میری زندگی' افراد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل کرنے میں گزری ہے موجود کتاب بھی اسی جذبے اور لگاؤ کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔

اس کتاب میں آپ کو علمائے دین' ادیب' فن کار' سائنس دان' فلسفی' فوجی' کھلاڑی اور سیاسی شخصیات کا تذکرہ ملے گا۔ مصنفین کی کوشش یہ ہے کہ زیر نظر شخصیت کے بارے میں بنیادی معلومات قاری تک پہنچا دی جائیں۔ جن میں اس شخص کی پیدائش سے لیکر اس کی وفات تک کے عرصے کے تمام کارہائے نمایاں کا ذکر خاص طور پر کیا جائے۔ ہماری یہ بھی کوشش رہی ہے کہ ہم اس فرد کے بارے میں اپنے قائم کردہ اچھے (یا برے) خیالات کا کم سے کم اظہار کریں تاکہ پڑھنے والے کو ایک متعصب نکتہ نظر پہنچانے کی بجائے خود قاری کو یہ موقعہ فراہم کیا

جائے کہ وہ یہ تذکرہ پڑھنے کے بعد اس فرد کے بارے میں اپنی رائے قائم کرے۔ پچھلے چند برسوں میں ہمارے ہاں یہ روش چل نکلی ہے کہ بیان کرنے والا کسی فرد (یا نظریئے) کے بارے میں اپنی آراء ایسے بیان کرتا ہے گویا بیان کردہ رائے نہ صرف حرف آخر ہے بلکہ اس کو ایک آسمانی صحیفہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اکثر اوقات بیان کردہ رائے کے حق میں کوئی دلیل بھی پیش نہیں کی جاتی۔ اور قاری (یا سننے والے) کے لیے پیش کردہ رائے سے اتفاق کرنا عین حق کے مطابق عمل قرار دے دیا جاتا ہے اور اس سے اتفاق نہ کرنا واجب القتل۔ یہ طرز بیان ہمارے خیال میں نہ صرف دقیانوسی ہے بلکہ بالکل غلط بھی۔ اور اس امر میں یہ مفروضہ پنہاں ہے کہ دراصل قاری ایک بے وقوف شخص ہے اور اس کو دلیل کے بغیر اپنے نکتہ نظر سے متفق کر لینا آسان کام ہے۔ قاری کو کم عقل تصور کر کے الو بنانے کی روش اختیار کرنے والے لکھاری نہ صرف خود کو تاہ نظر ہیں بلکہ موجودہ دور کے تقاضوں سے بھی ناواقف ہیں۔ بیسویں صدی کی آخری دھائی کا قاری نہ تو بے وقوف ہے اور نہ ہی اسے بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ وہ کوئی بھی چیز خود پڑھ کے (یا سن اور دیکھ کے) اس کے بارے میں درست رائے قائم کر سکتا ہے۔ اس کتاب کے لکھنے کے دوران ہم نے یہی نکتہ مد نظر رکھا ہے اور اسی لیے اس تصنیف میں شامل افراد کی بے جا تعریف کیے بغیر ان کے حالات زندگی من و عن بیان کر دیئے ہیں تاکہ پڑھنے والے از خود اس فرد کے ہیرو ہونے (یا نہ ہونے) کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکیں۔ تاہم ہر شخص کی اپنی بھی ایک رائے ہوتی ہے۔ مصنفین کی بھی اپنی آراء ہیں۔ چنانچہ جہاں بھی ان کا اظہار کیا گیا ہے وہاں یہ آراء محض آراء ہی کی حیثیت سے۔ سے پیش کی گئی ہیں نہ کہ آخری کلمات کے طور پر کہ جن سے انحراف کفر کے مترادف ہو۔ یوں اول تو آپ کو ان تذکروں میں ہماری آراء بہت کم ملیں گی اور دوم یہ کہ اگر ملیں گی بھی تو وہ محض ہماری آراء کی حیثیت سے ہی ملیں گی نہ کہ کسی الہامی حیثیت اس مواد کے لکھنے میں ہم نے بہت سی کتابوں اور مضامین سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ بعض جگہ پہلے سے لکھے ہوئے جملے یا تراکیب بھی بعینہ استعمال کی ہیں۔ لیکن اپنے مضامین میں ان ادباء کا حوالہ نہیں دیا۔ اس کی وجہ

مضامین کو بے جا طوالت سے بچانا تھا نہ کہ کسی ادیب یا لکھاری کے کام کی چوری! بہرحال اس امر کی درستگی کے لئے ہم اس کتاب کے آخر میں ان تمام کتابوں اور مضامین کے مکمل حوالہ جات درج کر رہے ہیں جن ذرائع سے ہم نے استفادہ حاصل کیا ہے۔

اس کتاب میں ہم نے بہت سی شخصیات شامل کی ہیں اور ابھی بہت سی ایسی ہیں جو ہمارے نزدیک ہیروز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انشاء اللہ وہ اس کتاب کے اگلے ایڈیشن میں شامل کریں گے۔ اس وقت تک ہم اپنا کام جاری رکھیں گے اور پڑھنے والوں سے ہماری یہ توقع اور گزارش ہو گی کہ وہ اپنی آراء سے ہمیں مطلع کرتے ہیں تاکہ اگر کوئی ہستی ہماری نظر سے پوشیدہ رہ گئی ہو اور اس کا ذکر کتاب میں شامل نہ ہو سکا ہو تو آئندہ اس غلطی کا ازالہ کر دیا جائے۔ ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔

حمیر ہاشمی
102۔ ایچ ماڈل ٹاؤن لاہور
دسمبر 1998ء

maablib.org

شہر لاہور۔ تعارف

یہ شہر دارالسلطنت و دارالحکومت پنجاب کا ہے۔ دریائے راوی کے کنارے صدہا سال سے آباد۔ یہ شہر پنجاب کا حاکم نشین اور صوبے کا صدر مقام رہا ہے۔ اگرچہ شاہان چغتائی کی عملداری سے پہلے پنجاب کا دارالحکومت دیپال پور (ساہیوال) تھا مگر بابر اور ہمایوں کے عہد میں شہر لاہور ہی دارالسلطنت قرار پایا۔ اور حاکم نشین ہونے کے سبب اس کی رونق روز بروز بڑھتی گئی۔ پہلی تاریخوں میں اس کا نام کہیں لہاور اور کہیں لہانور اور کہیں لوپور اور کہیں لاہور تحریر ہے۔ امیر خسرو دہلوی نے بھی اپنی تصنیف "قرآن السعدین" میں اس شہر کا نام لاہور درج کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چودھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں جب امیر خسرو زندہ تھے تو نام اس شہر کا لاہور ہی تھا۔ اس شہر کے بانی کا نام بخوبی معلوم نہیں ہوتا مگر عموماً مشہور ہے کہ مہاراجہ رام چندر کے فرزند "لو" نے یہ شہر آباد کیا تھا اور لوپور نام رکھا تھا جو ہزارہا سال کی مدت گزرنے کے سبب بگڑ کر لاہور مشہور ہو گیا۔ "خلاصۃ التواریخ" میں مصنف سبحان رائے بٹالوی بھی اس قول کی تصدیق کرتا ہے کہ راجہ رامؔ چندر کے دو فرزند تھے لو اور کشو۔ جن میں سے ایک نے لوپور یعنی لاہور اور دوسرے نے کشور یعنی قصور کا شہر آباد کیا۔ اسی طرح کی ایک روایت ہے کہ اس شہر کو اول راجہ پرچھت نے جو پانڈوؤں کی اولاد سے بڑا راجہ تھا آباد کیا۔ کسی قدر مدت کے بعد بوجہ قحط یہ بستی صدہا سال ویراں رہی اور راجہ بکرماجیت نے اس کی دوبارہ آباد کاری کا حکم دیا۔ بکرماجیت کی وفات کے بعد سمند پال جوگی تخت نشین ہوا تو اس شہر کا نام سمند پال نگری رکھا گیا۔ جب اس نے پنجاب کا علاقہ

اپنے برادر زادے لوہار چند کی جاگیر میں دے دیا تو اس نے اس شہر کو دارالحکومت بنایا اور اس کا نام سمند پال نگری موقوف کر کے اپنے نام کی نسبت سے لوہار پور کر دیا جو بکثرت استعمال بگڑ کر لاہور مشہور ہو گیا۔

جب اسلام کا زمانہ آیا اور مسلمان بادشاہوں نے غربی ملکوں میں قوت حاصل کی تو سلطان محمود سبکتگین غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اس وقت بھی اس شہر کا نام لاہور ہی تھا۔ راجہ جے پال برہمن پنجاب کا فرمانروا اور صاحب تخت و تاج تھا۔ جے پال کی لڑائیاں سلطان سبکتگین اور اس کے فرزند سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہوئی تھیں۔ پہلے اس شہر کی کھلی آبادی تھی۔ مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر نے اس کے گرد فصیل بنوادی' فصیل کی دیوار بہت بلند اور چوڑی تعمیر کی۔ دروازے پختہ تعمیر کئے۔ انگریزی عہد میں اس بلند فصیل کو فضول تصور کیا گیا اور تقریباً" نصف گرا دی گئی۔ دوسری مرتبہ باقی ماندہ دیوار بھی مسمار کر دی گئی اور اس کی جگہ ایک مختصر دیوار پختہ بنوا دی گئی۔

اس شہر کے بارہ دروازے ہیں۔ ایک چھوٹا دروازہ ہے جس کو موتی دروازہ یا موچی دروازہ کہتے ہیں۔ بارہ دروازوں میں دہلی دروازہ' شاہ عالمی دروازہ' اکبری دروازہ' لوہاری دروازہ' موری دروازہ' بھاٹی دروازہ' ٹکسالی دروازہ' روشنائی دروازہ' مستی دروازہ' کشمیری دروازہ' خضری دروازہ المعروف شیرانوالہ دروازہ اور ذکی دروازہ المعروف یکی دروازہ شامل ہیں۔

یہ قدیم شہر مختلف ادوار میں بیرونی حملہ آوروں کے ستم کا نشانہ بنا رہا اور اس کے اجڑنے اور دوبارہ بسنے کا عمل مسلسل جاری رہا۔ مسلمانوں کی سلطنت کے آغاز میں اس شہر کو پہلا صدمہ سلطان محمود غزنوی کی یورش سے پہنچا۔ یہ حملہ اس نے راجہ جے پال بن انند پال ابن جے پال والی لاہور کے وقت میں ۱۰۰۱ء میں کیا۔ سلطان محمود غزنوی کے حملے میں ہزاروں افراد اس شہر کے قتل ہوئے اور لٹ پٹ کر دو دن میں یہ شہر کھنڈر کی شکل اختیار کر گیا۔ جب ملک ایاز بادشاہ کے حکم سے پنجاب کا حاکم بنا تو اس نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا اور اس کی ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ ملک ایاز نے اس گرمجوشی سے یہ

شہر بسایا کہ چند سال میں یہ ویرانہ علماء اور فضلاء کا مسکن بن گیا اور مخدوم شیخ علی ہجویری جیسے عالم فاضل ولی لوگ غزنی اور غور وغیرہ کے علاقوں سے آکر یہاں قیام پذیر ہوئے۔

دوسرا حملہ اس شہر پر سلطان شہاب الدین غوری نے خسرو ملک کے عہد میں کیا۔ اس کے بعد تاج الدین یلدوز نے قطب الدین ایبک کے زمانے میں اس شہر میں غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ سلطان شمس الدین التمش کے دور میں مغلیہ لشکر تیمور نے اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں تاتاری افواج نے لاہور پر حملہ آور ہو کر اسے غارت کیا۔ دوبارہ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں تاتاریوں نے لاہور پر حملہ کر کے خوب خون خرابہ کیا اور شہر اجاڑ دیا۔ اس بادشاہ کے عہد میں قوم گکھڑ نے اس شہر کی بربادی کی۔ ۹۲۵ء میں بابر نے لاہور پر حملہ کیا۔ اس کے بعد بھی مختلف حملہ آور لاہور کی اکھاڑ پچھاڑ میں مصروف رہے۔ ان میں سکھ اور مرہٹے سرفہرست تھے۔ سکھوں اور مرہٹوں کی سرکوبی احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں ہوئی اور اس طرح یہ شہر مختلف وقتوں میں اجڑنے کے بعد ساتھ ساتھ آباد ہونے کے سبب موجودہ حالت تک پہنچا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ (۱۷۹۹ء۔ ۱۸۳۹ء) کے دور سے پہلے یہ شہر بخوبی آباد ہو چکا تھا۔ بیرونی کھنڈرات کی اکثر زمینوں میں امراء دربار مہاراجہ نے بڑے بڑے باغ بنوا لئے تھے۔ رنجیت سنگھ کے سکھ عہد میں اس شہر کی دوبارہ زبوں حالی کا دور شروع ہوا۔ رنجیت سنگھ نے اس شہر کی تمام قدیم عمارات و مزارات سے قیمتی پتھر اور نوادرات وغیرہ اکھاڑ لئے اور اس طرح سکھوں نے شہر کی بیرونی دیواروں کی اینٹیں تک نکال کر فروخت کر دیں۔ رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ دور میں شہر ایک مرتبہ پھر کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا۔ انگریزی عہد میں سکھوں کو شہر کی اینٹوں اور پتھروں کی فروخت سے سختی سے منع کر دیا گیا اور سکھوں کے دور میں ہونے والی تباہی کی دوبارہ بحالی کا کام شروع کیا گیا۔ انار کلی کے مقام پر انگریز فوجی چھاؤنی قائم کی گئی۔ پختہ بارکیں اور کوٹھیاں

وغیرہ تعمیر کرنے کے علاوہ ایک خوبصورت پختہ بازار انار کلی بازار تعمیر کیا گیا۔ دوسری آبادی چھاؤنی میاں میر ظہور میں آئی۔ یہاں پر بھی عالیشان بازار اور صدر بازار میاں میر تعمیر ہوا۔ لاکھوں روپے کی لاگت سے بے شمار کوٹھیاں افسروں کے قیام کے لیے تعمیر کی گئیں۔ چند سال میں اس شہر نے بہت زیادہ ترقی کی اور یہ خطہ غیرت خلد بریں ہو گیا اس کے علاوہ موضع مزنگ، گڑھی شاہو اور قلعہ گوجر سنگھ میں بے شمار کوٹھیاں اور باغیچے تعمیر ہوئے۔ انگریزی عہد میں عالیشان ریلوے سٹیشن اور سرائے سلطان کے باہر شمال کی جانب ایک پختہ جدید بازار (لنڈا بازار) بنا جو لاہور شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔

سکھوں کے عہد میں لاہور شہر نہایت گندہ تھا۔ انگریزی حکومت نے اس کی صفائی پر خصوصی توجہ دی۔ شہر میں خوبصورتی بڑھانے کے لیے باغات (لارنس گارڈن) اور تالاب وغیرہ تعمیر کرائے گئے۔ اس شہر کی موجودہ خوبصورت عمارات اور تعلیمی ادارے انگریزی عہد ہی کی نشانیاں ہیں۔ ان میں پنجاب یونیورسٹی، گورنمنٹ کالج، لاہور ہائی کورٹ بلڈنگ، جی پی او عجائب گھر شامل ہیں۔ انگریزی عہد کی لازوال یادگار مال روڈ کئی سال گزرنے کے بعد بھی اس شہر کا دل ہے۔ اور اس کی خوبصورتی اور رونق کو دوبالا کرتی ہے۔ موجودہ لاہور جدید و قدیم تہذیب کا شاندار امتزاج ہے۔ قدیم تہذیب و ثقافت کے نمونے ہمیں اندرون لاہور میں نظر آتے ہیں اسی طرح جدید بین الاقوامی فن تعمیر کی مثالیں جدید آبادیوں ڈیفنس، گلبرگ، علامہ اقبال ٹاؤن، مسلم ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن اور ماڈل ٹاؤن وغیرہ میں نظر آتی ہیں۔ یہ شہر اپنی ہزارہا سال کی تاریخ اپنے سینے میں پوشیدہ کئے ہوئے آج بھی اس خطہ ارض پر اپنی الگ اور منفرد شناخت رکھتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش

آپ کا اسم گرامی علی، کنیت ابوالحسن، والد کا نام عثمان ابن علی، وطنی نسبت الجلابی الغزنوی ثم الہجویری ہے۔ جلاب اور ہجویر ملک افغانستان کے غزنی شہر کے مضافات میں دو بستیاں ہیں۔ آپ حسنی سید ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ شیخ علی بن عثمان بن علی بن عبدالرحمٰن بن شاہ شجاع بن ابوالحسن بن حسین اصغر بن زید بن حضرت حسن بن حضرت علی المرتضیٰؓ۔

حضرت شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ کی ولادت دسویں صدی عیسوی کے آخر یا گیارھویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشرے میں ہوئی۔

آپ کے والد ماجد جلاب کے اور والدہ ماجدہ ہجویر کی رہنے والی تھیں۔ والد کی وفات کے بعد آپ مستقلاً ننھیال منتقل ہو گئے۔ اس لیے اپنے آپ کو جلابی ثم الہجویری لکھتے ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ کی قبر غزنی میں آپ کے ماموں تاج الاولیاءؒ کے مزار کے ساتھ ہے۔

آپ کے مرشد ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ ہیں۔ ان کا سلسلہ نو واسطوں سے حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ آپ نے شیخ ختلیؒ کے علاوہ شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ، شیخ ابوسعید ابی الخیر، شیخ ابوالقاسم قشیریؒ اور شیخ ابوالقاسم اشتقانی سے فیض حاصل کیا۔ آپ کے مرشد کا سلسلہ جنیدیہ ہے اور آپ کو جنیدیہ ہونے پر فخر ہے۔ آپ کے مرشد شیخ ختلیؒ۔ شیخ ابوالحسن سالبہؒ اور ابوعمرو قزوینیؒ کے ہم عصر تھے۔ شیخ ختلیؒ نے ساٹھ سال عزلت و گوشہ نشینی میں گزارے تھے لہٰذا مخلوق خدا کیلئے گمنام ہو چکے تھے وہ علم تفسیر اور حدیث

کے جید عالم تھے۔ شیخ حلی کا ارشاد ہے کہ "دنیا کی زندگی ایک دن کی مانند ہے اور اس میں ہمارا روزہ ہے۔ آپ کا وصال ۴۶۰ھ میں دمشق اور بانیار کے درمیان واقع گھاٹی بیت الجن میں ہوا اس وقت آپ کا سر حضرت گنج بخش کے زانو پر تھا۔

حضرت علی ہجویری کا معروف لقب "داتا گنج بخش" ہے اور یہ شہرت صدیوں کا فاصلہ طے کرتی ہوئی آج تک پہنچی ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کا مشہور شعر زبان زد خلائق ہے:

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں راپیر کامل کاملاں را رہنما

آپ کی زندگی کا زیادہ حصہ علمی و روحانی اغراض سے سیاحت میں گزرا۔ اکابر اولیاء کرام کی زیارت کی اور ان سے فیض حاصل کیا۔ عراق، شام، بغداد، پارس، آذربائیجان، قہستان، طبرستان، خوزستان، کرمان، طوس، ماوراء النہر، ترکستان اور حجاز کا سفر کیا صرف خراسان میں آپ نے تین سو مشائخ سے ملاقات کی۔ اس طرح آپ اکابرین علم و عرفان کی صحبت میں علم اور روحانیت کے اس درجہ کمال کو پہنچے کہ اپنے زمانے کے امام اور آنے والے ادوار کیلئے مخدوم بن گئے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ ۴۳۱ھ میں غزنی سے لاہور تشریف لائے۔ ان دنوں غزنی میں سلطان محمود غزنوی حکمران تھا اور سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے غزنی پر حملہ کرکے اسے شکست فاش دیدی تھی۔ اس بدامنی کے دور میں غزنی کے مقامی لوگ خوصاً علماء و صلحاء دوسرے علاقوں کو ہجرت کر گئے تھے جبکہ سلطان محمود کا بیٹا سلطان مسعود بھی لاہور آتے ہوئے جہلم کے کنارے گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اسی افراتفری کے زمانے میں حضرت داتا صاحب اپنے دو دوستوں ابوسعید ہجویریؒ اور حماد سرخسیؒ کے ساتھ لاہور تشریف لائے۔

حضرت داتا گنج بخش سے قبل شیخ اسماعیل لاہوریؒ (متوفی ۴۴۸ھ) نے لاہور میں شمع دین روشن کی تھی مگر جس شخص نے لاہور میں بیٹھ کر پورے

برصغیر میں روشنیاں بکھیر دیں۔ وہ بلاشبہ حضرت داتا گنج بخشؒ ہیں۔ لاہور میں آپ نے ایک بلند ٹیلے پر قیام فرمایا اور اس جگہ آپ نے ذاتی خرچ سے ایک مسجد تعمیر کروائی۔ یہیں آپ نے درس و تدریس اور تبلیغ دین کا کارنامہ انجام دیا۔ آپ زیادہ وقت قرآن و حدیث کی تدریس میں مصروف رہتے تھے اور غیر مسلم بھی رہنمائی کیلئے آپ سے رجوع کرتے تھے۔ آپ جس محبت اور شفقت سے غیر مسلموں سے پیش آتے تھے وہ اس سے بے حد متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ کی تبلیغ سے بے شمار غیر مسلم اسلام لائے' ہزاروں جاہل عالم بن گئے اور فسق و فجور میں مبتلا لاتعداد لوگ کامل انسان بن گئے۔

رائے راجو گورنر لاہور میں آپ کے دست مبارک پر مسلمان ہوا اور اس نے ساری زندگی آپ کے آستانہ پر گزار دی۔ آپ نے اسے شیخ ہندی کا لقب دیا۔ آپ کی تبلیغی کوششوں کے اثرات لاہور سے باہر پنجاب اور رفتہ رفتہ پورے برصغیر پر مرتب ہوئے اور یہ حقیقت ہے کہ آج آپ کا آستانہ پاک و ہند کا سب سے بڑا روحانی مرکز ہے اور برصغیر کے عظیم صوفیاء نے آپ کے مزار سے فیض پایا ہے مثلاً" چشتی سلسلہ کے پیشوا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ' حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اور مجدد الف ثانیؒ نے آپ کے مزار مبارک پر چلہ کشی کی ہے۔ آج بھی لاہور کی شناخت داتا کی نگری کے طور پر ہے۔ آپ ۴۸۱ھ سے ۵۰۰ کے درمیان لاہور میں فوت ہوئے۔ آپ کا مزار بھاٹی گیٹ کے قریب واقع ہے۔ آپ کے مزار کی تعمیر سب سے پہلے غزنوی حکمران سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود نے کروائی اور بعدازاں وقتاً" فوقتاً" اس کی تعمیر و مرمت جاری رہی۔ محکمہ اوقاف پنجاب نے مزار سے متصل ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی ہے جس میں پچاس ہزار افراد بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ آپ کے مزار پر روزانہ ہزاروں افراد حاضری دیتے ہیں اور آپ کے فیض سے مستفیض ہوتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش ایک بڑے مصنف تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد گیارہ کے قریب ہے مگر ان کی جو تصنیف سدا بہار ہے

وہ کشف المحجوب ہے آپ کی کتب کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) کشف المحجوب (۲) دیوان شعر (۳) کتاب فناء و بقاء (۴) اسرار الخرق والموفات (۵) الرعایہ بحقوق اللہ تعالیٰ (۶) کتاب البیان لاہل العیان (۷) نحو القلوب (۸) منہاج الدین (۹) ایمان (۱۰) فرق الفرق (۱۱) کشف الاسرار

ان میں صرف کشف المحجوب اور کشف الاسرار دستیاب ہیں۔ آپ کا عرس ہر سال ۱۸، ۱۹، ۲۰ صفر کو نہایت عقیدت و احترام سے بنایا جاتا ہے۔

اقوال حضرت داتا گنج بخش

۱۔ نفس کی مخالفت سب عبادتوں کا اصل اور سب مجاہدوں کا کمال ہے۔

۲۔ بندے کیلئے سب چیزوں سے مشکل خدا کی پہچان ہے۔

۳۔ دس چیزیں دس چیزوں کو کھا جاتی ہیں۔

توبہ گناہوں کو، جھوٹ رزق کو، غیبت نیک اعمال کو، غم عمر کو، صدقہ بلاؤں کو، غصہ عقل کو، پشیمانی سخاوت کو، تکبر علم کو، نیکی بدی کو اور عدل ظلم کو۔

maablib.org

حضرت میاں میرؒ

حضرت میاں میر قطب زمن ہیں۔ واقف سرو ملن ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب اٹھائیس واسطوں سے امیرالمومنین حضرت عمر فاروق پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے دادا قاضی قلندر فاروقی ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ آپ کے والد ماجد کا نام قاضی سائیں ہے۔ آپ کی والدۂ ماجدہ فاطمہ قاضی قادن کی صاحبزادی تھیں آپ کے چار بھائی تھے۔ جس کے نام یہ ہیں۔ قاضی بولن' قاضی عثمان' قاضی ظاہر' قاضی محمد۔ آپ کی ولادت باسعادت سیوستان میں جو آپ کے آباؤ اجداد کا اصلی وطن ہے۔ ۹۳۸ھ میں ہوئی۔ آپ کا نام میر محمد ہے۔ آپ میاں میر' شاہ میر' میاں جیو اور بالا پیر کے القاب سے بھی پکارے جاتے ہیں۔ سات سال کی عمر میں والد کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔ بارہ سال کی عمر میں آپ نے اپنی والدۂ ماجدہ سے علم باطنی حاصل کرنا شروع کیا۔ اس سے فارغ ہو کر اپ دنیا اور دنیاوی تعلقات سے کنارہ کش ہو گئے۔

آپ والدہ سے رخصت ہو کر جنگلوں' بیابانوں اور باغوں میں گھوما کرتے تھے۔ تلاش حق میں آپ بے چین رہتے تھے۔ ریاضت' عبادت اور مجاہدہ میں مشغول رہتے تھے۔ آپ حضرت خضر سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح بیان فرماتے ہیں جب میں والدہ ماجدہ سے رخصت لے کر بڑے شوق سے باہر نکلا تو بے اختیار جنگل کا رخ کیے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میں سیوستان میں پہنچا وہاں پر میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں تنور ہے جس کا منہ ڈھکا ہوا تھا جب کھول کر دیکھا تو اس میں پتھر دیکھا اور تنور گرم تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ کسی بزرگ کا مقام ہے اور میں نے عہد کیا کہ جب تک اس

بزرگ کی زیارت نہ کرلوں گا یہاں سے نہیں جاؤں گا۔

تین روز کے بعد حضرت خضر تشریف لائے۔ میں نے جا کر سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا کے پھر کچھ عرصہ بعد آپ حضرت خضرؑ کے مرید ہوئے اور یاد الٰہی میں مشغول ہوئے۔ حضرت خضر نے آپ کو رخصت فرمایا اور آپ کو ہدایت فرمائی کہ ان کے پاس رہنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں جی چاہے جائیں اور جہاں جی چاہے رہیں۔

آپ علوم ظاہری حاصل کرنے کے واسطے لاہور تشریف لائے۔ لاہور میں مسجدوں میں قیام فرمایا۔ مولانا سعد اللہ کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اور کچھ ہی مدت میں علوم معقول و منقول کلی کی تحصیل سے فارغ ہوئے۔ مولانا نعمت اللہ سے بھی آپ نے علم حاصل کیا۔ آپ نے اصلی حالت کا کسی کو پتہ نہیں دیا۔ اس کے بعد سے آپ کا یہ طریقہ تھا کہ دن میں بزرگان دین کے مزارات پر جاتے اور مزارات سے فیوض و برکات حاصل کرتے پھر باغوں، جنگلوں اور غیر آباد مقامات پر جا کر یاد حق میں مشغول ہوئے۔

لاہور میں کچھ عرصے رہ کر اپ سرہند تشریف لے گئے۔ سرہند میں آپ بیمار ہو گئے۔ گھٹنے کے درد کی شکایت پیدا ہوئی۔ حاجی نعمت اللہ سرہندی نے آپ کی بہت خدمت کی۔ بیماری کی حالت میں آپ نے حضرت غوث الاعظم سے صحت کی درخواست کی۔ آپ تندرست و توانا ہو کر خداوند تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔ ایک سال کے قریب سرہند میں رہ کر آپ لاہور واپس تشریف لائے اور باغبانوں کے محلے میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ عبادت، ریاضت، مجاہدہ، تعلیم و تلقین اور رشد و ہدایت میں مشغول رہتے۔ لوگوں کو راہ حق دکھاتے۔ آپ کا فیض عام تھا۔ بہت سے لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے۔

آپ کے کمالات کا شہرہ سن کر شہنشاہ جہانگیر کو آپ سے ملنے کا شوق ہوا۔ لاہور سے چلنے کے بعد اس نے ایک شخص کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور یہ پیغام بھیجا کہ لاہور سے روانہ ہونے کے بعد اس کو آپ کا نام معلوم ہو سکا

اگر لاہور میں ہوتا تو وہ خود حاضر خدمت ہوتا۔ اب آپ خود ہی ازراہ نوازش اس کے پاس تشریف لے آئیں۔ آپ نے جہانگیر کی درخواست منظور فرمائی۔ جہانگیر نے آپ کی بہت آؤ بھگت کی۔ بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ جہانگیر آپ سے بہت متاثر ہوا۔ اور اسی حالت میں اس نے آپ سے عرض کیا کہ "جو کچھ سلطنت کا زر و مال اور جواہر وغیرہ ہے۔ وہ میری نظر میں اینٹ پتھر کے برابر ہے۔ اگر آپ توجہ فرما دیں تو میں دنیاوی تعلقات کو چھوڑ دوں۔" آپ نے یہ سن کر جہانگیر سے فرمایا۔

"تم پہلے اپنے جیسا خلقت کی نگہبانی کے لیے کوئی شخص مہیا کر لو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر مشغول کروں گا" جہانگیر یہ سن کر بہت خوش ہوا اس نے آپ سے عرض کیا کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیں۔ آپ نے بادشاہ سے وعدہ لیا کہ جو طلب کریں گے وہ دے گا۔ جہانگیر نے کہا "ہاں ضرور دوں گا" آپ نے فرمایا "تو بس یہی چاہتا ہوں کہ مجھے رخصت دو۔ جہانگیر نے آپ کو نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا۔ شہنشاہ شاہجہاں دو مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے شاہجہاں کو نصیحت فرمائی کہ "عادل بادشاہ کو اپنی رعیت اور سلطنت کی خبر گیری کرنی چاہیے اور اپنی تمام ہمت اپنی تمام ولایت کو آباد کرنے میں صرف کرنی چاہیے۔ کیونکہ اگر رعیت آسودہ حال اور ملک آباد ہے تو سپاہ آسودہ اور خزانہ پر ہو گا"

شاہجہاں آپ سے مل کر اتنا متاثر ہوا کہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "ہم نے ترک و تجرید میں حضرت میاں جیو جیسا کوئی درویش نہیں دیکھا" دوسری مرتبہ جب شاہجہاں آپ سے ملنے آپ کے در دولت پر گیا تو شال کی دستار اور کھجوروں کی تسبیح اپنے ہمراہ لے گیا۔ جب اس نے وہ دونوں چیزیں آپ کو نذر کیں تو آپ نے دستار واپس کر دی اور تسبیح قبول فرمائی۔ وہ تسبیح قبول تو کر لی لیکن بعد ازاں اپنے ایک مرید کو دیدی۔

آپ بادشاہ سے بات چیت کرتے جاتے تھے اور لونگ پکا کر پھینکتے جاتے تھے۔ شیخ محمد لاہوری وہ لونگیں اٹھا کر کھا لیتے تھے۔ شیخ محمد لاہوری نے

شاہجہاں کے جانے کے بعد آپ سے دریافت کیا کہ مجلس کیسی گزری۔ آپ نے جواب دیا کہ "بادشاہ فرد کامل اور مظہر خاص ہوتے ہیں لیکن ان کی آمدورفت اور بات چیت سے مجھ میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا کہ میں جس کام میں مشغول تھا۔ اسی میں مشغول رہا"

آپ کے توکل کا یہ حال تھا کہ رات کے وقت کوزے کا پانی پھینک دیتے تھے۔ لوگوں سے الگ رہنا پسند فرماتے تھے۔ رات کو سوتے نہیں تھے۔ آپ بہت کم لوگوں کو مرید کرتے تھے۔ آپ کے فقر و فاقہ کا یہ حال تھا کہ کئی کئی روز تک بھوکے رہتے۔ تیس سال تک آپ کے یہاں کچھ نہ پکا۔ آپ کی خوراک بہت کم تھی ہر وقت استغراق کی حالت میں رہتے تھے۔ آپ کا لباس سادہ ہوتا تھا۔ خرقہ اور مرقع زیب تن نہیں فرماتے تھے۔ ایک معمولی کپڑے کی پگڑی سر پر رکھتے تھے اور موٹے کپڑے کا کرتہ پہنتے تھے۔ آپ کے گھر میں ایک پرانا بوریا بچھا رہتا تھا۔ دنیا اور دنیاوی چیزوں سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں تھا۔ فرائض، سنن موکدہ اور تہجد پابندی سے ادا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اور کوئی نماز ادا نہیں کرتے تھے۔ رمضان کے روزوں کے علاوہ اور کوئی روزہ نہیں رکھتے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں تسبیح نہیں ہوتی تھی۔ آپ کو سماع کا شوق تھا لیکن سماع میں وجد اور رقص نہیں کرتے تھے۔ "آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچنے کے دو طریقے ہیں۔ اول جذبہ کہ اللہ تعالیٰ یکبارگی بندہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس کو واصل بنا دیتا ہے اور دوسرا سلوک جو ریاضت، مجاہدے اور کسی بزرگ کا دامن پکڑنے سے اللہ تعالیٰ تک پہنچے۔"

آپ کے مشہور اقوال یہ ہیں "جس کا اللہ ہو وہ فقیر نہیں" "کامل صوفی وہ ہے کہ جس کی نظر میں پتھر اور جواہر یکساں ہوں" "حق کی طلب آسان نہیں جب تک تم اس کی طلب میں یگانہ نہ ہو جاؤ گے اسے نہیں پا سکو گے"

"اولیاء اللہ کا تصرف زندگی میں اور موت کے بعد یکساں ہوتا ہے بلکہ مرنے کے بعد زیادہ اور بہتر ہوتا ہے" "صوفی وجد کی حالت میں ہوتا ہے تو اپنی ہستی سے خالی ہوتا ہے اور بقائے حق سے باقی" "اولیاء کی موت ان کے نفس کا

مرنا ۔ اور جب ان کا نفس مرجاتا ہے تو پھر وہ ابد آلاباد تک زندہ ہی رہتے ہیں۔

انسان تین چیزوں نفس، دل اور روح کا مجموعہ ہے۔ ان میں اسے ہر ایک کی اصلاح خاص چیز سے ہوتی ہے چنانچہ نفس کی اصلاح شریعت سے دل کی طریقت سے اور روح کی حقیقت سے"

آپ اکثر فرمایا کرتے کہ "وفات کے بعد مجھے شورہ زمین میں دفن کرنا تاکہ میری ہڈیوں تک کا نام و نشان باقی نہ رہے اور نہ ہی قبر کی صورت بنانا" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "میری ہڈیوں کو نہ بیچنا اور میری قبر پر دوسروں کی طرح دوکان نہ بنا لینا۔ آپ نے ۱۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ کو اس دارفانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرمایا۔ آپ کا مزار پرانوار میاں میر کالونی میں سرچشمہ فیض و برکات ہے۔

حضرت مادھولال حسین

حضرت مادھولال حسین جمال معرفت اور کمال حقیقت سے آراستہ تھے آپ کے والد کا نام کلسن رائے تھا۔ انہوں نے سلطان فیروز شاہ کے عہد میں اسلام قبول کیا اور ان کا نام شیخ عثمان رکھا گیا وہ کپڑا بنتے تھے۔ حضرت مادھولال حسین ۹۴۵ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام شیخ حسین تھا۔ لیکن آپ مادھولال حسین کے نام سے مشہور ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ مادھو نامی ایک برہمن لڑکے کو بہت عزیز رکھتے تھے اسی بنا پر دونوں کے نام بھی یک جا ہو گئے اور بجائے شیخ حسین کے آپ مادھولال حسین کہلانے لگے۔ آپ کے نام میں لال کے لفظ کا اضافہ سرخ پوشاک پہننے کی وجہ سے ہوا۔ آپ جب سات سال کے ہوئے تو مکتب میں بھیجے گئے۔ حافظ ابوبکر سے چھ پارے حفظ کیے۔ آپ نے شیخ سعد اللہ سے تفسیر مدارک کا کچھ حصہ پڑھا۔

آپ تعلیم زیادہ دن جاری نہ رکھ سکے ایک دن آپ مکتب میں درس لے رہے تھے کہ حضرت بہلول مسجد میں تشریف لائے۔ حضرت بہلول قطب زماں تھے۔ وہ حضرت امام علی موسیٰ کے مزار سے لاہور تشریف لائے تھے۔ ان کو حضرت امام رضا کے مزار سے حکم ہوا تھا کہ وہ لاہور جا کر آپ (حضرت حسین) کو توجہ دیں۔ چنانچہ وہ مسجد میں آئے اور حافظ ابوبکر سے آپ کا نام معلوم کر کے آپ سے دریا سے وضو کے لیے پانی لانے کو فرمایا آپ نے حکم کی تعمیل کی۔ حضرت بہلول نے وضو کیا۔ اور دو رکعت نماز ادا کر کے آپ کے واسطے اس طرح دعا کی "یاالٰہی" اس بچے پر کرم کر۔ اس کو عرفان کی دولت سے مالا مال کر اور اپنا سچا عاشق بنا"

ایک حکایت یہ بھی ہے کہ حضرت بہلول نے حافظ ابوبکر سے فرمایا کہ ماہ رمضان قریب ہے۔ اس سال رمضان میں شیخ حسین قرآن سنائیں گے۔ یہ سن کر آپ نے بہلول سے عرض کیا "یہ کیسے ممکن ہے! مجھے تو صرف چھ پارے حفظ ہیں" حضرت بہلول نے فرمایا کہ "فکر کی کوئی بات نہیں ہے تم ضرور قرآن سناؤ گے۔ دریا پر جاؤ اور وہاں سے ہمارے لیے پانی لاؤ۔ اور ایک بات کا خیال رکھنا وہاں جو بزرگ تمہیں ملیں ان کی ہدایت پر عمل کرنا"

اب دریا پر جو گئے تو دیکھا ایک بزرگ وہاں آپ کے منتظر ہیں ان بزرگ نے آپ سے فرمایا کہ لوٹے کا پانی ان کے ہاتھ پر ڈالدیں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ ان بزرگ نے خوش ہو کر آپ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس کی برکت سے آپ نے اس سال رمضان المبارک میں پورا قرآن شریف سنایا۔ اب ان کا کام پورا ہو چکا تھا وہ آپ سے رخصت ہوئے۔ رخصت ہونے سے قبل حضرت شیخ بہلول نے آپ کو اس امر کی ہدایت فرمائی کہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر انوار پر پابندی سے حاضر ہوا کریں۔ آپ نے چھبیس سال عبادت، ریاضت اور مجاہدے میں گزارے، روزانہ ایک کلام پاک ختم کرنا آپ کا معمول تھا۔ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر نہایت پابندی سے حاضر ہوئے۔

رات تلاوت کلام پاک اور عبادت میں گزارتے۔ دریا کے کنارے اور حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر سکون یک سوئی پاتے۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مکتب میں تفسیر کا درس لینے جاتے۔ وہاں عصر تک رہتے۔ عصر کی نماز کے بعد ذکر و فکر پر میں مشغول ہوتے۔ مغرب کی نماز ادا کر کے عشاء کی نماز تک نفل پڑھتے۔ بیماری کی حالت میں بھی اپ کے معمولات میں فرق نہیں آتا تھا۔

ایک اور حکایت ہے کہ ایک روز آپ شیخ سعداللہ سے تفسیر مدارک کا درس لے رہے تھے۔ جب ایک آیت پر پہنچے جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ اس جہان کی زندگی لہو و لعب ہے تو آپ نے شیخ سعداللہ سے اس کی وضاحت اور تشریح بیان کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے فلسفیانہ اور عالمانہ طور پر آپ کو سمجھایا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ تمام دنیا ہی لہو و لعب ہے۔ یہ سن کر آپ پر

وجدانی کیفیت طاری ہوئی۔ آپ اسی حالت میں رقص کرنے لگے اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے نکلے کہ جب خداوند تعالیٰ نے ساری دنیا کو تماشہ فرمایا ہے تو بس اس میں مصروف رہنا چاہیے۔ آپ نے کتابیں ایک کنویں میں ڈال دیں۔ داڑھی مونچھ کے بار سے سبکدوش ہوئے۔ جام آپ کے ہاتھ میں ہوتا اور آپ گلی کوچوں اور بازاروں میں نشے کی حالت میں پھرتے تھے۔ طوائفوں میں جاتے۔ ناچ گانے میں ہمہ تن مشغول رہتے اور محفل نشاط میں شریک ہوتے تھے غرض آپ نے "ملامتیہ" طریقہ اختیار کر لیا تھا۔"

آپ کے پیرو دستگیر حضرت شیخ بہلول کو چنیوٹ میں معلوم ہوا کہ آپ (حضرت حسین) شراب پیتے ہیں مدہوش رہتے ہیں اور جادۂ شریعت سے بھٹک گئے ہیں تو وہ آپ کو دیکھنے کی غرض سے لاہور تشریف لائے۔ آپ کو دیکھا اور مطمئن ہو کر واپس تشریف لے گئے۔

آپ کے قلندرانہ مشرب کی شکایت اکبر کے پاس پہنچی۔ اکبر نے آپ کو دربار میں بلایا۔ اکبر نے اپ سے دریافت کیا! "اے درویش سنا ہے تم خدا رسیدہ ہو" آپ نے جواب دیا۔ اس میں کیا شک ہے۔ اکبر نے پوچھا: "اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ خدا تک کس طرح پہنچے" آپ نے جواب دیا! اے بادشاہ! میں خدا تک نہیں پہنچا بلکہ خدا مجھ تک پہنچا ہے" ایک درباری نے اس کا ثبوت مانگا۔ آپ نے اکبر سے مخاطب ہو کر فرمایا!

"اے ہندوستان کے سیاہ و سفید کے مالک! موٹی سی بات ہے، اگر آپ نہ چاہتے تو یہ گدا آپ تک کیسے پہنچتا" اکبر آپ کا یہ جواب سن کر خوش ہوا اور آپ کو عزت و احترام سے رخصت کیا۔ شہزادہ سلیم جو "جہاں گیر" کے لقب سے تخت پر بیٹھا آپ کا معتقد تھا۔ اس نے آپ کا روزنامچہ لکھنے کی خدمت بہادر خاں کے سپرد کی۔

آپ نے ملامتیہ طریقہ اختیار کیا تھا آپ کا مشرب قلندرانہ تھا آپ کو ناچ گانے کا بہت شوق تھا۔ آپ لباس فقر میں اپنے آپ کو چھپائے رکھتے تھے۔ روزانہ صبح کو قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ رات رونے میں گزار دیتے

تھے۔ آپ نشیلی چیزوں کا استعمال بھی کرتے تھے۔

آپ کے زریں اقوال زندگی کی گہرائیوں سے روشناس ہیں اور پڑھنے والے کو دعوت فکر و عمل دیتے ہیں مثلاً" آپ فرماتے ہیں "جب علم کے ساتھ عمل نہ ہو تو اس علم سے ناچنا کودنا بہتر ہے" اسی طرح رواداری، محبت کا درس دینے کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ چند لفظوں میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں نہ مقیم ہوں اور نہ مسافر، نہ مسلمان نہ کافر"

آپ کی بے شمار کرامات اور معجزے مشہور ہیں مثلاً" یہ کہ آپ نے جب مکتب چھوڑا تو ساری کتابیں کنویں میں ڈال دیں۔ آپ کے ساتھیوں نے اپنی کتاب آپ سے طلب کی۔ آپ کنویں کے پاس تشریف لے گئے اور کنویں سے کہا۔ کتابیں واپس کر دے یکایک پانی اوپر آیا۔ کتابیں پانی میں تیر رہی تھیں۔ کتابیں ذرا بھی نہیں بھیگی تھیں آپ نے کتابیں لے کر ساتھیوں کو دے دیں۔

ایک اور حکایت ہے کہ حضرت مادھو کے والدین گنگا اشنان کے لیے گئے وہ حضرت مادھو کو بھی اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے تھے لیکن آپ نے حضرت مادھو کو اجازت نہیں دی، آپ نے ان سے فرمایا کہ جس دن اشنان ہو بتانا۔ جب حضرت مادھو نے آپ کو وہ دن یاد دلایا تو آپ نے حضرت مادھو سے آنکھیں بند کرنے اور ان کے پاؤں پر پاؤں رکھنے کو کہا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ گنگا کے کنارے کھڑے ہیں۔ اپنے والدین کے ساتھ اشنان کر کے اسی طرح لاہور واپس آئے۔ حضرت مادھو کے والدین جب اشنان سے لاہور واپس آئے تو انہوں نے اس کا ذکر کیا۔

ایک مرتبہ موضع منڈیا کے نمبردار نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور کہا جب تک بارش نہ ہو گی رہائی ناممکن ہے۔ آپ نے نمبردار سے فرمایا کہ اچھی بات ہے لیکن نان اور مرغ کھلاؤ۔ پھر دعا کریں گے۔ نان اور مرغ کھانے کے بعد آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا! "اب کیا دیر ہے" آپ کا یہ کہنا تھا کہ ابر گھر کر آیا اور خوب بارش ہوئی۔ آپ کا

شمار عظیم صوفی شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ کا کلام بڑے ذوق و شوق سے سنا اور پڑھا جاتا ہے۔

آپ نے ۱۰۰۸ھ میں وفات پائی۔ بوقت وفات آپ کی عمر تریسٹھ سال کی تھی۔ آپ شاہدرہ کے قریب مدفون ہوئے۔ اتفاقاً" چند سال کے بعد مقبرے کے نزدیک دریائے راوی آگیا اور مادھو اپنے مرشد کا صندوق وہاں سے نکال لایا اور اس جگہ (باغبانپورہ) دفن کیا جہاں اب مزار ہے اور مادھو بھی ۱۰۵۶ھ میں فوت ہو کر ان کے ساتھ دفن ہوا۔ آپ کے عرس کے موقع پر ہر سال میلہ چراغاں ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ابو المعالی

حضرت شاہ ابو المعالی زبدۃ العارفین ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب اٹھائیس واسطوں سے حضرت موسیٰ المرقعہ بن حضرت امام محمد تقی الجواد علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد سادات کرمان سے تھے۔ آپ کے دادا کے دادا سید فیض اللہ اپنے لڑکے سید مبارک کرمانی کو ہمراہ لے کرمان سے ۷۹۶ھ میں ہندوستان آئے۔ اوچ شریف (بہاولپور) میں قیام فرمایا۔ اوچ شریف سے سکونت ترک کر کے داؤد جال میں جو ملتان کے قریب ہے۔ اقامت گزیں ہوئے اپ کے والد سید رحمت اللہ داؤد جال سے سکونت ترک کر کے سنکھرہ میں رونق افروز ہوئے پھر سنکھرہ سے شیر گڑھ میں آکر سکونت اختیار کرلی۔

آپ کی ولادت باسعادت شیر گڑھ میں ۱۰ ذوالحجہ ۹۶۰ھ کو ہوئی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۱۰ ذوالحجہ ۹۲۰ھ کو پیدا ہوئے آپ کا نام المعالی ہے آپ شاہ ابو المعالی کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کے القاب "اسد الدین" اور "شاہ خیرالدین" ہیں۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے والد کے سایہ عاطفت میں ہوئی آپ کے والد نے علوم ظاہری آپ کو پڑھائے۔ علوم ظاہری سے جلد ہی فارغ ہوئے غوث الاعظم محی الدین حضرت سید عبدالقادر جیلانی سے عشق پیدا ہوا۔ شہر کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ کئی سالوں تک جنگلوں میں پھرتے رہے۔ آپ ۹۸۰ھ میں دہلی پہنچے۔ دہلی کے قیام کے دوران ایک روز آپ کی ایک مجذوب سے سرائے میں ملاقات ہوئی۔ وہ مجذوب آپ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور یہ الفاظ زبان پر لایا۔ "آج لوگ سلوک طریقت و حصول دولت کے واسطے بابا شیخ داؤد کے در پر جاتے، میں اور یہ ایسی نعمت کو گھر میں چھوڑ کر باہر جاتے ہیں" یہ الفاظ آپ کے لیے کافی تھے۔ یہ اشارہ پا کر آپ دہلی سے شیر گڑھ روانہ ہوئے۔ شیر گڑھ پہنچ کر آپ حضرت شیخ داؤد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

حضرت شیخ داؤد آپ کو دیکھتے ہی آپ سے اس طرح مخاطب ہوئے "معالی! آگے آؤ پھر بیان کرو کہ جب اس مجذوب کو دیکھا کیا کہا اور کیا سنا" آپ نے سارا واقعہ حضرت داؤد کے گوش گزار کیا۔ حضرت شیخ داؤد نے فرمایا "ہمیشہ میرے پاس رہو تاکہ تم کو وہ حاصل ہو جو دوسری جگہ ساری عمر میں بھی حاصل نہ ہو۔" آپ حضرت شیخ داؤد کے مرید اور ممتاز خلیفہ ہیں ایک دن کا واقعہ ہے کہ آپ حیران پریشان اور رنجیدہ تھے۔ آپ کو غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے دیدار کے شوق نے بے چین کر رکھا تھا۔ آپ کے پیرو مرشد حضرت شیخ داؤد کو بذریعہ کشف آپ کی حالت کی اطلاع ہوئی۔ آپ کو تسلی دیتے ہوئے آپ کے پیرو مرشد نے فرمایا۔ "آج یا کل میں تجھ کو مقدس معلی کی جانب حاضر کرتا ہوں اس گھڑی کا انتظار کرو۔" آپ اس نیک ساعت کا نہایت بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ ایک رات جبکہ آپ کچھ سوتے اور کچھ جاگتے تھے آپ نے دیکھا کہ آپ کے پیرو مرشد تشریف لائے ہیں وہ آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر حضرت غوث الاعظم کی محفل میں حاضر ہوئے ہیں۔ حضرت غوث الاعظم کے سیدھے طرف ابوالمعالی عراقی بیٹھے ہیں۔ آپ کے پیرو مرشد وہاں پہنچ کر حضرت غوث الاعظم کے بائیں طرف بیٹھے۔

آپ ۱۱۱۰ھ میں اپنے پیرو دستگیر کے وصال کے بعد لاہور میں آکر رہنے لگے۔ اور مخلوق کو رشد و ہدایت فرمانے لگے۔ آپ صاحب کشف و کرامات تھے۔ حضرت غوث الاعظم کے سچے عاشق تھے۔ اپنے پیرو مرشد سے والہانہ عشق تھا اور اپنے پیرو مرشد کی عنایات و الطاف و کرم کا اعتراف کرتے ہیں۔ آپ فنا فی الشیخ کے درجے پر فائز تھے۔ آپ ایک خدا رسیدہ بزرگ ہونے کے علاوہ ایک عالم بھی تھے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں۔ تحفتہ القادری' باغ ارم' زعفران زار' رسالہ مونس جاں' آپ ایک خوش گو شاعر بھی تھے۔ آپ کا تخلص "غربتی" ہے۔ کہیں آپ نے "مسلمے" اور کہیں "معالی" تخلص بھی استعمال کیا ہے۔

آپ اس خیال سے متفق نہیں کہ مرنے کے بعد عشق و محبت کا تعلق بے کار ہے۔ آپ کے نزدیک ہر حالت میں عشق و محبت جائز اور روا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ نفس کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے باوجود نفس کی

مخالفت کے محنت و ریاضت میں لگا رہنا چاہیے آپ کے نزدیک نفس کی مخالفت نیک فال ہے جس طرح کہ کوٹھے پر زاغ کی آواز مہمان کے آنے کی بشارت ہے۔ اسی طرح نفس کا پکارنا مراد پوری ہونے کی دلیل ہے آپ کے مشہور اقوال یہ ہیں "جب میں دل و جان سے محبوب کا عاشق زار ہوں اور جناب کی بھی کمال مہربانی میرے شامل حال ہے تو پھر مجھے کسی غیر کی کیا حاجت ہے۔" "یاالٰہی! مجھے اپنے پیر کی محبت کی توفیق عطا فرما تاکہ میرا مقصود حاصل ہو۔" آپ کی بے شمار کرامات مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ ملا شاہ ایک عالم و عامل ملا نعمت اللہ کے ہمراہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ وہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو تسبیح نذر کی۔ وہ تسبیح دیکھ کر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ آپ کی کرامت ہو گی۔ اگر اپ ان کی خواہش سے بذریعہ کشف مطلع ہوں اور وہ تسبیح ان کو عطا کریں۔ وہ جب آپ سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے وہ تسبیح ان کو دی اور تاکید فرمائی کہ ہر روز سو بار صلوۃ پڑھا کریں۔

ملا نعمت اللہ کو ایک دن یہ خیال آیا کہ ان کو جو اعتقاد اور محبت غوث الاعظم محی الدین حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے ہے اس کی خبر غوث الاعظم کو بھی ہو گی یا نہیں۔ اسی رات کو ملا نعمت اللہ نے خواب میں دیکھا کہ وہ کسی کام میں درماندہ ہیں اور ننگے سر ہیں۔ حضرت غوث الاعظم وہاں تشریف لائے اور سفید دستار ان کو مرحمت فرمائی اور ان سے فرمایا کہ "ملا نعمت! ہم ایسی جگہ (حالت میں) تمہارے حال سے خبردار ہیں" دوسرے دن آپ نے ان کو بلایا جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کو سفید دستار عطا کی اور فرمایا کہ یہ وہی دستار ہے۔

آپ ۱۶ ربیع الاول ۱۰۲۴ھ کو واصل بحق ہوئے۔ آپ کا مزار اقدس لاہور ہوٹل میکلوڈ روڈ کے نزدیک شاہ ابوالمعالی روڈ پر واقع ہے اور فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے۔

حضرت موج دریا بخاریؒ

آپ کا اصل نام سید میران محمد شاہ تھا اور بخاری سیدوں میں سے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب نو واسطوں سے حضرت جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے جا ملتا ہے۔ آپ کی ولادت ۹۴۰ھ اوچ شریف میں ہوئی اور وہیں پر آپ نے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ آپ اپنے زمانے کے سلسلہ سہروردیہ کے مشاہیر مشائخ کرام میں شمار ہوتے تھے۔

جب شہنشاہ اکبر چتوڑ گڑھ کے قلعہ کی مہم میں مصروف تھے تو آپ سے اس مہم میں دعا کا خواستگار ہوا۔ چنانچہ خدا کے فضل سے اور آپ کی دعاؤں سے چتور گڑھ کا قلعہ فتح ہو گیا تو اکبر کے دل میں آپ کی عقیدت کئی گنا بڑھ گئی۔ اکبر نے آپ کو پٹیالہ کے علاقے میں جاگیریں عطا کیں۔ اس میں سے بعض دیہات لاہور کے علاقے میں بھی تھے۔ اس بنا پر حضرت موج دریا نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور فرمایا کہ ہمارا لنگر تین جگہوں سے جاری ہو گا۔ ایک لاہور میں ہماری خانقاہ سے دوسرے موضع خان فنا سے اور تیسرے موضع پسیانوالہ سے۔ چنانچہ ان تینوں جگہوں سے لنگر جاری ہوئے۔

حضرت موج دریا نے ۱۰۱۳ھ میں وفات پائی اور لاہور میں مدفون ہوئے۔ آپ کے خلفاء میں سید عبدالرزاق جو سید مکی کے نام سے مشہور ہیں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ سید عبدالرزاق مکی زاہد و متقی تھے اور علوم ظاہری اور باطنی میں کمال رکھتے تھے۔ وہ سبزواری سیدوں کے خاندان سے تھے۔ ابتداً غزنی سے لاہور آ کر موج دریا بخاری کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ سید عبدالرزاق نے ۱۰۴۸ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار پرانوار انار کلی میں واقع ہے جو نیلا گنبد کے نام سے مشہور ہے۔

سید عزیز الدین مکیؒ

سید عزیزالدین مکی کا شمار سادات عظام اور اولیائے کبار میں ہوتا ہے۔ ان کے بزرگوں کا وطن بغداد تھا۔ اور ان کا سلسلہ طریقت چند واسطوں سے حضرت جنید بغدادی (وفات ۲۹۷ھ۔ مزار مقدس بغداد) سے جا ملتا ہے۔ وہ پہلے بغداد سے مکہ معظمہ آئے اور تقریباً" بارہ سال وہاں قیام کیا۔ اور پیر مکی کے نام سے مشہور ہوئے۔ پھر وہ ہندوستان تشریف لائے اور ۱۱۸۱ء میں جب کہ سلطان شہاب الدین غوری نے لاہور کا محاصرہ کر رکھا تھا لاہور پہنچے۔ اس وقت لاہور میں غزنویوں کی حکومت تھی۔ لاہور کے غزنوی حاکم خسرو ملک نے اپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے یہ ملک چھ سال تک تمہارے پاس امانت ہے۔ اس کے بعد اس ملک پر غوری قابض ہوں گے۔ چنانچہ سلطان شہاب الدین غوری ناکام ہو کر واپس چلا گیا۔ پھر ۱۱۸۶ء میں براہ سیالکوٹ لاہور پر حملہ آور ہوا اور فتح کر لیا۔

حضرت پیر مکی لاہور میں چھتیس سال درس و تدریس، ارشاد و تلقین میں مصروف رہے۔ اور بہت سے طالبان حق نے آپ سے حق کی راہ پائی۔ حضرت پیر مکی نے ۶۱۲ھ مطابق ۱۲۱۸ء میں وفات پائی اور لاہور میں مدفون ہیں۔

سید شاہ جمال قادری سہروری

سید شاہ جمال ایک شیخ تھے۔ آپ کا سلسلہ عالیہ سہروردیہ شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملتا ہے جو کہ حضرت ابوبکر صدیق اکبر کی نسل سے تھے۔ شاہ جمال حسینی سید ہیں۔ آپ کے ایک بھائی شاہ کمال خود بھی صاحب کمال تھے۔ ان کا مزار بھی لاہور میں ہے۔

دمدمہ شاہ جمال کے متعلق لکھا ہے کہ آپ نے یہ پانچ منزل بلند تعمیر کیا تھا۔ اس کے پاس ہی سلطان بیگم دختر اکبر بادشاہ نے باغ، مکان، سیرگاہ، تالاب اور بارہ دری بنوائی تھی۔ بادشاہ زادی نے کہلا بھیجا کہ ایک فقیر کے لیے زیبا نہیں کہ شاہی عمارات سے بالاتر عمارت تعمیر کرے۔ لہٰذا اسے خود پست کر دے تو خیر ورنہ ہم گروا دیں گے۔ یہ سن کر شاہ جمال ہنسے اور فرمایا کہ بہت اچھا ہم اس رات خود اس دمدمہ کو پست کر دیں گے۔ مگر یاد رہے یہ فقیر خانہ قیامت تک قائم رہے گا۔ اور شاہی باغ وغیرہ برباد ہو جائیں گے۔ چنانچہ دمدمہ کی پانچ منزلیں حضرت شاہ جمال کی دعا پر حکم خداوندی سے۔ زمین میں غرق ہو گئیں اور اوپر صرف دو رہ گئیں جو اب تک موجود ہیں۔

حضرت شاہ جمال کا ایک ہندو کھتری ددومل نامی معتقد لاولد تھا۔ اور اکثر بغرض دعا آپ کے پاس آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ چند تازہ خربوزے بطور تحفہ لایا۔ آپ نے قبول فرمائے اور دو اس کے حوالے کر کے خود نماز عصر پڑھنے لگے۔ اس نے خیال کیا کہ شاید آپ نے مجھے یہ خربوزے چھلکا اتارنے کے لیے دیئے ہیں چنانچہ اس نے ایک کو تراشا تھا کہ آپ نماز سے فارغ ہو گئے اور کہا تو نے یہ کیا کیا؟ میں نے تو اس لئے دیئے تھے کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ

مل کر کھاؤ گے تو خداوند تعالیٰ تمہیں دو بیٹے عطا کرے گا۔ اب ایک تو نے تراش لیا ہے۔ خوب ہوا۔ اب ایسے ہی خربوزے لے جاؤ اور میاں بیوی مل کر کھاؤ۔ ایک لڑکا مسلمان پیدا ہو گا اور ایک ہندو' چنانچہ ودومل نے حسب الارشاد شیخ خربوزے استعمال کئے۔

اور نو ماہ بعد واقعی دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک مسلمانی ختنہ کے ساتھ اور دوسرا نامختون۔ ودومل مختون بیٹے کو لے کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور بہ اسم فخرالدین موسوم فرمایا اور تربیت فرما کر ظاہری اور باطنی دولت سے سرفراز کیا۔

جہاں آپ کا تعویذ مزار ہے اس کے نیچے حجرہ میں آپ چلہ کاٹا کرتے تھے آخری چلہ میں حسب معمول دروازہ مسدود کئے بیٹھے تھے کہ تیس دن کے بعد بارش کے صدمے سے حجرہ کے آگے کی دیوار گر پڑی۔ خادموں نے چاہا کہ حجرے کا دروازہ کھول کر آپ کو باہر نکالیں تو اندر سے آواز آئی کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ میری قبر اوپر بنا دو اور اس حجرے کو میرا مدفن تصور کرو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ واقعہ ۴ ربیع الثانی ۱۰۴۹ھ مطابق ۴ اگست ۱۶۳۹ء بعہد شاہجہاں وقوع پذیر ہوا۔ آپ نے سو برس سے زیادہ عمر پائی۔

سید مٹھا لاہوریؒ

آپ کا اصل نام سید ابی غفار حسینی تھا۔ آپ کا شجرۂ نسب چند واسطوں سے حضرت امام حسینؓ سے جا ملتا ہے۔ سید مٹھا لاہوری کے والد کا نام سید جمال الدین بن سید محمد تھا۔ آپ سادات اور مشائخ کے خانوادے سے تھے۔ یہ خاندان خوارزم میں سکونت پذیر تھا لیکن جو خوارزم چنگیز خاں کی قتل و غارت گری سے ۱۲۲۱ء میں تباہ ہوا تو آپ کے والد ماجد سید جمال الدین خوارزم سے ہندوستان آئے اور لاہور میں سکونت اختیار کی۔ لاہور کے رہنے والے ان کے معتقد ہو گئے اور جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہونے لگے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد آپ مسند شیخیت پر رونق افروز ہوئے۔ اپ بے حد شیریں کلام تھے اس لیے مٹھا کے لقب سے مشہور ہوئے یہاں تک کہ جس محلّہ میں آپ رہتے تھے وہ بھی سید مٹھا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ سید مٹھا ۶۶۱ھ مطابق ۱۲۶۵ھ میں واصل الی اللہ ہوئے۔ لاہور میں آپ کا مزار پر انوار مرجع خاص و عام ہے۔

الحاج حافظ محمد شاہ عنایت قادری شطاریؒ
مرشد بلھے شاہ

حضرت شاہ عنایت قادری شطاریؒ ان اولیاء کاملین میں سے ہیں جنہوں نے گیارھویں صدی ہجری کے آخر اور بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں اعلاء کلمۃ الحق، تبلیغ دین متین، امربالمعروف و نہی عن المنکر اور اشاعت سنت نبویہؐ کے ذریعے انقلاب برپا کیا۔ شریعت و طریقت کے اس آفتاب عالم تاب کے دست حق پرست پر سینکڑوں غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں فاسق و فاجر تائب ہوئے۔

آپ کا اسم گرامی محمد عنایت اللہ اور والد کا نام شیخ پیر محمد تھا۔ آپ کی تاریخ پیدائش آپ کے ذاتی مسودات کے مطابق ۱۰۵۶ھ - ۱۶۴۶ء قصور ہے۔ آپ مغل بادشاہ شاہ جہان اورنگ زیب عالمگیر اور محمد شاہ رنگیلا کے دور کے بزرگ تھے۔ آپ کے والد چونکہ بہت بڑے عالم فاضل اور صاحب بصیرت انسان تھے اس لیے انہوں نے آپ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے آپ کو اس زمانہ کے جید علماء کرام کی خدمت میں بھیجا۔ عربی اور فارسی زبانوں کے ساتھ ساتھ آپ نے تمام دینی علوم میں بھی دسترس حاصل کی۔ آپ چونکہ صوفی منش گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس وجہ سے آپ کا فقر و تصوف کی طرف طبعی رجحان تھا۔

آپ نے پانچ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ نو برس کی عمر میں فارسی، عربی کی درسی کتب پر حاوی ہو گئے اور بارہ برس کی عمر میں تمام دینی علوم سے بہرہ ور ہو گئے۔

حضرت شاہ عنایت قادری نے ظاہری علوم و فنون کی تکمیل کے بعد اصلاح باطن کی خاطر حضرت شاہ محمد رضا قادری شطاریؒ کے دست حق پر بیعت کی اور ان کے مرید ہو گئے۔ حضرت شاہ محمد رضا قادری شطاریؒ زاہد اور متقی درویش تھے اور آپ کا شہرہ دور دور تک تھا۔ قلبی اور روحانی سکون کے طالب آپ سے فیض پاتے تھے۔ اس فیض نظر کے حصول کیلئے حضرت شاہ عنایت قادریؒ طویل عرصہ تک آپ کی خدمت میں رہے۔ آپ نے بے پناہ ریاضت و مجاہدہ کیا اور سلوک کی منزلیں طے کیں۔ آخر کار علوم باطنیہ کی تکمیل پر آپ کے پیرو مرشد نے آپ کو خرقہ خلافت عطا کیا اور سلسلہ طریقت قادریہ شطاریہ کی اجازت مرحمت فرمائی۔

حضرت شاہ عنایت قادری خرقہ خلافت پانے کے بعد اپنے پیرو مرشد کے حکم کے مطابق اپنے شہر قصور آ گئے اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ کردار کی بلندی، سیرت کی پاکیزگی اور عشق خداوندی سے سرشار باطن کی وجہ سے حضرت شاہ عنایت قادری کی بزرگی، کرامات اور ولایت کے چرچے چاروں طرف پھیل گئے۔ خلق خدا کا تانتا بندھ گیا۔ ہزاروں لوگ آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ قلیل مدت میں آپ قصور اور گرد و نواح کے لوگوں کی عقیدت کا مرکز بن گئے۔ آپ کے حلقہ درس میں قرآن و تفسیر اور حدیث و فقہ کی تدریس جاری تھی۔ خلق کثیر نے آپ کے علمی و روحانی فیوض و برکات سے استفادہ کیا۔ لیکن وہاں آپ کے حاسدوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جنہوں نے آپ کی مخالفت شروع کر دی۔ اس بعد سے آپ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ قصور سے لاہور منتقل ہو گئے اور یہاں اپنی آبائی زمین واقع گاؤں مزنگ (موجودہ شارع فاطمہ جناح) میں سکونت اختیار کر لی اور درس و تدریس کے سلسلے کا آغاز کر دیا۔ بہت جلد ہی لاہور میں آپ کا سلسلہ درس وسیع ہو گیا۔ آپ کے درس میں قرآن و حدیث کی تعلیمات کے علاوہ مثنوی مولانا روم، کتب تصوف اور رموز طریقت و معرفت کے دریا بہائے جاتے تھے۔

مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا نے آپ کی شہرت و عظمت سے متاثر ہو کر

آپ کی خدمت میں حاضری دی اور اندرون بھاٹی گیٹ میں واقع اونچی مسجد کی امامت کی درخواست کی جسے آپ نے قبول فرمایا۔ اس مسجد کی کرسی اونچی ہے اس لیے اس کو اونچی مسجد کہتے ہیں۔ اسکی عمارت خاصی پرانی ہے۔ محرابوں پر قرآن مجید کی آیات کے علاوہ ایک کتبہ نصب ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے ابتدائی عہد میں تعمیر ہوئی۔ آپ اس مسجد میں امامت و خطابت کے ساتھ ساتھ درس قرآن و حدیث کی ذمے داری بھی نبھاتے رہے۔ آپ کے بعد عرصہ دراز تک آپ کی اولاد میں سے علماء کرام یہاں امامت و خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

حضرت شاہ عنایت قادری سلسلہ قادریہ شطاریہ کے اعلیٰ پائے کے بزرگ اور متبحر عالم دین تھے۔ دنیائے علم میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ فلسفیانہ مطالعہ کے سبب بڑی شہرت رکھتے تھے۔ نیک طبیعت، نیک فطرت، نماز پنج گانہ کے پابند، شب بیدار اور تہجد گزار تھے۔ وحدت الوجود کے داعی اور حامی تھے۔ طریقت اور حقیقت کے رموز عشق سے بہرہ ور تھے۔ اس مسلک میں آپ کا مقام دیگر صوفیائے کرام سے بالکل منفرد اور بلند ہے۔ آپ بہت بڑے عالم فاضل اور صاحب قلم بھی تھے۔ آپ نے مختلف علوم و فنون پر سولہ سے زائد کتابیں تصنیف فرمائیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ تنقیح المرام
۲۔ دستور العمل
۳۔ لطائف غیبیہ
۴۔ اذکار غیبیہ
۵۔ غایۃ الحواشی
۶۔ منقط الحقائق شرح کنز الدقائق
۷۔ مجموعہ عرفانی شرح مجموعہ سلطانی
۸۔ رسالہ وعربی و دارالحرب
۹۔ ذیل الاغلاط فی مسائل الغیب بالا فراط

۱۰۔ کلمات التامہ فی رد مطاعن الشفات
۱۱۔ رسالہ بہز الطاعات
۱۲۔ حواشی جواہر خمسہ
۱۳۔ رسالہ من قال ان الدعا فی الرزق کفر
۱۴۔ رسالہ فی حل شرب الدخان
۱۵۔ رسالہ دیگر فی حل تمباکو
۱۶۔ لباس برہنہ شرح بعض مقامات فتاویٰ برہنہ

یہ تمام کتابیں فارسی اور عربی زبان میں ہیں۔ آپ نے پنجابی زبان میں بھی تخلیقات کو قلم بند کیا مگر وہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں ضائع ہو گئیں۔ ان مذکورہ بالا سولہ کتابوں کے علاوہ بھی آپ نے مختلف کتابیں تصنیف کیں مگر آپ کے گدی نشین کے گھر آگ لگ جانے کی وجہ سے تمام کتب جل کر ضائع ہو گئیں۔ آپ کے کچھ قلمی نسخے اب بھی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں موجود ہیں۔

آپ کے خلفاء میں حضرت سید بلھے شاہ اور سید وارث شاہ بہت مشہور ہیں حضرت بلھے شاہ نے اپنی شاعری میں حضرت شاہ عنایت قادری سے اپنی عقیدت و محبت کا بارہا ذکر فرمایا۔

بلھے شاہ دی سنو حکایت ہادی پکڑیا ہوئی ہدایت
مرا مرشد شاہ عنایت اوہو لگائے پار

آپ نے پچاسی برس کی عمر میں ۱۱۴۱ھ بمطابق ۱۷۲۸ء وفات پائی۔ آپ کا مزار پرانوار شارع فاطمہ جناح پر گنگا رام ہسپتال سے چند قدم بطرف اسمبلی ہال موجود ہے۔ آپ کے مزار کے ساتھ بہت خوبصورت مسجد اور درسگاہ بھی ہے۔

شیخ محمد طاہر بندگی قادری نقشبندی

شیخ محمد طاہر حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی کے عظیم المرتبت خلفاء میں سے ہیں۔ انہوں نے پہلے اسکندر بن شاہ کمال کیتھلی سے سلسلہ قادریہ میں بیعت کی پھر حضرت مجدد الف ثانی کے والد حضرت شیخ عبدالاحد سرہندی کی خدمت میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مجدد الف ثانی سے وابستہ ہو گئے۔ اور انہوں نے شیخ محمد طاہر کو اپنے صاحبزادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کی تعلیم پر مقرر فرمایا۔ شیخ محمد طاہر نے حضرت مجدد الف ثانی کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلوک و معرفت کی اعلیٰ منازل طے کیں اور بارگاہ مجددی سے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ' قادریہ چشتیہ میں اجازت تلقین و ارشاد سے سرفراز فرمائے گئے۔ اپنے پیر کے ارشاد کے مطابق لاہور میں رشد و ہدایت اور ارشاد و تلقین کے لیے مامور کئے گئے۔ چنانچہ حکم کے مطابق لاہور پہنچے اور درس و تدریس و ارشاد و تلقین میں مصروف ہو گئے۔ شیخ محمد طاہر میں توکل و قناعت کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ جب وہ لاہور پہنچے تو انہوں نے اہل ثروت کو اپنے دروازے پر آنے سے روک دیا اور ایک قانعانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اپنا روزگار فقہ' حدیث و تفسیر کی کتابوں کو نقل کر کے اور ان کی تصحیح کر کے ان پر حاشیہ لکھ کر فروخت کر کے حاصل کرنے لگے اور شب و روز ارشاد و تلقین و تعلیم و تعلم میں مصروف رہے۔

حضرت شیخ محمد طاہر اپنے پیر حضرت مجدد الف ثانی سے غیر معمولی محبت

رکھتے تھے۔ آپ کی وفات بروز جمعرات ۸ محرم ۱۰۶۰ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار پرانوار میانی صاحب قبرستان میں مرجع خلائق ہے۔ شیخ محمد طاہر دن رات ارشاد و تلقین اور تعلیم و تعلم میں معروف رہتے۔ ہزاروں تشنگان علم معرفت نے ان سے سیرابی حاصل کی۔ ان کے تلامذہ میں حضرت مجدد الف ثانی کے تینوں صاحبزادے شیخ خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم شامل ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سید مودودی کا تعلق سادات اہل بیت کی اس شاخ سے ہے جس کا سلسلہ نسب امام علی تقی کے واسطے سے حضرت امام حسینؓ تک پہنچتا ہے۔ خاندان مودودیہ کے مورث اعلیٰ حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی تمام سلسلہ ہائے چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ ہیں۔ اس خاندان کے جو بزرگ سب سے پہلے ہندوستان آئے ان کا اسم گرامی خواجہ مودود ثانی تھا۔ شاہ عالم کے زمانے میں یہ خاندان مستقلاً دہلی میں آباد ہوا۔ مولانا مودودی کے والد سید احمد حسن ۱۸۵۵ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ سرسید احمد خاں، سید احمد حسن کی والدہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے الہ آباد میں پیشہ وکالت اختیار کیا۔ ننھیال کی طرف سے سید مودودی ترکی الاصل ہیں۔ ان کے نانا مرزا قربان علی بیگ شاعر اور صاحب قلم تھے مگر ان کا آبائی پیشہ سپاہ گری تھا۔ ان کے بزرگ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ماوراالنہر سے ہندوستان آئے اور مختلف فوجی مناصب پر سرفراز رہے۔

سید مودودی ۳ رجب ۱۳۲۱ھ بمطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء میں بروز جمعتہ المبارک اورنگ آباد (حیدر آباد دکن) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہی حاصل کی ۱۹۱۲ء میں نو سال کی عمر میں مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کی جماعت ہشتم میں داخل ہوئے۔ اس مدرسہ میں وہ اپنی کلاس میں سب سے کم عمر طالب علم تھے، لیکن اس کے باوجود اکثر مضامین میں ان کی معلومات دیگر طلباء سے زیادہ تھیں۔ کلاس ہشتم پاس کرنے کے بعد مولوی کلاس (میٹرک) میں اسی مدرسہ سے درجہ دوم حاصل کیا۔ ۱۹۱۴ء میں دارالعلوم حیدر آباد دکن

میں مولوی عالم (انٹرمیڈیٹ) کی کلاس میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۵ء میں ان کے والد پر فالج کا حملہ ہو گیا اور ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک کا زمانہ سخت مصائب' خانہ بدوشی اور پراگندہ حالی کا دور تھا۔ ۱۹۲۰ء میں والد محترم کے انتقال کے بعد شعبہ صحافت کو بطور پیشہ اپنایا اور "رسالہ مدینہ" بجنور کی ادارت میں شامل ہو گئے۔ اس کے علاوہ رسالہ "تاج" جبل پور اور اخبار "مسلم" دہلی کے بھی مدیر رہے۔

اب تک مختلف شہروں میں تھوڑا تھوڑا عرصہ قیام کرتے رہے تھے چنانچہ جب دہلی میں ٹک کر رہنا نصیب ہوا تو دوبارہ تعلیم کی طرف توجہ کی اور مختلف اساتذہ سے عربی' ادب' تفسیر' حدیث' فقہ' منطق اور فلسفہ کی کتب پڑھیں۔ اس زمانے میں انگریزی پر بھی عبور حاصل کیا۔ ۱۹۲۵ء میں رسالہ "الجمیعۃ" دہلی سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں مولانا محمد شریف خان مدرس دارالعلوم نعمانیہ دہلی سے "علوم عقلیہ و ادبیہ و بلاغت" اور "علوم اصلیہ و فروعیہ میں سند فراغت حاصل کی۔ پھر مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی سے ۱۹۲۷ء میں حدیث فقہ اور ادب میں سند فراغت و تدریس حاصل کی۔ جامع ترمذی اور موطا امام مالک کے سمع و قرآت کی تکمیل کی۔ ان تعلیمی و صحافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مولانا عملاً" بھی اس دور کی مختلف تحریکوں مثلاً" " انجمن اعانت نظر بندان اسلام" اور "تحریک خلافت" میں سرگرم رہے۔ ۱۹۲۶ء میں جب شدھی کی تحریک کے بانی سوامی شردھانند کے قتل پر پورے ملک میں اسلام کے نظریہ جہاد کے خلاف شدید پراپیگنڈہ شروع ہوا تو انہوں نے اسلام کے نظریہ جہاد کے تفصیلی مطالعہ کے بعد ایک مبسوط علمی' تحقیقی اور تجزیاتی کتاب لکھی جس میں نہ صرف اسلامی جہاد کی اصل حقیقت واضح کی بلکہ مستشرقین کے تمام تر الزامات کا جواب دیا۔

اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کاوش تھی جس کی تمام حلقوں کی طرف سے زبردست پذیرائی ہوئی۔

"الجمیعۃ" دہلی کو تین سال تک کامیابی سے نکالنے کے بعد جمعیت

علمائے ہند سے فکری و سیاسی اختلاف کی بناء پر اس سے علیحدہ ہو گئے اور آئندہ کیلئے تصنیف و تالیف کے مشن کو اپنے لئے پسند کیا۔ ۱۹۳۲ء میں رسالہ "ترجمان القرآن" حیدر آباد دکن میں سلسلہ وار مضامین کا سلسلہ شروع کیا اور بعدازاں یہ رسالہ خرید لیا اور دم مرگ تک اس کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

مارچ ۱۹۳۷ء کو آپ کی شادی محترمہ محمودہ بیگم دختر سید نصیرالدین شمسی سے انجام پائی۔

اسی دور میں چوہدری نیاز علی خاں نے پٹھان کوٹ کے قریب بستی جمال پور میں "دارالسلام ٹرسٹ" قائم کیا تو مولانا مودودی کو اقبال کی سفارش پر اس کا صدر مقرر کیا گیا۔ آپ دہلی سے پٹھانکوٹ منتقل ہو گئے اور جمال پور میں خطبات جمعہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۳۹ء میں بوجوہ آپ لاہور منتقل ہو گئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے اعزازی معلم مقرر ہوئے۔ یہاں ایک سال تک تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور "ترجمان القرآن" کی ادارت کے فرائض بدستور سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد اسلامی نظام حکومت اور دستور کا خاکہ تیار کرنے کیلئے یو۔ پی پراونشل مسلم لیگ کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو اسلامیہ پارک پونچھ روڈ میں "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک تحریک کی بنیاد رکھی۔ تاسیسی اجلاس میں ۷۵ افراد نے حلف اٹھایا اور بہ اتفاق رائے سید مودودی کو امیر جماعت اسلامی منتخب کیا گیا۔ ایک سال بعد جماعت اسلامی کا دفتر چوہدری نیاز علی خان کی دعوت پر پٹھانکوٹ ضلع گورداسپور منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت جب پٹھانکوٹ کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا تو سید مودودی اپنے رفقاء کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئے اور ذیلدار پارک اچھرہ میں کوٹھی حاصل کی گئی اس کوٹھی میں آپ کی رہائش کے ساتھ جماعت کا دفتر بھی تھا۔ یہی کوٹھی آئندہ ۲۷ سال تک جماعت کا مرکزی دفتر رہی۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں آپ نے دستور ساز اسمبلی کے سامنے چار نکاتی مطالبہ کیا جو مطالبہ

نظام اسلامی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس عرصے میں مختلف طبقوں اور قوتوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کے سبب قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ۱۹۵۳ء میں آپ کو پمفلٹ "قادیانی مسئلہ" شائع کرنے کی پاداش میں سزائے موت کا حکم سنایا گیا جسے بعد ازاں ۱۴ سال قید بامشقت میں تبدیل کر دیا گیا لیکن ڈھائی سال بعد ہائی کورٹ نے آپ کو اس مقدمہ سے بری کر دیا۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں "تفہیم القرآن" کی اشاعت کے سلسلے میں ممالک عربیہ کا طویل سفر کیا اور قرآن مجید میں مذکور تمام مقامات مقدسہ اور گذشتہ اقوام کے تباہ شدہ کھنڈرات کا مشاہدہ کیا۔ اس سفر سے واپسی کے بعد اپنی تمام تر علمی و مذہبی صلاحیتوں کو بروئے کارلاتے ہوئے آئندہ تمام زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری اور بے شمار معرکۃ آلارا تصانیف رقم کیں۔ ۱۹۷۲ء میں مسلسل علالت اور ضعف کی وجہ سے جماعت اسلامی کی امارت سے دستبردار ہو گئے اور بقیہ زندگی بطور رکن کام سرانجام دیتے رہے۔

مولانا مودودی کی شخصیت غیرت و خودداری اور ایثار و قربانی کا پیکر تھی۔ ان کو کسی نے ایک لمحے کیلئے بھی مغلوب الغضب نہیں دیکھا تھا۔ لین دین اور بیت المال کے معاملات میں بہت حساس تھے۔ وہ بہت وسیع النظر، حلیم اور شفیق انسان تھے۔ ان کی زندگی کے تمام معاملات احکام خداوندی اور اسوہ نبویؐ کے تابع تھے۔ ایسے گنج ہائے گرانمایہ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

آپ کی تصنیفی و تالیفی کتب کی تعداد تقریباً ۷۵ تک ہے۔ ان میں درج ذیل کتب خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

۱۔ تفہیم القرآن

یہ شہرۂ آفاق تفسیر قرآن مجید چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تقریباً عرصہ تیس سال میں مکمل ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف نے کوشش کی ہے کہ قرآن عربی کا مفہوم اس طرح اردو میں منتقل کر دیا جائے کہ اردو داں طبقہ اس کو اصل روح کے ساتھ اخذ کر سکے۔ قرآن کے ترجمہ میں پیراگراف

بندی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس سے قرآنی مضامین الگ الگ نمایاں ہو گئے ہیں۔ ہر سورۃ کے شروع میں اس کا تعارف' زمانہ نزول اور اہم مباحث کا خلاصہ درج ہے۔ تفہیم القرآن کا مقدمہ بڑا سیر حاصل ہے اس میں قرآن کے موضوع' مکی و مدنی سورتوں کے مدعا کی وضاحت و پس منظر ترتیب قرآن کی حکمت اور مخاطبین قرآن کی نفسیات بیان کی گئی ہے۔

۲۔ رسائل و مسائل

یہ کتاب دیگر کتب سے اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں مختلف قسم کے سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں قرآن حدیث' فقہ' علم کلام' سیاسیات' معاشیات' نفسیات غرض علم و عمل کے ہر شعبہ سے متعلق مختلف النوع سوالات اور اعتراضات کے مدلل اور آسان فہم جواب دیئے گئے ہیں۔

۳۔ خلافت و ملوکیت

یہ کتاب تاریخ اسلام کے انتہائی نازک موضوع پر لکھی گئی ہے مصنف نے اس کتاب میں نہایت احتیاط اور توازن کے ساتھ خلافت اور ملوکیت کی حقیقت کے بارے میں معتدل مسلک اختیار کیا ہے۔ خلافت اور ملوکیت کا فرق واضح کیا ہے۔

۴۔ سیرت سرور دو عالمؐ

اس کتاب کی تکمیل مولانا کی دلی تمنا تھی مگر مسلسل محنت کثرت کار اور بیماری کے سبب اسے مکمل نہ کر سکے تھے۔ آپ کی یہ خواہش ان کے دیرینہ رفیق نعیم صدیقی نے اس طرح پوری کر دی کہ سیرت مطہرہؐ سے متعلق مولانا کی تمام کتب میں بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کر کے ایک مجموعہ کی صورت دیدی اس کتاب کی چار جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں بنیادی مباحث' منصب نبوت' وحی' بعثت آنحضورؐ' ماقبل بعثت ماحول عرب اور مختلف گروہوں کے احوال شامل

ہیں۔ دوسری جلد میں آنحضورؐ کی پیدائش سے لیکر ہجرت مدینہ تک کے احوال و واقعات درج ہیں تیسری جلد آنحضورؐ کے مدینہ کی زندگی کے احوال پر مشتمل ہے۔ چوتھی جلد آنحضورؐ کی اصلاحات تعلیمات اور نظام زندگی کے مختلف شعبوں میں لائے جانے والے تغیرات کا بیان ہے۔

پہلی دو جلدیں سید مودودی کی زندگی میں شائع ہوئیں۔

سید مودودی کے اسلوب بیان میں حیرت انگیز تنوع پایا جاتا ہے اور خاص طور پر ترجمہ کی صنف ان کے ہاں درجہ کمال پر نظر آتی ہے۔ ان کے ترجموں میں اصل کی روح اس طرح کارفرما ہوتی ہے کہ نقل پر اصل کا گماں ہوتا ہے۔ ان کی نثر میں حقیقت پسندی' واقعات کا مستند بیان' استدلال' اعتدال' بلاغت' سلاست مقصدیت اور خلوص جیسی خوبیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا کی تحریروں میں ادبی محاسن' تشبیہ و استعارہ' محاورہ' روزمرہ' تراکیب' تکرار' شعریت' خطابیہ آہنگ' جزئیات نگاری اور منظر نگاری کی مثالیں بھی جابجا ملتی ہیں۔

اس عظیم علمی شخصیت کا وصال ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو بفیلو (امریکہ) کے ہسپتال میں ہوا اور آپ کے جسد خاکی کو لاہور لاکر آپ کی رہائش واقع ۵ ذیلدار پارک اچھرہ لاہور میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کی کچی قبر کوٹھی کے لان میں واقع ہے اور اس پر کسی قسم کا کوئی تعویذ یا کتبہ نصب نہیں ہے۔

maablib.org

شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ

مولانا احمد علی لاہوری قصبہ جلال آباد ضلع گوجرانوالہ میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا عبدالحق اور مولانا عبیداللہ سندھی سے دینی تعلیم حاصل کی' بعدازاں مولانا سندھی آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے اور اپنی جانشینی کی سند عطا کی۔

۱۹۱۷ء میں مولانا احمد علی نے لاہور آ کر بیرون شیرانوالہ دروازہ سکونت اختیار کی اور مسجد لائن سبحان خاں میں درس قرآن شروع کیا۔ ۱۹۲۱ء میں ہجرت کر کے کابل چلے گئے لیکن کچھ عرصہ بعد واپس آ گئے اور دوبارہ درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۲۲ء میں انجمن خدام الدین اور ۱۹۲۴ء میں مدرسہ قاسم العلوم (بیرون شیرانوالہ دروازہ) کی بنیاد رکھی۔ مفسرین قرآن میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔ پاکستان و بیرونی ممالک کے تقریباً" پانچ ہزار علماء نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ کی تفسیر قرآن ان چند تفاسیر میں سے ہے جنہیں مستند اور جامع سمجھا جاتا ہے۔ درس و تدریس اور اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ مولانا نے جنگ آزادی میں بھی نمایاں حصہ لیا اور اس سلسلہ میں متعدد مرتبہ گرفتار ہوئے۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوری اپنے شہرہ آفاق درس قرآن' اصلاح عقائد کے عظیم الشان کام' موثر و مقبول مواعظ اور مخلصانہ دینی خدمتوں کی بناء پر پاکستان میں مقبول خاص و عام تھے۔ اپنے زمانہ کے بہت بڑے شیوخ طریقت میں سے بھی تھے۔ مولانا نے تمام زندگی زہد و تقویٰ' پرہیز گاری' عبادت

خداوندی اور خدمت انسانی میں گزاری۔ وہ نہ صرف قرآن کے عالم تھے بلکہ اس کے عامل بھی تھے۔ آپ کی زندگی کا ہر پہلو قرآنی تعلیمات سے مزین تھا اور اپنی زندگی کا زیادہ حصہ انہوں نے دین اسلام کی اشاعت اور فروغ میں گزارا۔ مولانا کی زندگی مسلمانان عالم کیلئے ایک پیغام ہے۔ وہ ایک خود آگاہ و خودمست عالم، صوفی اور درویش تھے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کا ایسا بے مثال نمونہ چھوڑا ہے جس کی تقلید ہر مسلمان کیلئے باعث فخر ہے۔ زمانے میں بڑے بڑے لوگ آتے رہیں گے مگر احمد علی کم پیدا ہوں گے۔

آپ کی تصانیف کی تعداد ۴۰ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں درج ذیل بے حد مقبول اور مشہور ہوئیں۔

۱۔ ترجمہ قرآن مجید ۲۔ قرآن مجید با حاشیہ ۳۔ قرآن مجید کا سندھی میں ترجمہ ۴۔ تفسیر القرآن ۵۔ خلاصۃ المشکوۃ (خطبات جمعہ) ۶۔ مجلس ذکر کے مواعظ ۷۔ اسلام میں نکاح بیوگان ۸۔ ضرورت القرآن ۹۔ پیغام رسولؐ ۱۰۔ خلاصہ اسلام

شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری کا انتقال ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء کو لاہور میں ہوا۔ آپ کا مرقد علاقہ بڑا مکان، حضرت طاہر بندگی روڈ قبرستان میانی صاحب میں واقع ہے۔ آپ کی قبر کے ساتھ آپ کی اہلیہ، بیٹوں مولانا حمید اللہ اور مولانا عبید اللہ انور کی بھی آخری آرام گاہیں ہیں۔

maablib.org

مولانا محمد ادریس کاندھلوی

آپ کا آبائی وطن یو پی کا مردم خیز قصبہ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر ہے۔ آپ کے والد جناب محمد اسماعیل صاحب بھوپال میں محکمہ جنگلات کے مہتمم تھے۔ وہیں آپ کی ولادت ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ والد کی طرف سے صدیقی اور والدہ کی طرف سے فاروقی ہیں۔ آپ کا خاندان علمی طور پر مشہور تھا۔ مفتی الٰہی بخش اور مولانا فخرالدین رازی جیسی جلیل القدر شخصیات آپ کے اجداد میں سے ہیں۔ آپ نے ابتدائی دینی تعلیم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی زیر نگرانی خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون میں حاصل کی اور نو سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کیلئے آپ نے مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا۔ اس مدرسے سے باقی ماندہ علوم و فنون کی تکمیل کے بعد ۱۹۱۹ء میں حضرت خلیل احمد محدث سہارنپوری اور مولانا ثابت علی سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغ حاصل کی۔

مظاہر العلوم سہارنپور سے فراغت کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور وہاں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری سے دوبارہ دورۂ حدیث پڑھ کر دوسری سند حاصل کی۔ اپ کے اساتذہ مین علامہ انور شاہ کشمیری کے علاوہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن علامہ محمد رسول خان ہزاروی اور علامہ شبیر احمد عثمانی شامل تھے۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی میں تدریس کا آغاز کیا اور ایک سال بعد دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے فرائض کی انجام دہی کا آغاز کیا اور آٹھ سال تک اس فرض کو پوری لگن اور تندہی سے نبھاتے

رہے۔ دارالعلوم دیوبند کے بعد حیدر آباد دکن چلے آئے اور درس و تدریس کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ اس عرصے میں آپ نے اپنی تصنیفی صلاحیتوں کا استعمال بھی عمدہ طریق سے کیا اور "التعلیق الصبیح" عربی شرح مشکوۃ المصابیح لکھی اور دمشق جاکر اس کی چار جلدیں طبع کرائیں۔

دس سال تک حیدر آباد میں دینی تعلیمات کی خدمت سرانجام دینے کے بعد آپ ایک بار پھر دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہو گئے اور تقریباً" دس سال تک تشنگان علم کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں آپ پاکستان آ گئے اور دو سال تک امیر بہاولپور کی دعوت پر جامعہ عباسیہ بہاولپور میں تدریس کے فرائض ادا کرتے رہے۔

لاہور میں مولانا مفتی محمد حسن نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی سعی و کاوش سے جامعہ اشرفیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ کی بنیاد رکھی تو آپ اس درسگاہ سے وابستہ ہو گئے اور زندگی کے آخری لمحہ تک اس سے وابستہ رہے۔ جامعہ اشرفیہ میں آپ کی خدمات کا عرصہ ۲۴ سال پر محیط ہے اور اس عرصہ میں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ نے آپ سے درس حدیث لیا اور فراغت کے بعد مولانا کے مقصد حیات کو آگے بڑھاتے رہے۔

مولانا ادریس کاندھلوی جامعہ اشرفیہ میں تدریس کے ساتھ ساتھ جامع مسجد نیلا گنبد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے۔ آپ کے بعض خطبات جمعہ کتابچوں کی صورت مین بھی شائع ہوئے۔

آپ نے تدریس کے ساتھ ساتھ تمام دینی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ آپ کی چھوٹی چھوٹی تصانیف کی تعداد ۱۰۰ کے قریب ہے۔ آپ کی اہم کتابوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ التعلیق الصبیح شرح مشکوۃ المصابیح

یہ کتاب مشکوۃ شریف کی مفصل شرح ہے۔ اس کی طباعت کیلئے آپ نے شام کا سفر کیا اور دمشق میں قیام فرما کر یہ کتاب طبع فرمائی۔

۲۔ تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری

اس کتاب کے بیس اجزاء ہیں جن میں سے پہلے تین اور آخری جز زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں باقی مخطوطہ محفوظ ہے۔

۳۔ سیرۃ المصطفیٰؐ

یہ سیرت النبویؐ پر لکھی جانے والی عمدہ کتاب ہے اس کتاب کی تین جلدیں ہیں۔

۴۔ المعارف القرآن (تفسیر)

یہ قرآن کی تفسیر جلد پنجم تک طبع ہوئی جو سورۃ توبہ تک ہے باقی تفسیر مکمل نہ کر سکے مگر جتنی جلدیں چھپی ہیں وہ علماء و طلباء کیلئے بڑا مفید ذخیرہ ہے۔

۵۔ کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ

یہ کتاب حیات حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہے ان کے علاوہ تائۃ القضا والقدر، عقائد اسلام، اصول اسلام، خلافت راشدہ، اسلام اور نصرانیت، شرائط مفسر و مترجم اور محبت حدیث وغیرہ کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نثر کے علاوہ عربی اور فارسی میں شعر بھی لکھتے تھے۔ آپ کے چند عربی اور فارسی قصائد چھپ چکے ہیں اور اکثر محفوظ ہیں۔ مقامات حریری کی شرح کی ابتداء میں آپ نے علم ادب کا مقدمہ لکھا ہے اور مقدمہ سے پہلے حضور اکرمؐ کی مدح میں عربی قصیدہ لکھا ہے۔ عربی ادب میں خاص مہارت رکھتے تھے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کے خصوصی شاگرد اور رشتہ دار تھے۔ علامہ عثمانی کی طرح نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریئے کی زبردست تبلیغ کرتے رہے۔ تحریک پاکستان کے آغاز سے لیکر اپنی زندگی کے آخری ایام تک اس پاک سرزمین کیلئے خدمات سرانجام دیتے رہے۔

برصغیر کے اس نامور عالم دین کا انتقال ۲۹ جولائی ۱۹۷۴ء کو لاہور میں ہوا۔ آپ کی قبر شیر شاہ ولی قبرستان اچھرہ میں واقع ہے۔ آپ کی قبر سے متصل حضرت شیر شاہ ولی کا مزار اور روزنامہ مشرق کے بانی عنایت اللہ کی قبر ہے۔

مولانا محمد مالک کاندھلوی

حضرت مولانا محمد مالک صاحب قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر یو پی (بھارت) میں ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی جناب مولانا ادریس کاندھلوی سے حاصل کی۔ دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور پھر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے جہاں ان دنوں ان کے والد ماجد شیخ التفسیر تھے۔ دار العلوم دیوبندی میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی سے فیض حاصل کیا اور دورہ حدیث کی اعلیٰ درجہ میں تکمیل کی اور سند فراغ حاصل کی۔ اس کے بعد دار العلوم ڈابھیل سے مکرر دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بہاولنگر کے ایک مدرسہ میں دو سال درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ پھر ڈابھیل چلے گئے اور دورہ حدیث کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس دوران قیام پاکستان وقوع پذیر ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ دار العلوم ٹنڈوالہ یار (حیدر آباد۔ سندھ) تشریف لائے اور پچیس سال تک اس دار العلوم میں استاد حدیث کی حیثیت سے خدمت حدیث میں گزارے۔

۱۹۷۴ء میں والد گرامی مولانا محمد ادریس صاحب جو جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث تھے ان کا انتقال ہو گیا۔ تو مولانا محمد مالک صاحب جامعہ اشرفیہ لاہور تشریف لائے اور مسند شیخ الحدیث والتفسیر پر جلوہ افروز ہوئے اور آخری دم تک جامعہ اشرفیہ میں درس حدیث دیتے رہے۔

مولانا محمد مالک صاحب ایک مایہ ناز استاد، بہترین واعظ و خطیب، علم و

عمل کا پیکر اکابر کے تقوی و طہارت کی تصویر اور اسلاف کی یادگار تھے۔ آپ کا شمار جلیل القدر علماء کرام میں ہوتا تھا۔ اور پورے عالم اسلام میں نہایت عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ پاکستان کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ ادارہ تحقیقات اسلامی کے رکن بھی رہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور اسلامی مشاورتی کونسل کے ممبر بھی رہے۔ شریعت بنچ حکومت پاکستان کے رکن اعلیٰ اور مجلس صیانتہ المسلمین کے صدر اور سواد اعظم اہل سنت پاکستان کے امیر اعلیٰ اور پاکستان کے مرکزی دینی مدارس کی شوریٰ کے معزز رکن بھی رہے۔ مولانا مالک کو دینی، علمی اور ملی خدمات کے اعتراف میں ستارہ امتیاز دیا گیا۔

مولانا محمد مالک کی تصانیف میں "تجرید صحیح مسلم" دو جلدوں میں، "التحریر فی اصول التفسیر" "منازل العرفان فی علوم القرآن" "سراج الہدایہ" "تاریخ حرمین" "پیغام مسیح" "اسلامی معاشرت" "پردہ اور مسلمان خاتون" اور "اسلام پر عیسائیت کے حملے اور ان کا جواب" اور دو جلدیں تفسیر معارف القرآن شامل ہیں۔

مولانا محمد مالک کا سیاسی نظریہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے سیاسی نظریے کے عین مطابق تھا۔ آپ نے شروع ہی سے دو قومی نظریے اور مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کی حمایت کی اور تحریک پاکستان کی حمایت میں پیش پیش رہے۔ پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ پر ہمیشہ زور دیتے رہے۔ مولانا محمد مالک صاحب آخر دم تک درس حدیث اور تصنیف و تالیف میں مشغول و مصروف رہے۔ بالآخر ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ء مطابق ۸ ربیع الاول ۱۴۰۹ھ خالق حقیقی سے جا ملے اور اچھرہ کے قبرستان شیر شاہ میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

maablib.org

علامہ سید صفدر حسین نجفی

علامہ سید صفدر حسین نجفی شیعہ علماء میں ایک بلند و ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ ۱۹۳۳ء میں علی پور ضلع مظفر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سید غلام سرور شاہ نقوی ایک جید عالم اور بلند پایہ استاد تھے۔ سید صفدر حسین نجفی نے ابتدائی تعلیم سید محمد باقر اور اپنے چچا سید محمد یار نجفی سے حاصل کی۔ مدرسہ باب العلوم ملتان میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک جلال پور ننگیانہ ضلع سرگودھا میں رہے اور پھر مدرسہ باب العلوم ملتان آ گئے۔ ۱۹۴۹ء میں علامہ حسین بخش جاڑا کے ساتھ جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں تشریف لے گئے اور درس نظامی کی تکمیل کی۔ ۱۹۵۱ء میں نجف اشرف گئے اور ۵ سال قیام کیا۔ ۱۹۵۶ء میں نجف اشرف سے واپسی پر لاہور میں جامعہ المنتظر میں وائس پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ جامعہ المنتظر پہلے وسن پورہ لاہور میں قائم ہوا تھا۔ وہاں سے یہ دارالعلوم ایچ بلاک ماڈل ٹاؤن میں منتقل کرنے میں علامہ صفدر حسین صاحب نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۵ء میں جامعہ المنتظر کے پرنسپل مقرر کئے گئے اور تاحیات اسی عہدہ پر قائم رہے۔

نجف اشرف سے واپسی پر آپ نے پوری توجہ تدریس و تالیف پر مرتکز کر دی لیکن قومی مسائل سے الگ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ لہٰذا آپ نے اپنی قومی زندگی کا آغاز عین اس وقت کیا جب ملک میں اعتقادی مسائل کے عنوان پر علماء اور واعظین کے درمیان فاصلے بہت بڑھ چکے تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنی صلح پسند طبیعت کے مطابق فریقین کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے ضروری اقدامات کئے۔

۲۲ مئی ۱۹۷۶ء کو جھنگ میں علماء کے درمیان تحریری معاہدے کے ذریعے صلح کرائی۔ ۱۹۷۹ء میں علامہ مفتی جعفر حسین کی قیادت پر اتفاق رائے کے بعد تحریک نفاذ فرقہ جعفریہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۷۹ء میں امام خمینی سے فرانس جاکر ملاقات کی۔ جامعہ المنتظر کو سرگودھا' مانچسٹر' ایران اور امریکہ میں جامعات کے قیام میں بھرپور کردار ادا کیا۔ پاکستان کے چاروں صوبوں میں بیس کے قریب مدارس کی بنیاد رکھی جہاں لاکھوں تشنگان علم و فضل بحر علم سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

علامہ سید صفدر حسین کی تصانیف بے شمار ہیں جنہوں نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ان کی تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) تفسیر نمونہ ۲۷ جلدوں میں ہے (۲) قرآن کا دائمی منشور (۳) پیام قرآن (۴) ولایت فقیہ (۵) ارشاد القلوب (۶) احسن المقال (۶) توضیح المسائل امام خمینی (۸) چہل حدیث (۹) اسلامی حدود تعزیرات (۱۰) نفس المہموم (۱۱) جہاد اکبر (۱۲) ہمارے ائمہ علیہ السلام (۱۳) معدن الجواہر (۱۴) عرفان المجالس (تاریخ اہل بیت) (۱۵) تذکرۃ الخواص (۱۶) الاثنا عشریہ (۱۷) دین حق عقل کی روشنی میں (۱۸) تذکرۃ الاطہار (۱۹) السعادت الابدیہ (۲۰) مناسک حج (۲۱) بارہ امام شیعہ و اہل بیت (۲۲) اسلامی جمہوریہ ایران پر اعتراضات کے جوابات (۲۳) کتاب زیارت (۲۴) یزیدی فرقہ (۲۵) حجت اثنا عشریہ (۲۶) مبادیات حکومت اسلامی (۲۷) انتخاب طبری (۲۸) تفسیر موضوعی (۶ جلدوں میں)

چند کتابوں کے مختصر کوائف درج ذیل ہیں۔

تفسیر نمونہ

یہ قرآن مجید کی تفسیر ہے جسے آقائے ناصر مکارم شیرازی کے زیر نگرانی و سرپرستی اسلامی جمہوریہ ایران کے اعلیٰ پائے کے علمائے کرام نے تدوین و تالیف فرمایا ہے۔ سید صفدر حسین نجفی نے ان ۲۷ جلدوں کا اردو میں

ترجمہ کیا ہے۔

احسان المقال

یہ کتاب ثقۃ المحدثین آقائے شیخ عباس قمی کی تالیف نبی کریم کی سیرت و سوانح مکمل بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت علی کی سیرت کے ساتھ ساتھ حضرت امام حسن و حسین کی زندگی سے متعلق سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں۔ خصوصی طور پر واقعہ کربلا کی تفاصیل دلنشین انداز میں بیان کی گئی ہیں اور حضرت امام حسین کی آل اور ائمہ کرام کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرآن کا دائمی منشور

یہ کتاب آیۃ اللہ استاد جعفر سبحانی کی نگارش ہے جسے علامہ صفدر نجفی نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں کسی ایک عنوان یا مضمون سے تعلق رکھنے والی آیات قرآن کو یکجا کر کے ان کی تفسیر بیان کی ہے۔ یہ کتاب چھ جلدوں میں ہے۔ علامہ صفدر نجفی نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کر کے قرآن اور اسلام کو سمجھنے میں آسانی پیدا کر دی ہے۔

پیام قرآن

یہ کتاب حضرت آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی کی تالیف ہے جسے علامہ صفدر صاحب نے فارسی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ قرآن کی تفسیر لکھنے کے پانچ طریقے حسب ذیل ہیں:

(i) تفسیر مفرداتی : ان تفاسیر میں قرآن کریم کے ہر لفظ کی مفرد طور پر تشریح و تفسیر کی جاتی ہے۔

(ii) تفسیر ترتیبی : اس میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب وار تفسیر کی جاتی ہے اور عام طور پر یہی طریقہ مروج ہے۔

(iii) تفسیر موضوعی : اس میں کسی ایک موضوع سے تعلق رکھنے والی

تمام آیات قرآنی کو یکجا کر کے ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔

(iv) تفسیر ارتباطی : اس میں ایک موضوع سے تعلق رکھنے والے دیگر موضوعات قرآن کو باہم ربط دے کر ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔

(v) تفسیر کلی : اس میں آیات قرآن اور موجودات جہاں کے باہمی تعلق کو پیش نظر رکھ کر وسیع تر بنیاد پر تفسیر بیان کی جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں موضوعی طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور کسی بھی موضوع کے متعلق آیات قرآنی کی یکجا تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کر کے علامہ صفدر نجفی نے تفسیر قرآن کی اس نئی جہت سے اردو دان طبقہ کو روشناس کرا کے گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

آپ کی وفات ۳ دسمبر ۱۹۸۹ء کو ہوئی۔ آپ کی آخری آرامگاہ جامعہ المنتظر ایچ بلاک ماڈل ٹاؤن میں واقع ہے۔

سید صفدر حسین نجفی اپنے اسلامی افکار و نظریات، تصانیف اور زریں کارناموں کی بدولت ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے۔

حضرت مولانا محمد سید دیدار علی شاہ

آپ ۱۸۵۶ء میں ریاست الور (بھارت) کے ایک ممتاز علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت امام علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ کی اولاد سے حسنی حسینی سید ہیں۔ آپ کے اسلاف مشہد سے وارد ہند ہوئے۔ حضرت سید اسماعیل قادری مشہدی (آپ کے پردادا) پہلے بزرگ تھے جو ریاست الور میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ کا خاندان ابتدا ہی سے زہد و تقویٰ اور بزرگی میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کے والد محترم سید نجف علی رضوی قادری جید عالم اور جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے۔

سید دیدار علی شاہ کا بچپن سلسلہ چشتیہ کے عظیم روحانی پیشوا، قطب وقت حضرت سید نثار علی رضوی (جو آپ کے عم بھی تھے) کی گود میں گزرا۔ جب تکمیل علوم کے بعد آپ سہارنپور سے الور تشریف لائے تو حضرت سید نثار علی رضوی نے اپنی صحبت میں رکھ کر سلوک کی منازل طے کرائیں اور علوم روحانیہ سے سرفراز فرمایا اور خلعت خلافت سے سربلند کیا۔

سید دیدار علی شاہ نے اپنے وقت کے جید علماء و فضلاء سے فیض حاصل کیا۔ دہلی میں مولانا شاہ کرامت اللہ خاں سے درس نظامی کا کچھ حصہ پڑھا اور پھر رامپور میں محدث عصر حضرت مولانا ارشاد حسین سے فقہ، تفسیر اور اصول معانی کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد امام منطق مولانا عبدالعلی رامپوری سے معقولات کا درس لیا درس نظامی کی تکمیل کے بعد مولانا احمد علی سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہو کر کتب حدیث کی سماعت کی۔ ان دنوں آپ کے ہم سبق مولانا وصی احمد محدث سورتی اور حضرت مولانا پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی تھے۔ آپ کے استاد مولانا احمد علی سہارنپوری فن حدیث کے امام

تصور کئے جاتے تھے۔ بخاری شریف پر آپ کے حواشی آپ کی قابلیت و علمیت کا شاہکار ہیں۔ ۱۲۹۲ھ بمطابق ۱۸۷۵ء میں مولانا دیدار علی نے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری سے سند حدیث حاصل کی۔ علوم ظاہری کے حصول کے بعد روحانی فیوض و برکات کے حصول کیلئے کاملین وقت کی تلاش میں رہے۔ انبالہ ان دنوں حضرت سائیں توکل شاہ انبالوی کے وجود مسعود کی وجہ سے مرکز انوار روحانی بنا ہوا تھا' آپ بھی انبالہ پہنچے اور دو سال آپ کے زیر تربیت رہے اور ریاضت و مجاہدہ میں مستغرق رہے۔ حضرت انبالوی نے آپ کو سلاسل اولیاء کی اجازت و خلعت عطا فرماتے ہوئے فرمایا کہ اب گنج مراد آباد جاؤ' وہاں تمہارا حصہ تمہارے لیے چشم براہ ہے۔ شیخ طریقت کی ہدایت پر آپ قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مراد ابادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلوک کی منزلیں طے کیں۔ سلسلہ قادریہ نقشبندیہ میں آپ سے بیعت ہوئے اور حدیث کی اس منفرد سند کے حصول کا شرف بھی حاصل کیا جو صرف ایک واسطہ سے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تک اور صرف دو واسطوں سے حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تک پہنچتی ہے۔

سید دیدار علی شاہ نے ساری عمر تبلیغ و اشاعت دین' قرآن و حدیث اور علوم اسلامیہ کی تدریس میں صرف کی۔ علوم ظاہری و باطنی کے حصول کے بعد آپ نے سب سے پہلے ریاست الور مسجد دائرہ میں درس قرآن شروع کیا۔ اس درس کی خصوصیت یہ تھی کہ سننے والے پابند شریعت ہو گئے اور ہزاروں لوگ گناہوں سے تائب ہوئے۔ ۱۸۹۰ء مین آپ نے ریاست الور مسجد دائرے والی میں ایک دینی مدرسے (مدرسہ قوت الاسلام) کی بنیاد رکھی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اور پھر اپنے استاد محترم کی ہدایت پر بہ سلسلہ تدریس بمبئی تشریف لے گئے اور وہاں تبلیغ و اشاعت دین کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۱۲ء میں لاہور تشریف لائے اور شہرہ آفاق درسگاہ دارالعلوم نعمانیہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ مدرسہ نعمانیہ میں آپ حدیث کا درس دیتے تھے اور لاہور و مضافات میں تبلیغی جلسوں سے خطاب فرماتے تھے۔ لاہور میں آپ کی تبلیغی مساعی سے مسلک اہل سنت کو بہت تقویت ملی۔ ۱۹۱۶ء میں لاہور

سے آگرہ تشریف لے گئے اور جامع مسجد اکبر آباد (آگرہ) کے مفتی و خطیب مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں حج بیت اللہ کی سعادت کیلئے حجاز روانہ ہوئے حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد مستقل طور پر لاہور میں سکونت پذیر ہوئے اور مسجد وزیر خاں اندرون دہلی دروازہ کے مفتی و خطیب مقرر ہوئے۔ یہاں پر آپ نے خطابت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے مرکزی انجمن حزب الاحناف ہند قائم کی اور اس انجمن کے ماتحت مسجد وزیر خاں میں درس نظامی کی تعلیم و تدریس شروع ہوئی۔ بعد ازاں مرکزی انجمن حزب الاحناف کے زیر انتظام اندرون دہلی دروازہ مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف کی بنیاد رکھی۔ اس دارالعلوم سے ہزاروں تشنگان قرآن و حدیث نے فیض حاصل کیا۔ اس دارالعوم کی دوسری شاخ گنج بخش روڈ نزد دربار حضرت داتا گنج بخش قائم کی گئی جس میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا گیا جو آج تک جاری ہے آپ نے اپنی زندگی میں تمام مذہبی و سیاسی تحریکوں میں بقائے اسلام کی خاطر بھرپور حصہ لیا اور پوری تہذیبی، لگن اور خلوص نیت سے اسلام کی خدمت فرمائی۔

تحریک پاکستان کے دوران آپ نے دو قومی نظریہ کی حمایت میں ایک جامع فتویٰ مرتب فرما کر اسے شائع کیا، جس سے کانگرس نواز علماء بڑے سیخ پا ہوئے اور پورے ہندوستان میں کھلبلی مچ گئی۔ ہندو اور کانگرسی علماء نے شدید مخالفت کی مگر آپ نے سینہ سپر ہو کر ان کا مقابلہ کیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے دو قومی نظریے کی تائید میں آپ کے ٹھوس دلائل سنے تو سر تسلیم خم کیا اور لاہور کی تاریخی مسجد وزیر خاں میں منعقد عظیم الشان جلسہ میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے دو قومی نظریے کی مکمل تائید کا اعلان کیا۔

آپ نے تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ آپ عربی، اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ آپ کا دیوان اردو اور فارسی پختگی کلام پر شاہد ہے۔ آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ تفسیر میزان الادیان

۲۔ مجموعہ رسائل خمسہ

۳۔ بدایۃ الغوی
۴۔ القبۃ الخضریٰ
۵۔ رسول الکلام
۶۔ سلوک قادریہ
۷۔ تحقیق المسائل
۸۔ علامات وہابیہ
۹۔ بدایۃ الطریق
۱۰۔ فضائل رمضان
۱۱۔ المبسوط فی فریضۃ الجمعہ
۱۲۔ فضائل شعبان
۱۳۔ اسلام اور جشن میلاد
۱۴۔ مقدمہ تفسیر میزان الادیان سورۃ فاتحہ
۱۵۔ الاستعانت من اولیاء اللہ
۱۶۔ دیوان دیدار علی (اردو)
۱۷۔ دیوان دیدار علی (فارسی)

شیخ المحدثین حضرت سید دیدار علی شاہ نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو داعی اجل کو اس وقت لبیک کہا جب آپ نماز عصر ادا کر رہے تھے آپ کی آخری آرامگاہ دارلعلوم حزب الاحناف اندرون دہلی دروازہ میں مرجع خاص و عام ہے۔

آپ کے صاحبزادگان علامہ ابوالبرکات اور علامہ ابوالحسنات نے آپ کے مشن کو آگے بڑھایا اور اپنے والد کی طرح ممتاز مقام حاصل کیا۔

دین اسلام کی اشاعت کیلئے آپ نے جو خدمات سرانجام دیں انہیں تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آپ اپنے زہد، تقویٰ، پرہیز گاری، حق گوئی، بے باکی اور تبلیغ اسلام کی خصوصیات کی بدولت مسلمانان عالم کے دلوں میں ہمیشہ پائندہ و تابندہ رہیں گے۔

شیخ الحدیث سید احمد علامہ ابوالبرکات

آپ کا اسم گرامی سید احمد' کنیت ابوالبرکات اور لقب سراج اہل تقویٰ ہے آپ ۱۸۸۶ء میں ریاست الور (بھارت) میں مولانا سید دیدار علی شاہ کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ قوت الاسلام (الور) میں حاصل کی اور پھر اپنے والد سے صرف و نحو' اصول' منطق اور فلسفہ کی کتابیں پڑھیں۔ پھر حضرت مولانا حکیم سید محمد نعیم الدین مراد آبادی کے مدرسہ اہل سنت مراد آباد میں داخلہ لیا اور درس نظامیہ کی آخری موقوف علیہ کتابیں پڑھیں۔ جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں آپ نے حضرت کے زیر تربیت مناظرہ توقیت فلکیات اور فلسفہ میں بھی مہارت حاصل کی۔ فن طب کی کچھ کتابیں بھی حکیم سید محمد نعیم الدین حکیم حاذق سے پڑھیں۔ پھر طب کی باقاعدہ تعلیم و تربیت شفاء الامراض کے مصنف حکیم مولانا نور کریم کے شاگرد سے حاصل کی اور ان کے مطب مراد آباد میں طب کی عملی تربیت بھی حاصل کی۔

جامعہ نعیمیہ مراد آباد سے سند فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے اپنے والد سید دیدار علی شاہ سے دورہ حدیث پڑھا اور حدیث کی خصوصی سند و تمام سلاسل اولیاء کے معمولات و وظائف کی اجازت و خلافت حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں بریلی شریف حاضر ہوئے اور کچھ عرصہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے زیر تربیت رہے۔ آپ دوسرے علماء کے ساتھ فتویٰ نویس پر مامور ہوئے جس کی نگرانی اعلیٰ حضرت خود فرماتے تھے' فتویٰ رضویہ کی جلد اول اور بہار شریعت کے پہلے حصے آپ کی نگرانی میں طبع ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے تمام علوم عالیہ اسلامیہ قرآن و حدیث و فقہ کی خصوصی سند اپنے دست خاص سے لکھ کر عنایت فرمائی۔

۱۹۲۰ء کے آغاز میں جب حضرت سید دیدار علی شاہ مستقل سکونت کے ارادہ سے لاہور تشریف لائے تو آپ کی جگہ حضرت ابوالبرکات جامع مسجد آگرہ کے خطیب و مفتی مقرر ہوئے۔ یہ دور بڑا پر آشوب تھا۔ نت نئے فتنے جنم لے رہے تھے۔ حضرت ابوالبرکات نے دوران خطابت آگرہ درس و تدریس، وعظ و نصیحت کے سلسلے کو بحسن و خوبی انجام دیا اور مسلک اہل سنت والجماعت کی تبلیغ و اشاعت کیلئے کوشاں رہے۔

۱۹۳۳ء میں جامع مسجد مزار حضرت داتا گنج بخش کی خطابت کیلئے آپ لاہور تشریف لائے۔ اسی دوران میں دارالعلوم حزب الاحناف کی ابتدا ہوئی تو مولانا ابوالبرکات کو اس مدرسے میں مدرس مقرر کیا گیا۔ آپ کے علم و فضل کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور دوسرے شہروں سے طالبان علوم دینیہ لاہور پہنچنے لگے اور آپ کے علم و فضل سے استفادہ کرنے لگے۔

۱۹۳۶ء میں آپ نے لوکو ورکشاپ لاہور کی مسجد میں جمعہ پڑھانا شروع کیا اور ۵۲ سال تک مسلسل یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

تحریک پاکستان کی حمایت و نصرت کا مرحلہ آیا تو آپ نے دو قومی نظریہ اور قرارداد پاکستان کی بھرپور حمایت کی۔ کانگرسی علماء کی تردید اور نظریہ پاکستان کی تائید کیلئے اپنے دارالعلوم کے سالانہ جلسوں کو وقف کر دیا۔ ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء آل انڈیا سنی کانفرنس کا بمقام شاہی باغ فاطمان بنارس میں انعقاد ہوا اور پاکستان کی حمایت میں پرزور قرارداد منظور کی گئی اس قرارداد پر مولانا ابوالبرکات کے علاوہ تقریباً دو ہزار علماء اور مشائخ نے دستخط کئے۔ قیام پاکستان کے بعد نظام مصطفیٰ کے قیام و نفاذ اور اہل سنت کی تعمیر و تنظیم کیلئے ہر ممکن سعی فرمائی۔

۱۹۴۹ء میں جب پہلی دستور ساز اسمبلی قائم ہوئی تو آپ نے قرارداد مقاصد کی ترتیب میں حصہ لیا اور پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ و قیام کیلئے ہر ممکن کوشش کی۔ مولانا ابوالبرکات نے اپنی تدریسی و تبلیغی مصروفیات کے باوجود ہر سیاسی و دینی تحریک کا جائزہ لیا اور اپنا دینی و ملی فرض کماحقہ ادا فرمایا۔ قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد جس قدر تحریکیں اٹھیں۔ آپ نے ان میں اپنا کردار ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ تحریک خلافت، شدھی،

ترک موالات، ہندو مسلم اتحاد، مسجد شہید گنج، خاکسار تحریک، احرار کشمکش، مجلس اتحاد، تحریک آزادی ہند اور تحریک پاکستان وغیرہ جس قدر تحریکیں اٹھیں آپ نے بلا خوف شریعت اسلامیہ کی رو سے جو بات حق ثابت ہوئی اس سے عوام کو آگاہ کیا۔

شریعت کی پابندی اور سنت رسولؐ کی پیروی ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ ہر بات اور ہر کام میں احکام شریعت کا خیال رکھتے تھے۔ ان کی پوری زندگی سنت رسولؐ کی تصویر تھی۔

آپ کی موجود تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ فتح مبین
۲۔ دبوس المقلدین
۳۔ ترجمہ تمہید ابو شکور سلمی
۴۔ مناظرہ تلون
۵۔ ضیاء القنادیل
۶۔ مناظرہ ترن تارن
۷۔ اثبات قبہ جات
۸۔ القول الصواب

آپ کے وہ فتوے جو ضبط تحریر میں آکر رجسٹر میں درج ہو سکے وہ بھی متعدد جلدوں میں محفوظ ہیں اور ہر جلد تقریباً" سو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

آپ نے ۱۹۷۸ء میں وفات پائی اور مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف گنج بخش روڈ نزد مزار حضرت داتا گنج بخش کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔

حضرت ابوالبرکات کا شمار ان معدودے چند علماء کرام میں ہوتا ہے جن کی علمی فضلیت، تقویٰ و طہارت اور عظمت کردار کو اپنے پرائے سب قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ آسمان علم و حکمت کے مہر درخشاں تھے جس کی ضیاء پاشیوں سے ہزاروں طالبان رشد و ہدایت فیض یاب ہوئے۔ آپ اپنے ان اوصاف حمیدہ کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

بیگم جہاں آراء شاہنواز

بیگم شاہنواز ۷ اپریل ۱۸۹۷ء کو باغبانپورہ لاہور میں پیدا ہوئیں ان کا بچپن باغبانپورہ میں گزرا۔ شالا مار باغ مغلوں کے دور سے ان کے خاندان کی نگرانی میں رہا۔ بچپن میں وہ شالا مار میں کھیلا کرتی تھیں اس باغ سے ان کے دل پر مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا نقش رقم ہوا اور ان سے ننھے سے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کا شاندار ماضی لوٹ آئے۔

جہاں آراء کے والد میاں محمد شفیع بڑے روشن خیال تھے انہوں نے جہاں آراء کی ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل کروانے کے بعد انہیں کوئین میری کالج میں داخل کروا دیا۔ جہاں آراء کے علمی و ادبی جوہر کوئین میری کالج میں کھلے۔ تحریر و تقریر میں وہ یگانہ تھیں۔

جہاں آراء کے مضامین "تہذیب نسواں" اور "شریف بی بی" جو خواتین کے مقتدر رسائل تھے میں چھپنے شروع ہوئے۔ "تہذیب نسواں" کو سید امتیاز علی تاج کے والد مولوی ممتاز علی اور ان کی شریک حیات محمدی بیگم مرتب کیا کرتی تھیں۔ ۱۹۱۴ء میں ان کی شادی سرشاہنواز بارایٹ لاء سے ہوئی۔ وہ اقبال کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ شاہنواز نے سیاست میں بھی حصہ لیا اور وہ مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی رہے اور قائداعظم کے ساتھ بھی کام کیا۔

جہاں آرا کی ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شادی کے بعد بھی جاری رہا۔ شادی کے بعد انہوں نے "حسن آرا بیگم" کتاب لکھی جو نذیر احمد دہلوی کے ناولوں کے طرز پر تھی۔ ان کی اس کاوش کو ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔

جہاں آرا شاہنواز کو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی ملکہ حاصل تھا۔ ان کا انگریزی زبان کا شاہکار (Father and Daughter) "باپ اور بیٹی" میں انہوں نے بڑے دل نواز انداز میں اپنے نامور والد میاں محمد شفیع اور اپنے حالات قلم بند کئے ہیں۔ سیاست میں ان کا پہلا قدم ۱۹۱۷ء میں مسلم لیڈیز کانفرنس کے سالانہ اجلاس لاہور میں شرکت تھا۔ اس جلسے میں انہوں نے رسوم کی اصلاح پر تقریر کر کے حاضرین جلسہ کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ اس کے بعد سیاسی سفر مسلسل جاری رہا۔ وہ خواتین کے حقوق کے داعی تھیں انہوں نے خواتین کے سیاسی حقوق کے لیے مسلسل سعی کی۔

۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے آئینی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے لندن میں اولین گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ ان اجتماعات میں انگلستان اور ہندوستان کے قابل ترین نمائندے موجود تھے۔ بیگم شاہنواز نے خواتین کی نمائندگی کی۔ انہیں اس کانفرنس کے بہترین مندوبین میں شمار کیا گیا۔ ان کی شاندار کارکردگی کی بناء پر انہیں دوسری اور تیسری کانفرنس میں مسلسل نمائندگی کا منفرد انداز حاصل ہوا۔

۱۹۳۰ء میں مجلس اقوام کی عورتوں اور بچوں کی کمیٹی میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ ۱۹۳۷ء میں پنجاب اسمبلی میں لاہور سے خواتین کی نمائندہ منتخب ہوئیں۔ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی خواتین کمیٹی کی رکن منتخب ہوئیں۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں شرکت فرمائی۔

بیگم شاہنواز کے شب و روز مسلم لیگ کی خدمت کے لیے وقف تھے۔ ۱۹۴۶ء میں صوبائی انتخابات میں انہوں نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۶ء ہی میں قائداعظم نے امریکہ میں تحریک پاکستان کی نشرواشاعت کے لیے ایک وفد کا انتخاب کیا۔ اس وفد کے لیے بیگم شاہنواز اور مرزا ابوالحسن اصفہانی منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی مجلس دستور ساز کی رکن منتخب ہوئیں۔

بیگم شاہنواز نے دن رات مسلم لیگ اور خواتین کی خدمت کی اور

اس سلسلے میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ مگر اپنے پایہ استقلال اور فہم و فراست کی بدولت اس ممتاز خاتون نے اہم مقام حاصل کیا۔ آپ نے ۲۷ نومبر ۱۹۷۹ء کو وفات پائی۔ آپ کو میاں فیملی قبرستان باغبانپورہ میں دفن کیا گیا آپ کی قبر کے ساتھ آپ کے شوہر سر شاہنواز کی قبر ہے۔

چوہدری افضل حق مفکر احرار

چوہدری افضل حق ہوشیار پور میں مسلم رامپور خاندان میں چوہدری امیر خاں کے گھر ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز امرتسر سے کیا اور ۱۹۰۱ء میں امرتسر ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ آپ کے ہم جماعتوں میں عبدالمجید سالک غلام رسول مہر اور شیخ نصیرالدین ہمایوں شامل تھے۔ ۱۹۱۲ء میں ایف۔ اے کے امتحان میں فیل ہو گئے اور یہی واقعہ آپ کی تعلیمی کمی کا باعث ہوا اور مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔

۱۹۱۷ء میں ملازمت کا آغاز بطور سب انسپکٹر پولیس کیا۔ بڑے بھائی کی موت اور جذبہ حب الوطنی کے سبب انگریز سرکار کی اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور شیخ نصیرالدین ہمایوں (قومی کتب خانہ لاہور والے کے ساتھ مل کر سودیش کلاتھ سٹور قائم کیا اور کچھ عرصہ تک یہ کاروبار کرتے رہے۔)

آپ نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز گڑھ شنکر سے کیا۔ آپ نے حکومت انگریز کی بھرپور مخالفت کی اور اس کی پاداش میں متعدد مرتبہ گرفتار ہوئے۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے مشاہیر علماء کے ساتھ مل کر مجلس احرار اسلام کے نام سے سیاسی جماعت کی بنیاد رکھی آپ اس تنظیم کے مرکزی رہنما تھے۔ آپ کی زندگی کا مقصد احیائے اسلام اور مسلمانوں میں مذہبی شعور کے ساتھ ساتھ سیاسی آگہی پیدا کرنا تھے۔ آپ تمام عمر اس مشن پر قائم رہے اور اسلام دوستی و انسان دوستی کا زریں باب رقم کیا جس نے آپ کو حیات جاوداں بخشی۔ آپ گوناگوں امتیازات و خصائص کے حامل تھے۔ فطرتاً" فہم سلیم اور قلب صمیم لیکر آئے تھے۔ آپ کا مزاج قدرتی طور پر ادب و انشاء کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش کے خلاف بہت بڑا احتجاج تھے

اور آپ نے اپنے ان جذبات کا اظہار بھرپور نوک قلم سے کیا ہے اور ان کے افکار و نظریات کی ترجمان ان کی تصانیف آج بھی ان کے مذہبی و ملی اخلاص کا منہ بولتا ثبوت ہیں اپ کے قلم سے درج ذیل تصانیف نے جنم لیا۔

(۱) دنیا میں دوزخ (۲) فتنہ ارتداد (۳) معشوقہ پنجاب (۴) زندگی (۵) جواہرات (افسانے) (۶) شعور (۷) دیباتی رومان (۸) محبوب خدا (نثریہ نعت) (۹) دین اسلام (۱۰) آزادی ہند (طویل افسانہ) (۱۱) پاکستان اور چھوت چھات (۱۲) تاریخ احرار (۱۳) میرا افسانہ (خود نوشت) (۱۵) خطوط افضل حق

یوں تو ان کی تمام تصانیف بہ اعتبار موضوع ، انشاء تمام فنی لوازم کو پورا کرتی ہیں اور مصنف کی فکر و نظر کا بھرپور ترجمان ہیں لیکن ان میں سے دو تصانیف خصوصی اہمیت کی حامل ہیں ان میں سے پہلی تصنیف "میرا افسانہ" ہے جو کہ ان کی خود نوشت ہے یہ کتاب نہ صرف چوہدری افضل حق کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے بلکہ اپنے دور کی تاریخ کی بھرپور عکاس ہے۔ دوسری تصنیف "زندگی" ہے یہ ان کی معرکتہ الاراء کتاب ہے۔ یہ کتاب زندگی کے تمام شعبوں پر روشنی ڈالتی ہے اور انسانی معراج و تنزل کی صحیح کہانی ہے۔ انسان کو بہترین زندگی گزارنے والے اصول سکھانے والی رہنما ہے۔ اس میں انسانی زندگی کا عملی پہلو نہایت نمایاں طور پر معہ نتیجہ دکھایا گیا ہے یہ کتاب آپ کے مطالعے علمی جامعیت و تبحر کا نچوڑ ہے۔

اس تصنیف کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ "میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کے گوناگوں تجربوں کی بناء پر آنے والی نسلوں کیلئے میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اسے "زندگی" میں کہہ دیا ہے"

اس زعم ملت، مفکر احرار، صاحب طرز ادیب، منفرد افسانہ نگار، شعلہ نوا مقرر، دل رباتکلم، دیانت دار مورخ، باشعور تجزیہ نگار، انقلابی قائد، غریب پرور شخصیت نے ۸ جنوری ۱۹۴۲ء کو اس جہان فانی سے کوچ فرمایا اور قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے۔ آپ کی قبر لٹن روڈ پر قرطبہ چوک سے جین مندر جاتے ہوئے جنازگاہ سے چند قدم پہلے واقع پٹرول پمپ کے ساتھ موجود ہے۔

سر سکندر حیات خاں

سکندر حیات خاں ۵ جون ۱۸۹۲ء کو ملتان میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد محمد حیات خاں ڈویژنل جج تھے۔ ان کی والدہ ریاست کپور تھلہ کے وزیر اعظم میاں غلام جیلانی کی صاحبزادی تھیں۔ تین سال کی عمر تھی کہ والدہ وفات پا گئیں۔ اس کے بعد ان کی بڑی بھاوج صاحبہ نے ان کی پرورش کی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ سکندر حیات اپنی خداداد ذہانت، فہم و فراست اور قوت حافظ کی بدولت امتحانات میں اول رہتے۔ ہاکی اور کرکٹ خوب کھیلتے۔ کرکٹ میں وکٹ کیپر اور ہاکی ٹیم کے کپتان رہے۔

۱۹۰۸ء میں میٹرک کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیئے گئے۔ مگر تعلیم ادھوری رہ گئی۔ دوبارہ ۱۹۱۰ء میں پھر بیرسٹری کے لیے عازم انگلستان ہوئے لیکن پھر واپس آنا پڑا اور خاندانی معاملات میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں اپنی خدمات جنگ کے لیے پیش کر دیں اور پنجاب رجمنٹ کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ جنگ کے بعد اپنی تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور بیک وقت نو دس کمپنیوں کے ڈائریکٹر یا مینجنگ ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتے رہے۔ واہ کی سیمنٹ فیکٹری بھی قائم کی۔ اس دوران ضلع اٹک کے دسٹرکٹ بورڈ کے وائس چیئرمین اور حسن ابدال کی ٹاؤن کمیٹی کے غیر سرکاری صدر بنائے گئے۔ ۱۹۲۱ء میں اپنے ضلع کی طرف سے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۶ء میں پولیس انکوائری کمیٹی کے غیر سرکاری ممبر قرار پائے اور ایک عمدہ اصلاحی رپورٹ اور لائحہ عمل کی تجویز میں مدد دی۔ اس کے بعد سر سکندر کو پنجاب ریفارمز کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں سر سکندر دو تین ماہ کے لیے پنجاب میں ریونیو ممبر بھی بنائے گئے۔ اس سے قبل کچھ عرصہ کے

لئے ریاست بہاول پور کے وزیر اعظم بھی رہے۔ صوبہ پنجاب کی ریونیو ممبری کا دور ایک پر آشوب اور مشکل دور تھا۔ سیاسی ہیجان کے علاوہ نرخوں کی عدیم المثال ارزانی نے زراعت پیشہ آبادی کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ صوبے کے زمیندار تباہ حال اور تنگدست ہو گئے تھے اور محاصل گھٹ گئے تھے۔ انہوں نے سختی کے ہاتھ سے سیاسی شورشوں کو دبایا اور نرمی کے ہاتھ سے زمینداران پنجاب کا مالی بوجھ ہلکا کیا۔ ساتھ میں سرکاری محکموں کے مصارف میں تخفیف کا ایسا کلہاڑا چلایا کہ حکومت کی مالی پریشانیاں بہت کچھ دور ہو گئیں۔

انہیں چھوٹے زمینداروں کے مفاد سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں کو بڑے زمینداروں اور ساہوکاروں کی بیجا حرص اور ریشہ دوانیوں سے بچائیں۔ چنانچہ ایک طرف تو آبیانے اور مالیہ کی معافیوں سے زمینداروں کو فائدہ پہنچایا اور دوسری طرف قانون امداد مقروضین پنجاب منظور کرا کے زمینداروں کے قرضہ کا بوجھ کم کیا۔ اس کے علاوہ صوبے میں مصالحتی بورڈ بھی قائم کر دیئے جن کا مقصد یہ تھا کہ قرض خواہ اور مقروض کے درمیان صلح و صفائی سے قرضے چکا دیئے جائیں۔

۱۹ جولائی سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء تک سرسکندر صوبہ پنجاب کے قائم مقام گورنر بھی رہے اس کے بعد ۱۵ فروری سے ۹ جون ۱۹۳۴ء تک پھر قائم مقام گورنر کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۳۳ء میں انہیں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۵ء میں پنجاب کی ریونیو ممبری چھوڑ کر قائم شدہ ریزرو بینک آف انڈیا میں ڈپٹی گورنر نامزد ہوئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد سر فضل حسین کی وفات کے بعد پنجاب کی وزارت عظمی کے فرائض سنبھالنے پڑے۔ سرسکندر حیات سیاسی رہنما بننے کے چنداں آرزو مند نہ تھے۔ لیکن پنجاب سے انہیں والہانہ محبت تھی اور ان کے نزدیک پنجاب کے مفاد ایک متبرک وقف کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں سر فضل حسین کی رحلت کے بعد پنجاب کونسل میں یونینسٹ پارٹی کی قیادت سنبھالی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے ان کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ سرسکندر حیات تمام جماعتوں اور

قوموں کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے اور اس میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آل انڈیا معاملات میں مسلم لیگ کی رہنمائی قبول کی۔ ان کے اس اقدام کو سکندر جناح پیکٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس پیکٹ کے مطابق سر سکندر نے پنجاب میں اپنی پارٹی کے مسلم ارکان کو مشورہ دیا کہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں اور اس حیثیت میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی و صوبائی بورڈ کے قواعد و ضوابط کے پابند ہوں گے۔ ان ممبران کو یہ اختیار ہو گا کہ کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مل کر کوئی مشترکہ وزارت قائم کرلیں یا کسی وزارت کے ساتھ متحد ہو جائیں بشرطیکہ لیگ کے بنیادی اصول و حکمت عملی اور لائحہ عمل کو کوئی ضعف نہ پہنچے۔

سر سکندر چھ برس تک پنجاب کے وزیراعلیٰ رہے۔ اس مدت میں انہوں نے آبپاشی، رسل و رسائل کی سہولتیں بڑھائیں، ابتدائی تعلیم لازم کی، سڑکیں بنوائیں، پنچائتوں کو تقویت دی۔ انسداد رشوت ستانی کا محکمہ قائم کیا۔ ۱۹۳۸ء میں تاج کمپنی لیمٹڈ کے حصص خرید کر کے کمپنی کی شہرت و مالی استحکام کے باعث بنے۔

سر سکندر کی پہلی شادی ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ اس سے تین بچے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہوئے۔ چھوٹی لڑکی ایک سال کی تھی کہ بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں دوسرا نکاح اپنی سالی یعنی بچوں کی خالہ سے کیا۔ اس شادی سے ایک لڑکا ہوا اور دوسری بیوی بھی وفات پا گئیں۔ تیسری شادی ستمبر ۱۹۲۳ء میں ہوئی جس سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ اپنی ذاتی زندگی میں سر سکندر صوم و صلوۃ کے پابند تھے۔ انتہائی طاعت گزار اور تہجد گذار تھے۔ اکثر اہم فیصلے نماز فجر کے وقت کیا کرتے۔ طبیعت میں نرمی اور ہمدردی بہت تھی۔ ماتحتوں کو نہ جھڑکتے نہ درشت کلامی سے پیش آتے۔ ان کی سب سے اعلیٰ صفت ان کا لامتناہی صبر و تحمل تھا جس سے وہ مخالف کو بھی نرم کر لیا کرتے تھے۔ دشمن کو دوست بنانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان کی صورت میں شان امارت ضرور جلوہ گر تھی لیکن مزاج میں عجز و انکساری تھی اور ادنی اشخاص سے ملنے جلنے میں

کبھی تامل نہیں ہوا۔ خوش پوشاک اور خوش وضع تھے۔ بے حد آزاد خیال اور فراخ دل سیاست دان تھے۔ اپنی سیاسی زندگی میں اپنی کوئی ذاتی غرض و مفاد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

۲۳ دسمبر سے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۲ء تک اپنی دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی شادی سے فراغت کے بعد ۲۶ دسمبر کو اپنی کوٹھی پر ایک گارڈن پارٹی دی۔ اس ضیافت سے فارغ ہو کر اور رات کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں جا لیٹے اور سوتے میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔ اگلے دن جنازے میں ہر مذہب اور ملت کے لوگ شامل تھے۔ جنازہ مال روڈ سے ہوتا ہوا بھاٹی دروازے کے باہر سرکلر روڈ کو طے کرتا ہوا شاہی مسجد کے سامنے پہنچا اور شاہی مسجد کے باہر علامہ اقبال کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔

سرسکندر حیات کا سب سے اہم کارنامہ بادشاہی مسجد کی مرمت و تزئین کا کام ہے۔ سکھوں کے دور میں یہ مسجد بری طرح برباد ہوئی اور تمام بیش قیمت پتھر اور نگینے لوٹ لئے گئے صحن کے فرش کی سلیں اکھڑ گئیں۔ ۱۸۵۶ء میں یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کی گئی اور کچھ عرصہ کے بعد انجمن حمایت اسلام کے سپرد ہوئی اور مرمت کا کام آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔ سرسکندر کے زمانے میں بڑے پیمانے پر فنڈ مہیا کئے گئے اور وسیع پیمانے پر مرمت کا کام جاری ہوا ان کا یہ کارنامہ تادیر یاد رکھا جائے گا۔

علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی

علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی خاکسار تحریک کے بانی، ممتاز عالم دین، مصنف، سکالر اور دانشور تھے۔ وہ ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خاں عطا محمد امرتسر کے رئیس اور صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ ذوق، غالب، سرسید احمد خاں، جمال الدین افغانی اور نواب لوہارو سے ان کے تعلقات تھے۔ علامہ مشرقی کو ابتدا ہی سے علمی ماحول میسر آیا۔ انٹرمیڈیٹ تک تعلیم امرتسر ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد لاہور آئے اور ۱۹۰۴ء میں ایف۔ سی کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

ان کے پروفیسر ایس این داس نے کہا:

"میں نے ریاضی میں ان سے ماہر اور زیرک طالب علم نہیں دیکھا۔"

انہوں نے ۱۸ برس کی عمر میں پنجاب یونیورسٹی سے ریاضی کا امتحان بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور صوبے بھر میں اول آئے۔ اس قابل رشک کامیابی نے ان کی غیر معمولی ذہانت کی دھاک پورے ملک میں بٹھا دی۔ انہیں کئی اعلیٰ عہدوں کی پیش کش ہوئی لیکن تحصیل علم کے شوق میں انگلستان روانہ ہو گئے۔ ۱۹۰۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج میں داخلہ لیا اور پہلے ہی سال میں ایک مقابلے کے امتحان میں اول آکر ستر پونڈ وظیفہ اور "فاؤنڈیشن سکالر" کا اعزاز حاصل کیا۔

علامہ عنایت اللہ المشرقی نے ۱۹۰۹ء میں ریاضی کا امتحان ٹرائی پوس (آنرز) تین سال کے بجائے دو سال میں پاس کیا اور اس امتحان میں بھی اول رہے اور "رینگلر" کا خطاب حاصل کیا۔ اس وقت "رینگلر" کا خطاب

حاصل کرنے والوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں تھی۔ کیمبرج یونیورسٹی نے انہیں اس کامیابی پر ایک اور وظیفہ دیا اور "بیجلر سکالر" کہلائے۔ دو سال بعد ٹرائی پوس (آنرز) کے دو اوز امتحان پاس کئے۔ اس کے بعد پی ایل او (السنہ شرقیہ) کا ٹرائی پوس درجہ اول میں اور علم طبیعات کی ڈگری آنرز کے ساتھ حاصل کی اور کالج میں اول رہے۔ ۱۹۱۲ء میں میکنیکل سائنس ٹرائی پوس (انجینئرنگ) میں بھی امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

انگلستان کے متعدد اخبارات نے علامہ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور ان کے حالات زندگی شائع کئے۔ ان اخبارات میں ڈیلی مرر، ڈیلی کرانیکل، ویسٹ منسٹر گزٹ اور کیمبرج ڈیلی نیوز شامل تھے۔ انگلستان میں قیام کے دوران بلند پایہ جرائد کے سیاسی نامہ نگار بھی رہے۔ ۱۹۱۲ء میں واپس آئے تو ایک ریاست کے مہاراجہ نے انہیں وزارت کی پیش کش کی۔ لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا البتہ گورنر صوبہ سرحد سرجان روس کیپل کی تحریک پر اسلامیہ کالج پشاور کا وائس پرنسپل بننا قبول کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس طرح اسلام کی خدمت کر سکیں گے۔ ۱۹۱۶ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ بعدازاں ایک سال تک پرنسپل کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیئے۔

۱۹۱۲ء میں حکومت ہند نے علامہ مشرقی کو انڈیا ایجوکیشنل سروس میں لے لیا اور ان کی تقرری مرکزی حکومت میں انڈر سیکرٹری کی حیثیت سے عمل میں آئی۔ ۱۹۲۰ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ انڈین ایجوکیشنل سروس میں ایک ہزار روپے ماہانہ پر مستقل عہدہ دے کر پشاور بھیجا گیا۔ اس سے قبل کسی ہندوستانی کو یہ منصب نہیں ملا تھا۔ اس حیثیت میں پرنسپل ٹریننگ کالج، پرنسپل گورنمنٹ ہائی سکول، انسپکٹر آف ہائی سکولز اور رجسٹرار وغیرہ کے عہدوں پر کام کرتے رہے۔ علامہ مشرقی نے صوبہ سرحد کے سرکاری تعلیمی اداروں میں حکومت کی مخالفت کے باوجود قرآنی تعلیم کا اجراء کیا۔

۱۹۲۴ء میں تحریک خلافت اور کانگریس کی تحریک ترک موالات کا انجام دیکھ کر اپنی شہرہ آفاق کتاب "تذکرہ" لکھی۔ جس کے ذریعے مسلمانوں کو

جھنجھوڑنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۱ء تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے اور عملی و سیاسی موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ ۱۹۳۲ء میں سرکاری ملازمت ترک کر کے خاکسار تحریک کی بنیاد رکھی۔ یہ نیم سیاسی اور نیم عسکری تنظیم پورے برصغیر میں بہت جلد مقبول ہو گئی۔ علامہ مشرقی اپنی زندگی میں آٹھ مرتبہ گرفتار ہوئے اور مجموعی طور پر دس سال قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

علامہ مشرقی اپنے علم و فضل کے لحاظ سے مسلمان رہنماؤں میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔ تاہم ان کی وجہ شہرت ان کی قائم کی ہوئی تنظیم خاکسار تحریک تھی۔ خاکسار تحریک کے ذریعے علامہ مشرقی نے تعلیم یافتہ نوجوانوں سمیت زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو ایک زمانے میں بہت متاثر کیا۔ سادگی، نظم و ضبط اور اپنے رہنماؤں کی فرمان برداری تمام خاکساروں کی اہم خصوصیت رہی۔ علامہ مشرقی کی تحریک سیاسی لحاظ سے چنداں کامیاب نہ رہی مگر استقامت، قربانی اور انگریز دشمنی کے جذبے کے تحت خاکساروں نے بے سروسامانی کے باوجود ایک مرحلے میں انگریزوں سے ٹکر لینے سے گریز نہ کیا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں خاکساروں نے جس بے جگری کے ساتھ انگریز حکومت کی وحشیانہ فائرنگ کا مقابلہ کیا اور اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کیا وہ ہماری ملی تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہے۔

علامہ عنایت اللہ مشرقی بلند پایہ دانشور اور رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز ادیب بھی تھے آپ کی مشہور و معروف تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ تذکرہ

یہ علامہ مشرقی کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مسلمانون کو احیائے اسلام کا پیغام دیا ہے۔ مسلمانوں کے انحطاط پذیر ہونے کی وجوہات بتائی ہیں۔

مسلمانوں کو بتایا ہے کہ جب تک وہ صحیح اسلام پر قائم رہے خدا نے ان سے کئے گئے وعدے پورے فرمائے ہیں۔

یہ کتاب چھ جلدوں پر مشتمل ہے اس کی پہلی جلد ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی اور بقیہ جلدیں علامہ مشرقی کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔

۲۔ اشارات

اس کتاب میں مکالماتی انداز اختیار کیا گیا ہے جو کہ "ہمدرد" اور مصنف کے درمیان سوال و جواب کی صورت میں ہے۔

خطاب مصر

یہ مصر میں شیخ الاسلام قاہرہ کی جانب سے خلافت کے مسئلہ پر مشاورت کیلئے عالم اسلام کی موتمر میں عربی زبان میں کیا گیا خطاب ہے جسے بعدازاں اردو ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا اس کا ترجمہ علامہ مشرقی نے خود کیا۔

۴۔ قول فیصل

یہ علامہ مشرقی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو ہفت روزہ میں شائع ہوتے رہے۔ اس میں خاکسار تحریک کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ مقالات

یہ مختلف موضوعات پر لکھے گئے علامہ مشرق کے مقالات کا مجموعہ ہے ان سب کا مرکزی خیال مسلمان قوم کی اصلاح اور مولوی کے پیش کردہ اسلام کے بے عمل تخیل کے خلاف جہاد ہے۔ یہ مقالات دو جلدوں پر مشتمل ہیں۔

۶۔ حدیث القرآن

یہ قرآن کے علمی مباحث پر مشتمل تصنیف ہے۔ مصنف نے اس میں قرآن کی روشنی میں انسان اور کائنات کے رشتے کی وضاحت اور اس کائنات میں انسان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

۷۔ تکملہ

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں نبی کریمؐ کی خانگی زندگی کو بیان کیا گیا ہے اور قرآن مجید کے نزول کے بعد از تحقیق جدول پیش کیا گیا ہے۔

۸۔ خریطہ

(فارسی شاعری) اس میں زیادہ تر فارسی رباعیات اور چند غزلیں شامل ہیں۔

۹۔ حریم غیب۔ دھ الباب۔ ارمغان حکیم

ان شعری تصانیف میں علامہ مشرقی نے نثر کی طرح غلبہ اسلام کا پیغام مسلمانوں تک پہچانے کی سعی کی ہے اور اسلام کی بہترین خدمت کی ہے۔

یہ عظیم قائد، علم کا سمندر، مصنف، دانشور، سکالر اور تحریک آزادی کا ممتاز رہنما ۲۷ اگست ۱۹۶۳ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ آپ کی قبر ذیلدار روڈ اچھرہ میں واقع ہے۔

maablib.org

ابوالنجم ملک ایاز غزنوی لاہوری

ایاز، سلطان غزنوی کا مشہور غلام تھا۔ وہ پنجاب کا پہلا مسلمان گورنر بیان کیا جاتا ہے۔ اسے بچپن میں ترکستان سے غزنی لا کر فروخت کیا گیا۔ اس کے فروخت ہونے کا واقعہ کچھ اس طرح سے ہے کہ ترکستان کے تاجر ۱۲۰ غلاموں کو لیکر غزنی میں سلطان محمود کے دربار میں حاضر ہوئے۔ امرائے شاہی نے ان غلاموں میں سے ۱۱۹ کو خرید لیا مگر ایک کم عمر، نحیف و نزار غلام کو خریدنے سے انکار کر دیا اس پر یہ غلام زار و قطار رونے لگا۔ اس بات کی اطلاع سلطان محمود کو ہوئی تو اس کو دلی رنج ہوا اور تاجروں سے اس غلام کو بھی خرید لیا اور کہا کہ میں اس کمزور غلام کو اللہ کی رضا کیلئے خرید تا ہوں۔ یہ غلام ایاز تھا جسے آگے چل کر وہ مرتبہ حاصل ہوا کہ سلطان محمود غزنوی نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر اسے زمرہ امراء میں شامل کر لیا۔

ایاز کا سن پیدائش کم و بیش ۳۷۳ھ۔ ۹۸۳ء ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے اسے خریدنے کے بعد اعلیٰ تعلیم و تربیت دی اور فن سپہ گری سے بہرہ ور کیا۔ بعد میں ایاز سلطان محمود کے محافظ دستہ کا نگران مقرر ہوا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کا خاص معتمد تھا اور بعد ازاں سلطان محمود کی ہمشیرہ سے شادی کر لی۔ اس طرح وہ سلطان کا نسبتی بھائی بن گیا۔ سلطان نے اسے ابوالنجم اور امیرالملک جیسے معزز خطابات سے نوازا اور ہندوستان میں بارہ ہزار فرسنگ کی جاگیر عطا کی۔ محمود غزنوی کی نظروں میں اس قدر اعلیٰ مقام حاصل کرنا ایاز کی ذہنی استعداد اور قابلیت کا واضح ثبوت ہے کیونکہ سلطان محمود غزنوی کوئی معمولی حکمران نہ تھا۔ اس کے رعب و دبدبے اور ہیبت شاہی سے سلاطین زمانہ

لرزہ براندام تھے۔ اس کی سلطنت منگولیا کے کناروں سے لیکر عراق تک پھیلی ہوئی تھی جب اس نے ہندوستان کا رخ کیا تو قنوج اور سومنات جیسے ناقابل تسخیر علاقوں کی خاک اڑا دی۔ اس اولوالعزم اور بہادر سلطان کے غلام ایاز نے اپنی اعلیٰ استعداد' بے مثل وفاداری اور خداداد خوبیوں کے باعث ہی سلطان کے دل میں اپنا گھر بنایا تھا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے ایاز کوئی ایسا انسان نہ تھا کہ سلطان اسے اپنے دل میں جگہ دیتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے جس حسن سیرت' اعلیٰ دماغ سے نوازا تھا ان کے باعث وہ واقعی غیر معمولی تھا۔

سلطان محمود غزنوی نے جب لاہور پر یلغار کی تو لاہور کا راجہ انگ پال تھوڑے سے مقابلے کے بعد ہند کی طرف بھاگ گیا۔ اس یورش کی بدولت تمام رعایا لاہور سے نکل گئی اور کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ اس وقت ایاز نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا اور دور دور سے رعایا کو طلب کر کے اس شہر میں قیام پذیر کیا۔ اس لحاظ سے اسے لاہور کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مسعود' ایاز کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ مسعود نے اپنے بیٹے مجدود کو امارت ہند پر مامور کیا تو ایاز کو اس کا نائب السلطنت اور اتالیق بنا کر روانہ کیا۔ عملی طور پر ایاز ہی لاہور کا حاکم تھا۔ قاضی اور سپہ سالار اس کے ماتحت تھے۔

ایاز اپنے زمانے کا ایک ذی اقتدار اور بااختیار شخص تھا اور علوم و فنون کا مربی تھا اردو اور فارسی ادب میں ایاز سے محمود کی والہانہ محبت کا عام ذکر ملتا ہے۔

مشہور قصیدہ گو فرخی اور خواجہ فریدالدین عطار (منطق الطیر) نے ایاز کو فارسی میں خراج تحسین پیش کیا اور اردو میں اقبال کا یہ شعر زبان زدعام و خاص ہے جو ایاز کی عظمت اور محمود کی شفقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

مسعود کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مودود تخت نشین ہوا تو مجدود نے

بغاوت کر کے ہندوستان میں الگ سلطنت قائم کرلی۔ ایاز نے مجدود کو سمجھایا مگر وہ نہ مانا چنانچہ مودود فوج لیکر اس پر چڑھ آیا۔ جب لاہور کا محاصرہ ہوا تو بروز عید اچانک مجدود بمرگ مفاجات اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور مودود نے پنجاب پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ مودود نے بہت کوشش کی کہ وہ ایاز کو اپنے ہمراہ غزنی لے جائے اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں سے استفادہ کرے لیکن ایاز نے منظور نہ کیا اور تارک الدنیا ہو کر صحبت فقراء اختیار کرلی اور بزرگوں سے فیض کامل حاصل کیا۔ دولت جو اس کے پاس تھی وہ اس نے راہ خدا میں تقسیم کردی۔

ابوالنجم امیر ایاز کی وفات لاہور میں ماہ ربیع الاول ۴۴۹ھ۔ ۱۰۵۷ء میں ہوئی۔ اس وقت فرخ زار معالی الدولہ غزنی کا بادشاہ تھا اور لاہور کا حاکم ایک غزنوی سردار تھا۔

ایاز ۴۲۷ھ۔ ۱۰۳۵ء میں مجدود کا اتالیق و مشیر بن کر ہندوستان میں آیا تھا۔ اس طرح اس نے ۲۲ برس تک اپنے مربی سلطان محمود غزنوی کے ہندی مقبوضاحت کی حفاظت کی۔ وفات کے وقت ایاز کی عمر ۷۰ برس تھی۔

اس عظیم المرتبت غلام کی آخری آرام گاہ چوک رنگ محل' سوہا بازار میں واقع مسجد ایاز کے احاطے میں موجود ہے جہاں یہ مشہور و معروف غلام زندگی کے پرشور ہنگاموں کے درمیان محو آرام ہے اور اُس کے اردگرد کو کچھ خبر نہیں کہ کیسی جلیل القدر ہستی ان کے درمیان موجود ہے۔ زندگی کی گہما گہمی میں مصروف کوئی بھی شخص اس خزانے کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کرتا۔

maablib.org

غازی علم الدین شہید

غازی علم الدین شہید ۴ دسمبر ۱۹۰۸ء کو محلہ چابک سواراں لاہور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں طالع مند تھا جو نجاری یعنی لکڑی کا کام کرتے تھے غازی علم الدین نے نجاری کا فن اپنے والد سے اور بڑے بھائی میاں محمد الدین سے سیکھا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں کوہاٹ چلے گئے اور والد کے ساتھ بنوں بازار کوہاٹ میں فرنیچر کا کاروبار کرنے لگے۔ غازی علم الدین نے مشہور بدنام زمانہ کتاب "رنگیلا رسول" کے ناشر راج پال کو ٹھکانے لگایا اور تختہ دار پر چڑھ گئے۔ اس واقعہ کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ہندوؤں کی شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کو یاد رکھنا ضروری ہے جو ۱۹۲۰ء کی دہائی میں شروع کی گئی تھیں۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں نے دلازار لٹریچر شائع کرنا شروع کیا۔ مہاشہ کرشن مدیر "پرتاپ" لاہور نے ایک کتاب "رنگیلا رسول" کے نام سے لکھی۔ مصنف نے مسلمانوں کے غم و غصہ سے بچنے کے لیے اپنی بجائے پروفیسر چمپوتی لال ایم اے کا فرضی نام بطور مصنف لکھ دیا۔ تاہم اس کتاب پر راج پال ناشر ہسپتال روڈ لاہور کا نام درست اور واضح لکھا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے اس کتاب کو تلف کرنے کی درخواست کی۔ اس کے انکار پر مسلمانوں نے دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ دائر کیا۔ مجسٹریٹ نے ناشر کو چھ ماہ قید کی سزا دی۔ مگر اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کی جہاں جسٹس دلیپ سنگھ مسیح نے اس کو رہا کر دیا۔

اس سلسلے میں مسلمانوں نے جلسے کیے۔ متعدد جلوس نکالے لیکن حکومت نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے مسلمان لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

فرنگی حکومت کے انصاف سے مایوس ہونے کے بعد مسلمانوں نے اپنی قوت بازو سے کام لینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چنانچہ راج پال کو ٹھکانے لگانے کے لیے سب سے پہلے ایک نوجوان غازی عبدالعزیز کوہاٹ سے لاہور آیا۔ پوچھتا پوچھتا ناشر کی دوکان پر جا پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت راج پال دوکان پر نہیں بیٹھا تھا بلکہ اس کی جگہ پر اس کا ایک دوست جتندر موجود تھا۔ عبدالعزیز نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ انگریزی حکومت نے کچھ قانونی تقاضوں اور مصلحتوں کے پیش نظر عبدالعزیز کو چودہ سال کی سزا دی۔ راج پال اپنے آپ کو ہر وقت خطرے میں محسوس کرتا۔ اس کی درخواست پر دو ہندو سپاہی اور ایک سکھ حوالدار اس کی حفاظت کے لیے متعین کیے گئے۔ راج پال لاہور چھوڑ کر ہردوار، کاشی اور متھرا چلا گیا لیکن دو چار ماہ بعد واپس لاہور آ کر اپنا کاروبار دوبارہ شروع کر دیا۔

چنانچہ غازی علم الدین ۶ اپریل ۱۹۲۹ء کو لاہور آئے اور ایک بجے دوپہر راج پال کی دوکان واقع ہسپتال روڈ انار کلی نزد مزار قطب الدین ایبک پہنچ کر آپ نے راج پال کو للکارا اور کہا "اپنے جرم کی معافی مانگ لو اور دلآزار کتاب کو تلف کر دو اور آئندہ اس قسم کی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔" راج پال اس انتباہ کو گیدڑ بھبکی سمجھ کر خاموش رہا۔ اس پر غازی علم الدین نے ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ اف تک نہ کر سکا۔ اس وقت دوکان میں دو ملازم بھگت رام اور کدار ناتھ بھی موجود تھے۔ کدار ناتھ نے انار کلی پولیس سٹیشن میں قتل کی اطلاع درج کرائی۔ پولیس نے لاش پر قبضہ کر کے کدار ناتھ، بھگت رام اور دیگر گواہوں کے بیانات لئے۔ چونکہ ملزم اقبالی تھا اس لیے مقدمے کی تفتیش اور چالان میں نہ تو کوئی دقت پیش آئی نہ کوئی رکاوٹ ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد شہر میں خاصا خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے ہندو مسلم کشیدگی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ تاہم ہندوؤں نے راج پال کی ارتھی کا بہت بڑا جلوس نکالا اور پورے احترام کے ساتھ رام باغ نزد بادامی باغ نذر آتش کر کے اس کی راکھ کو دریائے راوی میں بہا دیا۔

مقدمہ مسٹر لوئیس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ انہوں نے ملزم پر فرد جرم عائد کر کے اس کا بیان لیا اور بغیر صفائی کے مقدمہ کو سیشن سپرد کر دیا۔ مسٹر نیپ سیشن جج تھے۔ مسٹر سلیم بار ایٹ لا نے غازی علم الدین کے حق میں معقول دلائل پیش کیے مگر عدالت نے دفعہ ۳۰۲ کا فرد جرم عائد کر کے مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو پھانسی کی سزا کا حکم سنایا۔

مسلمانان لاہور نے کئی جلسے کر کے فیصلہ کیا کہ سیشن جج کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل ضرور کی جائے۔ مسٹر محمد علی جناح اس مقدمے کی پیروی کی غرض سے بمبئی سے لاہور آئے ان کی معاونت مسٹر فرخ حسین بیرسٹر نے کی۔ مقتول کی طرف سے جے لال کپور اور دیوان رام لال سرکار کی طرف سے پیش ہوئے۔ مسٹر براڈوے اور مسٹر جان سٹون جج ہائی کورٹ نے اپیل کی سماعت کی۔ ۱۵ جولائی ۱۹۲۹ء کو غازی علم الدین کی اپیل خارج کر دی اور سیشن کورٹ کے فیصلے کو بحال رکھا۔ ہائی کورٹ کا یہ فیصلہ جب غازی علم الدین کو جیل میں سنایا گیا تو انہوں نے مسکرا کر کہا "شکر والحمد للہ۔ میں یہی چاہتا تھا۔ بزدلوں کی طرح قیدی بن کر جیل میں گلنے سڑنے کی بجائے تختہ دار پر چڑھ کر رسول برحق رسالتمآب پر اپنی حقیر جان کو قربان کرنا موجب ہزار ابدی سکون و راحت ہے۔"

مسلمانوں نے ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل لندن میں اپیل کرنے کا فیصلہ کیا اس اپیل کا مسودہ قائداعظم کی نگرانی میں تیار ہوا لیکن پریوی کونسل نے بھی اپیل نامنظور کر دی غازی علم الدین کو جونہی اس فیصلے سے آگاہ کیا گیا انہوں نے حسب سابق خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا۔ صوبے کے امن و امان کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکام وقت نے فیصلہ کیا کہ غازی علم الدین کو فوری طور پر صوبے کی کسی محفوظ اور دور دراز جیل میں منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے میانوالی جیل کو منتخب کیا گیا۔ ۴ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو آپ کو لاہور سے منتقل کر کے میانوالی لے جایا گیا اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو بروز جمعرات آپ کو پھانسی دی گئی۔ مجسٹریٹ نے آپ سے پوچھا "آپ کی آخری خواہش کیا

ہے۔" آپ نے کہا "صرف دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔" اس پر آپ نے دو رکعت نفل پڑھے اور خود سوئے دار بصد شوق چل پڑے۔ انگریز حکومت کا خیال تھا کہ اگر غازی علم الدین کی لاش کو لاہور بھیجا گیا تو یقیناً ہندو اور مسلمان مشتعل ہو کر فساد پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کی پاک میت کو بغیر جنازہ ایک گڑھے میں دبا دیا گیا۔ لیکن مسلمانوں نے ان کی میت لینے کے لیے شدید مطالبہ کیا اور لاہور میں مسلسل جلسے جلوس اور ہڑتالیں ہوتی رہیں۔ ۴ نومبر ۱۹۲۹ء کو مسلمانوں کا ایک وفد گورنر پنجاب سے ملا۔ اس وفد میں سرمیاں محمد شفیع، میاں عبدالعزیز، مولانا ظفر علی خان، سرفضل حسین، خلیفہ شجاع الدین، میاں امیرالدین، سرمحمد اقبال اور مولانا غلام محی الدین قصوری سرفہرست تھے۔ گورنر نے سخت شرائط پر نعش کی واپسی کی اجازت دی۔ مسلمانوں کا ایک وفد سید مراتب علی شاہ اور مرزا مہدی حسن مجسٹریٹ کی قیادت میں ۱۳ نومبر کو میانوالی پہنچا دوسرے دن علی الصبح نعش کو گڑھے سے نکال کر ڈپٹی کمشنر راجہ مہدی زماں خان کے بنگلے پر لایا گیا وفد اور میانوالی کے لوگوں کا بیان ہے کہ دو ہفتے گزر جانے کے باوجود نعش میں ذرا بھی تعفن نہیں تھا۔ بلکہ جسم صحیح و سالم تھا۔ چہرے پر جلال و جمال کا امتزاج تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

نعش بذریعہ ٹرین ۱۵ نومبر ۱۹۲۹ء کو لاہور چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچی۔ محکمہ ریلوے نے یہ نعش محکمہ جیل کے حکام کے حوالے کی اور محکمہ جیل نے وہ صندوق مسلم لیگ کے دو نمائندوں سرمحمد شفیع اور سرمحمد اقبال کے حوالے کی۔ غازی علم الدین کے جنازے میں ایک محتاط اندازے کے مطابق چھ لاکھ انسان شامل ہوئے۔ اخبار انقلاب کے مطابق جنازے کا جلوس ساڑھے پانچ میل لمبا تھا۔ نماز جنازہ قاری محمد شمس الدین خطیب مسجد وزیر خاں نے پڑھائی۔ دوسری نماز جنازہ سید دیدار علی شاہ نے اور تیسری سید احمد شاہ نے پڑھائی۔ باقی نمازیں دیگر علماء کرام نے پڑھا کر فرض کفایہ ادا کیا۔ مولانا دیدار شاہ اور علامہ محمد اقبال نے میت کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔ لوگوں نے عقیدت سے اتنے پھول

نچھاور کئے کہ میت ان میں چھپ گئی۔ اس کے بعد کچی اینٹوں سے تعویذ کو بند کر دیا گیا اور کلمہ شہادت اور کلمہ تمجید پڑھ کر قبر پر مٹی ڈال دی گئی۔

غازی علم الدین شہید کا مقبرہ میانی صاحب قبرستان میں بہاولپور روڈ کے کنارے نمایاں مقام پر ہے۔ مزار کے چاروں طرف ایک مسقف برآمدہ ہے مگر خود مزار بغیر چھت کے ہے۔ مزار کے مشرق میں غازی کے والد' والدہ اور رؤف احمد بھتیجے کی قبریں ہیں۔ تایا میاں میر بخش اور ان کی اہلیہ کی قبریں مغرب کی طرف ہیں۔ تعویذ کے شمال میں سنگ مرمر کا ایک کتبہ ہے جس کے اندرون رخ پر غازی کی تاریخ پیدائش ۳ دسمبر ۱۹۰۸ء اور تاریخ وفات ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء درج ہے۔ کتبے پر پنجابی اور اردو میں بے شمار اشعار کندہ ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

قطب الدین ایبک

قطب الدین ایبک ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ برصغیر پاک و ہند کا یہ پہلا فرمانروا ترکی الاصل تھا۔ بچپن میں حاکم نیشاپور قاضی فخرالدین عبدالعزیز کوفی نے اسے خریدا اور اس کے زیر سایہ قطب الدین نے تعلیم و تربیت کے علاوہ شہسواری اور تیراندازی کی تربیت حاصل کی۔ قاضی فخرالدین کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں نے قطب الدین کو فروخت کر دیا۔ چنانچہ وہ غزنی میں سلطان شہاب الدین محمود غوری کے ہاتھ فروخت ہوا۔

محمد غوری کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ وہ اپنے ترکی غلاموں کو اولاد کی طرح پالتا اور انہیں تعلیم و تربیت سے بہرہ ور کرتا اور جو صاحب کمال نظر آتے اسے اہم منصب پر فائز کرتا۔ قطب الدین ایبک نے کئی مہموں میں اپنی بہادری اور دلیری کے جوہر دکھائے۔ چنانچہ ترائن کی دوسری جنگ (۱۱۹۲ء) میں پرتھوی راج چوہان کی شکست کے بعد سلطان نے قطب الدین ایبک کو اپنا نائب السلطنت مقرر کر کے برصغیر میں مزید فتوحات پر مامور کر کے خود غزنی واپس چلا گیا۔

۱۱۹۲ء اور ۱۱۹۴ء کے درمیان قطب الدین نے ہانسی، میرٹھ، بلند شہر، دہلی، کوئل (علی گڑھ) قنوج اور بنارس فتح کئے اور متعدد سرکش راجاؤں پر قابو پایا۔ ۱۱۹۶ء اور ۱۱۹۷ء میں گجرات، انہلواڑہ اور رنتھمبور کے اہم قلعوں پر قبضہ کر کے ۱۲۰۲ء تک شمالی ہندوستان کے فاتح کی حیثیت اختیار کی۔ ۱۲۰۶ء میں سلطان محمد غوری کی وفات کے بعد قطب الدین لاہور پہنچا جہاں اس کی تاجپوشی

کا جشن منایا گیا۔ سلاطین دہلی کے لیے وسط ایشیا کی طرف سے ہروقت خطرہ رہا کرتا تھا۔ چنانچہ تاج الدین یلدوز قطب الدین سے شکست کھانے کے باوجود خطرہ بنا رہا۔ اس سے تعلقات استوار کرنے کی خاطر قطب الدین نے تاج الدین یلدوز کی بیٹی سے شادی کر لی۔ نیز اپنی ایک بیٹی کی شادی ناصر الدین قباچہ حاکم ملتان و سندھ سے کر دی اور دوسری بیٹی شمس الدین سے بیاہ دی۔ ان رشتوں کی وجہ سے قطب الدین ایبک کی سلطنت بہت مستحکم ہو گئی۔ لیکن قدرت نے اسے نظام حکومت کے میدان میں تنظیمی قابلیت اور فہم و فراست کے جوہر دکھانے کا موقع نہ دیا۔ اس کا نظام حکومت فوجی نوعیت کا تھا۔ اہم صوبوں اور شہروں میں فوج متعین تھی۔ انتظام و انصرام کے لئے عموماً فوجی افسر مقرر ہوئے تھے۔ عدل و انصاف کے لیے ہر صوبہ میں قاضی مقرر تھے۔ جرائم کی سزائیں سخت تھیں اس لیے اس کے عہد میں مکمل امن و امان رہا۔ احکام شریعت کے پابند ہونے کی وجہ سے لگان آراضی جو پہلے پیداوار کا پانچواں حصہ تھی قطب الدین کے عہد میں دسواں حصہ مقرر کی گئی جس سے رعایا خوش حال اور فارغ البال ہو گئی۔

اس زمانے میں امراء میں چوگان کا کھیل بڑا مقبول تھا اور قطب الدین کو بھی چوگان کا بڑا شوق تھا۔ یہی شوق اس کی موت کا باعث ہوا۔ چنانچہ ۱۲۱۰ء میں لاہور میں چوگان کھیلتے ہوئے گرا اور اپنے گھوڑے کے نیچے دب گیا۔ گھوڑے کی زین کا پیش کوہہ سلطان کے سینے میں پیوست ہو گیا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اس کے جانشین سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۱۷ء میں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔ تاہم رنجیت سنگھ کے عہد میں اسے مسمار کرا دیا گیا۔ برٹش دور میں لاہور میں آبادی کا اضافہ ہوا تو مقبرہ آبادی میں گھر گیا۔ پاکستان بننے کے بعد محکمہ آثار قدیمہ نے قبر سے متصلہ تمام مکانات کو خرید کر کے قبر کے احاطہ کو واگذار کرایا اور ۱۹۶۷ء میں مقبرہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ انار کلی بازار سے میو ہسپتال کی طرف جانیوالی گلی میں یہ مقبرہ مرجع خلائق ہے۔

سلطان قطب الدین کو علوم و فنون کے علاوہ فن تعمیر سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ ۱۱۹۳ء میں دہلی کی فتح کی یادگار میں مسجد قبتہ الاسلام (یا مسجد قوۃ الاسلام) تعمیر کرائی۔ قطب مینار کی بنیاد رکھی جو بعد میں سلطان التمش نے مکمل کروائی۔

رنجیت سنگھ

راجہ رنجیت سنگھ ۱۳ نومبر ۱۷۸۰ء کو پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت اس کا نام "بدھ سنگھ" رکھا گیا یعنی "عقل مند" لیکن باپ نے بعد میں بدل کر "رنجیت سنگھ" یعنی "میدان جیتنے والا" رکھا۔ اس کا باپ مہاسنگھ سکھوں کا مسل شکر پکیہ کا سردار اور والدہ راج کو رجند کے سردار گجپت سنگھ کی بیٹی تھی۔ گرو گوبند سنگھ جنہوں نے سکھوں کو ایک فوجی قوم بنایا ۱۷۰۸ء میں وفات پا چکے تھے۔ دلی حکومت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ سکھ طاقت پکڑتے گئے اور چھوٹے چھوٹے جتھوں میں منظم ہونے لگے۔ پانی پت کی تیسری جنگ (۱۷۶۱ء) کے باوجود سکھ ۱۷۶۴ء میں لاہور پر قابض ہو گئے۔ سکھوں کی بارہ مسلیں یا گروہ قائم ہو گئے اور انہوں نے پنجاب کے بڑے حصے کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ ۱۷۹۲ء میں اس کے والد مہاسنگھ کی وفات کے بعد اس کا اکلوتا بیٹا رنجیت سنگھ شکر پکیہ مسل کا سربراہ بنا۔ یہ مسل رچنا دو آب میں گوجرانوالہ کے علاقہ میں آباد تھی۔ رنجیت سنگھ اپنی والدہ راج کور اور اس کے مشیر کار لکھیت رائے کی سرپرستی میں پروان چڑھے۔ ان کی ابتدائی زندگی لاڈ پیار، عیش و عشرت میں گزری۔ پڑھائی لکھائی کی طرف توجہ نہ تھی۔ ۱۷۹۶ء میں رنجیت سنگھ کی شادی سردار گوربخش سنگھ کی بیٹی مہتاب کور سے ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے نکئی مسل کی ایک راج کماری راج کور سے بھی شادی رچائی اور وہی ان کی خاص مہارانی تھی اور رانی مہتاب کور کا رتبہ یقیناً نکئی راج کور سے کمتر تھا۔

سترہ برس کی عمر میں رنجیت سنگھ نے حکومت کے سارے اختیارات سنبھال لئے۔ ان کی حکومت کی راہ میں جو بھی آیا اسے ہر جائز و ناجائز طریقہ

سے دبا دیا گیا۔ رنجیت سنگھ شکلاً "بدصورت، چیچک رو اور یک چشم تھا لیکن طبعی ذہانت، جفاکوشی، پامردی، بلند حوصلگی و معاملہ فہمی کی صلاحیتوں میں دنیا کے مانے ہوئے جرنیلوں میں گنا جاتا ہے۔ اس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس نے سکھوں کی مختلف مسلوں کو یکجا کر کے ایک سکھ حکومت کی بنیاد رکھی۔ وہ دریائے ستلج اور جمنا کے درمیان کی سکھ ریاستوں کو بھی ملانا چاہتا تھا۔ لیکن ان ریاستوں نے برٹش حکومت کی مدد لینی چاہی۔

کابل کے حکمران زماں شاہ نے ۹۸-۱۷۹۳ء کے درمیان پنجاب پر حملہ کیا اور رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر مقرر کیا۔ لیکن رنجیت سنگھ خود مختار حکمران بن بیٹھا اور ۱۷۹۹ء میں لاہور پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ۱۸۰۵ء میں امرتسر کا علاقہ فتح ہوا۔ ۱۸۱۱ء میں کانگڑہ کا علاقہ اور اٹک کا علاقہ فتح کیا۔ ۱۸۱۸ء میں ملتان اور ۱۸۱۹ء میں کشمیر کو بھی اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ ۱۸۲۳ء میں پشاور بھی اس کے قبضہ میں آ گیا۔ اس طرح رنجیت سنگھ کی سلطنت مشرق کی طرف تو نہ بڑھ سکی لیکن افغان حکومت کی کمزوری کی وجہ سے اس کی سلطنت شمال اور شمال مغرب کی طرف پھیل گئی۔ ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے ساتھ عہدنامہ امرتسر قرار پایا جس کی رو سے دریائے ستلج کو حد قرار دیا گیا اور طے کیا گیا کہ سکھ حکومت اور انگریز ایک دوسرے کی سلطنت میں مداخلت نہیں کریں گے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دور حکومت ۱۷۹۹ء سے ۱۸۳۹ تک ہے اس نے پنجاب کی مخصوص روایات، مخصوص انداز فکر و انداز زندگی کو اپنے انتظام سلطنت کے لیے بنیادی پیمانہ سمجھا اور اسی کو بنیاد بناتے ہوئے وقتی ضرورتوں کے حل کے لیے ایک قابل عمل اور کامیاب حکومت قائم کی۔ مہاراجہ اپنے نظام کا مطلق العنان سربراہ تھا۔ اپنے احکام پنجابی میں دیتا تھا اور منشی ان کو فارسی میں تفصیل سے لکھتا تھا۔ اس کے بعد یہ پروانے مہاراجہ کو پڑھ کر سنائے جاتے تھے جو ان کی منظوری کے طور پر اپنی مہر مثبت کرتا تھا۔ اس پر "ملاحظہ شد" کے نیچے گورمکھی مین "اکالی صحیح رنجیت سنگھ" درج ہوتا۔ اس کے بعد

پروانہ سیکریٹریٹ میں جاتا اور اس کی نقلیں تیار کر کے احکامات کی بجا آوری کا عمل شروع ہوتا۔

مہاراجہ کے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر افراد کا بلا امتیاز مذہب تقرر کیا جاتا تھا اس میں ان کی اہلیت اور مہاراجہ کی خوشنودی کو سب سے زیادہ دخل ہوتا تھا۔ مہاراجہ کے اہم ترین مشیروں میں ایک راجہ دھیان سنگھ تھا جو کہ کشمیری ڈوگرہ فوج میں عام سپاہی تھا اور ترقی کرتے کرتے وزیراعظم کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے دوسرے دو بھائی راجہ گلاب سنگھ (جس نے کشمیر انگریزوں سے ۷۵ لاکھ روپوں کے عوض خریدا تھا) اور راجہ سچیت سنگھ دونوں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ دھیان سنگھ کا بیٹا ہیرا سنگھ بھی مہاراجہ کا منظور نظر تھا اور اس کو "راجہ" اور "فرزند خاص" کے خطاب ملے ہوئے تھے۔ ہری سنگھ نلوہ مہاراجہ کا مشہور جرنیل تھا۔ مہاراجہ کے دیوانوں میں محکم چند، بھوانی داس اور کرم چند مشہور تھے۔ مہاراجہ کے مسلمان درباریوں میں فقیر عزیز الدین اور ان کے چھوٹے بھائی فقیر نورالدین اور فقیر امام الدین بہت مشہور تھے۔ ان کے علاوہ مفتی محمد شاہ بھی دربار میں اہم مقام رکھتے تھے۔

رنجیت سنگھ کے دور حکومت کا مالیاتی نظام نہایت منظم تھا۔ حکومت کی زیادہ تر آمدنی کا انحصار مختلف ٹیکسوں، نذرانہ، ضبطی، آبکاری، چوکیات اور مالیہ وغیرہ پر تھا۔ کسی بھی انتظام سلطنت پر نظام عمل نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی نوعیت اور کارکردگی حکومت اور رعایا کے درمیان باہمی اعتماد اور معاشرتی آسودگی کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ رنجیت سنگھ کے انصرام سلطنت سے قبل مغل حکومت کے زیر انتظام ایک شرعی نظام عمل قائم تھا۔ اس میں سربراہ مملکت کی مرضی کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات اور فقہ کی روشنی میں فیصلے کئے جاتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے نظام عدل کا بنیادی محور روایت کو ہی رکھا اور اس نظام میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کا فیصلہ ان کے عقائد کے مطابق کیا جاتا تھا یا اس کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نظام سلطنت پر "پنچ پیاروں" کو سپریم کورٹ

کی سی حیثیت حاصل تھی۔ ان کا انتخاب خالصتاً مذہبی بنیادوں پر ہوتا تھا اور یہ تمام سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ذمے سکھ مذہب کو تمام خلفشار اور غیر سلامتی سے بچانا اور ان کے انتظامی امور طے کرنا اور دوسرے مذہبی امور کی انجام دہی تھی۔ تمام سکھ مع راجہ رنجیت سنگھ اور دوسرے راجے اپنے آپ کو ان کے تابع سمجھتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ایک مسلمان عورت "نوراں" نامی کو اپنے حرم میں داخل کیا تو سکھوں نے اس کو برا جانا۔ پنج پیاروں نے رنجیت سنگھ پر مقدمہ چلایا اور اس کو سوا لاکھ روپیہ جرمانہ عائد کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے یہ فیصلہ تسلیم کیا اور جرمانے میں کمی کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور پانچ ہزار روپے قرار پایا جو مہاراجہ نے ادا کر دیا۔

رنجیت سنگھ کے نظام عدل میں مجرموں کو دی جانے والی سزاؤں کی نوعیت مثالی ہوتی تھی۔ اور اس سزا کے فرد پر اثرات کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ دیوانی مقدمات میں عام طور پر جرمانے کی سزا دی جاتی تھی جس میں سے ڈگری شدہ رقم کا ۴/۱ حصہ ہارنے والا بطور جرمانہ اور جیتنے والا بطور شکرانہ سرکاری خزانے میں جمع کرواتا تھا۔ فوجداری جرائم میں عام طور پر جسمانی سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان جرائم میں ڈاکہ، اغوا، خواتین کی بے حرمتی اور چوری شامل تھے۔ مجرم کو کوڑے اور بید لگائے جاتے تھے۔ منہ کالا کر کے شہر گھمانا، پیشانی داغ دینا، ناک، کان یا بازو کاٹ دینا شامل تھے۔ سزائے موت کے حوالے چند ایک ہی ذکر ملتے ہیں۔ لیکن اس کے کئی گورنر یہ سزا اکثر دیدیا کرتے تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انتہائی منظم فوجی نظام کی بنیاد رکھی اور مختلف افواج خالصہ، پیادہ، گھڑسوار، توپ خانہ، اکالی فوج قائم کی۔ مہاراجہ اپنی فوج اور ساتھیوں کو اعلیٰ کارکردگی پر انعامات سے نوازتا تھا اور غلطی پر سزا بھی دیتا تھا جس سے فوج میں شامل افراد میں احساس ذمہ داری قائم رہتا تھا۔ اس نظام کی بدولت سکھ فوج اس پایہ کو پہنچی کہ رنجیت سنگھ کے مرنے کے دس سال بعد اس فوج کو سازشوں کے ذریعے تباہ کرنے کے باوجود انگریزوں نے لارڈ ڈلہوزی کی قیادت میں پنجاب پر بڑی مشکل سے قبضہ کیا۔ رنجیت سنگھ نے مضبوط خارجہ

حکمت عملی کی بنیاد رکھی اور بیرونی حکومتوں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کئے جس سے اس کے دور اقتدار کی طوالت میں اضافہ ہوا۔ رنجیت سنگھ کا دور حکومت اپنے سیاسی پس منظر میں ٹوٹتی ہوئی ہندوستانی ریاستوں کے درمیان ایک عظیم ریاست کا قیام تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں زراعت اور صنعت کو یکسر نظر انداز کیا گیا لیکن اس کے باوجود دوسرے مختلف کامیاب عوامل نے رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں معاشی خوشحالی اور اجتماعی سلامتی کے اسباب پیدا کئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ۱۸۳۹ء میں لاہور میں وفات پا گیا۔ اس کی یادگار بادشاہی مسجد کے قریب ہے جہاں اس کی راکھ کو دفن کر کے ایک تاریخی اور مذہبی مقام کی حیثیت دی گئی ہے۔

ملکہ نور جہاں

نورجہاں کا اصلی نام مہرالنساء تھا۔ وہ ایرانی النسل مرزا غیاث بیگ کی لڑکی تھی۔ مرزا غیاث بیگ ایران سے ہجرت کر کے تلاش روزگار میں ہندوستان آ رہا تھا کہ قندھار کے نزدیک مہرالنساء پیدا ہوئی۔ غربت کی وجہ سے ماں باپ نے نوزائیدہ بیٹی کو راستے میں ایک درخت کے نیچے مقدر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ لیکن بعد ازاں ایک قافلے کے سردار ملک مسعود کی وساطت سے مہرالنساء کی پرورش اپنے ہی والدین کے سپرد ہوئی۔ ملک مسعود کی وساطت سے ہی غیاث بیگ کو اکبر کے دربار میں ملازمت بھی مل گئی جہاں وہ اپنی لیاقت اور ذہانت کی وجہ سے شاہی کارخانوں کا نگران بن گیا اور رفتہ رفتہ وزیر کے مرتبہ تک پہنچ گیا۔ جہانگیر کے عہد میں اسے اعتماد الدولہ کا خطاب ملا۔

۱۵۹۵ء میں سترہ سال کی عمر میں مہرالنساء کی شادی علی قلی خاں سے ہوئی تھی۔ جس کو دوران شکار تلوار سے شیر کو ہلاک کرنے پر شیرافگن کا خطاب ملا۔ شیرافگن بنگال کے ضلع بردوان کا فوجدار تھا۔ ۱۶۰۶ء میں شیرافگن کی موت کے بعد اس کی بیوی مہرالنساء اور بیٹی لاڈلی بیگم مغلیہ دربار میں پیش ہوئیں اور انہیں شاہی سرپرستی میں لے لیا گیا۔

مہرالنساء کی بادشاہ کو سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی مقرب خاص بنا دیا گیا۔

۱۶۱۱ء میں جشن نو روز کے دوران مینابازار کی سیر کرتے ہوئے جہانگیر نے اچانک مہرالنساء کو دیکھا۔ اس کی خوبصورتی، رعنائی اور حاضر جوابی سے اتنا متاثر ہوا کہ مئی ۱۶۱۱ء میں اس سے شادی کر لی۔ نور محل کا خطاب ملا لیکن بعد میں نور جہاں کے تاریخی لقب سے مشہور ہوئی۔ شادی کے وقت جہانگیر کی عمر

۴۲ سال اور مہرالنساء کی عمر چونتیس سال تھی۔

نورجہاں اور جہانگیر کی شادی کے بارے میں بعض مصنفین نے افسانہ طرازی کے طور پر ان کی محبت کا افسانہ بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے شہزادہ جہانگیر دونوں ہاتھوں میں دو کبوتر لئے ہوئے باغ میں گھوم رہا تھا۔ پھول توڑنے کی غرض سے اپنے دونوں کبوتر مہرالنساء کو پکڑا دیئے جو چمن میں گھوم رہی تھی۔ اتفاقاً" ایک کبوتر پھڑک کر مہرالنساء کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جب شہزادہ ادھر متوجہ ہوا اور پوچھا کہ کبوتر کیا ہوا تو اس نے کہا صاحب عالم وہ تو اڑ گیا۔ شہزادے نے پوچھا کیونکر؟ اس نے دوسرا کبوتر بھولپن سے ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے کہا "اس طرح"۔ مہرالنساء کی اس ادا پر جہانگیر فدا ہو گیا۔ اکبر کو شہزادے کی اس محبت کا پتہ چلا تو اکبر نے اس کی شادی علی قلی خاں سے کر دی۔ جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے شیر افگن کو مروا ڈالا اور مہرالنساء سے شادی کر لی۔

بعد کے محققین اس خیال کو غلط ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی ہم عصر مورخ نے اس واقعہ کے بارے میں اشارتاً" بھی ذکر نہیں کیا۔ تزک جہانگیری میں بھی اس واقعہ کے بارے میں کچھ نہیں ملتا۔ کسی ہم عصر یورپین مورخ نے بھی اس افسانہ کے متعلق نہیں لکھا۔ حالانکہ یہ لوگ مغل بادشاہوں کی نجی زندگی کے بارے میں ہر قسم کی افواہوں اور من گھڑت افسانوں کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ اکبر کا سلیم کو مہرالنساء سے شادی کرنے سے منع کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ پھر اگر جہانگیر علی قلی خاں کا رقیب ہوتا تو اسے شیر افگن کا خطاب دے کر اہم عہدے پر ترقی نہ دیتا۔ تحقیق اور شواہد کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ایام شہزادگی میں شہزادہ سلیم نہ تو مہرالنساء کی محبت میں گرفتار ہوا نہ اس سے شادی کا آرزو مند رہا۔ زمانہ حال کے مورخین اپنی تحقیق سے اس تمام داستان کو سراسر غلط قرار دیتے ہیں۔

نورجہاں نسوانی حسن کا بے مثال شاہکار تھی۔ اس کے حسن و جمال میں ایک دوشیزہ کی دلاویزی تھی۔ صحت قابل رشک تھی۔ اپنے حسن و رعنائی

کو آرائش جمال کے نت نئے انداز اور ملبوسات میں پر کشش جدت طرازیوں سے سحر انگیز اور نظر نواز بنائے رکھتی تھی۔ حسن و خوبصورتی اور آرائش کے علاوہ ملکہ اعلیٰ تعلیم، شائستگی، سخن آرائی، بذلہ سنجی، فن کارانہ مزاج، خداداد قابلیت اور تخلیقی اوصاف سے مزین فطرت کا لاثانی شاہکار تھی۔ فی البدیہہ اور برجستہ اشعار کہنے میں کمال حاصل تھا۔ اس کی حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی کے بے شمار واقعات ہیں۔ نور جہاں نے تخلیقی ذہن پایا تھا۔ اس نے کئی نئے فیشن ایجاد کئے۔ لباس کی بے شمار طرزیں رائج کیں۔ گلاب کا عطر ایجاد کیا۔ مغل دربار کی نئے سرے سے آرائش کی۔ طبعاً" سخاوت اور نیکی کی طرف مائل تھی۔ غریبوں اور مظلوموں کی خیرخواہ، یتیموں اور مسکینوں کے لئے مشفق و مہربان تھی۔ یتیم بچیوں کی تعلیم اور شادی اور جہیز کا اہتمام کرنا اور بے کسوں کی امداد کرنا اس کا اصول تھا۔

شادی کے بعد نور جہاں نے اپنی صلاحیت، قابلیت فراست و ذہانت سے جہانگیر کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ رفتہ رفتہ تمام امور سلطنت کی نگرانی شروع کر دی۔ قدرت نے اسے معاملہ فہمی اور فراست سے نوازا تھا۔ پیچیدہ درباری مسائل اور سیاسی گتھیاں اس طرح سلجھاتی اور فیصلے کرتی کہ بڑے بڑے امراء دنگ رہ جاتے۔ اکثر شکار کی شاہی مہمات میں شامل ہوتی اور جسمانی طاقت اور قوت ارادی کا مظاہرہ کرتی۔ بسااوقات اپنے ہاتھ سے شیر کا شکار کرتی۔ مہابت خاں کی بغاوت کے دوران نورجہاں نے اپنی دانائی سے جہانگیر کو رہائی دلانے کی جرات مندانہ کوشش کی۔ رفتہ رفتہ جہانگیر امور سلطنت سے غافل ہوتا گیا اور ملکہ حکومت کے سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔ جاہ طلبی اور اقتدار کی ہوس کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ اس نے بلاشرکت غیرے اقتدار سنبھال لیا اور پندرہ سال تک اقتدار پر قابض رہی۔ اس کے دربار میں اس کے حامیوں کا ایک بااثر گروپ بن گیا جسے تاریخ میں نورجہانی جتھہ کہا جاتا ہے۔ یہ گروپ ملکہ نور جہاں، باپ اعتماد الدولہ، بھائی آصف جاہ والدہ عصمت بیگم اور ملکہ کی بھتیجی ارجمند بیگم کے شہزادہ خرم (شاہجہاں) پر مشتمل تھا۔ یہ جتھہ ۱۶۱۱ء سے ۱۶۲۲ء

تک بر سر اقتدار رہا۔ شروع میں اس جتھہ کی اعلیٰ کارکردگی کے باعث باغیوں کا قلع قمع ہوا اور کئی فتوحات حاصل ہوئیں۔ مملکت میں امن و امان قائم ہوا۔ ۱۶۲۲ء میں اعتماد الدولہ کی وفات کے بعد یہ جتھہ کمزور پڑ گیا۔ نور جہاں اپنے داماد شہزادہ شہریار کو جہانگیر کا جانشین بنانا چاہتی تھی۔ اس وجہ سے دربار میں ایک سازشی ماحول پیدا ہو گیا اور بعد میں شہزادہ خرم (شاہجہاں) اور مہابت خاں جیسے وفادار اور اعلیٰ جرنیل بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔

۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی وفات کے ساتھ ہی ملکہ کے اقتدار کا ستارہ بھی زوال پذیر ہو گیا۔ شہزادہ خرم شاہجہاں کے لقب سے تخت نشین ہوا تو ملکہ نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور جہانگیر کی وفات کے بعد ۱۸ سال تک شاہی قلعہ لاہور میں مقیم رہی اور ۱۶۴۵ء میں وفات پائی۔ شاہجہاں نے دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ عملی سیاست سے دستبرداری کے بعد یتیم لڑکیوں کی تعلیم اور شادی کا اہتمام کرنا اور ہر روز اپنے شوہر کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے جانا اس کا معمول تھا۔ جہانگیر کا مقبرہ شاہجہاں نے ملکہ نور جہاں کی نگرانی میں تعمیر کرایا۔ نور جہاں نے اپنا مقبرہ اپنے ذاتی مصارف سے خود اپنی زندگی میں بنوایا۔

maablib.org

نورالدین محمد جہانگیر

جہانگیر ۱۵۶۹ء میں فتح پور سیکری کے مقام پر پیدا ہوا۔ اکبر نے اس کا نام شیخ سلیم چشتی کے نام پر محمد سلطان سلیم رکھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کے لیے نہایت اعلیٰ انتظام کیا اور عبدالرحیم خانخاناں کو اس کا اتالیق مقرر کیا۔ اپنی قدرتی ذہانت کے باعث جہانگیر نے جلد ہی عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت پر عبور حاصل کر لیا اور علم تاریخ، جغرافیہ، علم نباتات، موسیقی اور مصوری میں رس حاصل کر لی۔ شعر و ادب اور مصوری سے اسے خاص طور سے دلچسپی تھی۔ ۱۵ سال کی عمر میں ۱۵۸۵ء میں راجہ بھگوان داس والی امبر کی بیٹی مان بائی عرف شاہ بیگم سے اس کی پہلی شادی ہوئی اور ۱۵۸۷ء میں مان بائی کے بطن سے شہزادہ خسرو پیدا ہوا۔ جہانگیر کی بیویوں کی تعداد کے بارے میں مورخین کا خیال ہے کہ منکوحہ بیویوں کی تعداد بیس سے کم نہ تھی۔

شہزاد سلیم اوائل عمری سے عیش و عشرت اور مے نوشی کا دلدادہ تھا اور یہ چیز اکبر کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ ۱۵۹۱ء میں جب اکبر دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو اس نے سلیم کو نائب السلطنت متعین کر دیا۔ لیکن سلیم نے الہ آباد پہنچ کر علم بغاوت بلند کر کے صوبہ بہار کے خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اکبر اسیر گڑھ سے واپس آگرہ پہنچا اور دکن سے ابوالفضل کو بلوا بھیجا۔ سلیم نے راستے ہی میں ابوالفضل کو ہلاک کرا دیا جس کا اکبر کو بہت رنج ہوا۔ اکبر کے پاس اتنے وسیع ذرائع تھے کہ وہ بغاوت کو با آسانی فرو کر سکتا تھا۔ لیکن محبت پدری کے باعث اس نے کوئی شدید تادیبی کاروائی نہیں کی۔ آخر کار سلیمہ بانو بیگم کی کوشش سے باپ بیٹے میں صلح

ہو گئی اور سلیم نے اپنی دادی مریم مکانی کی معیت میں حاضر ہو کر معافی مانگ لی۔

اکبر کی وفات کے بعد شہزادہ سلیم ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۵ء کو آگرہ میں تخت نشین ہوا اور نورالدین محمد جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔ تخت نشینی کی خوشی میں ہزارہا قیدیوں کو رہا کیا گیا اور اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ جہانگیر نے اسلام کے تحفظ اور اکبر کی صلح کل حکمت عملی کی پالیسی کی پابندی کا اعلان کیا۔

تخت نشین ہوتے ہی جہانگیر نے چند اصلاحی احکام نافذ کیے۔ چوری اور ڈاکہ زنی کے انسداد کے لئے شاہراہوں پر مستقل سرائیں اور مساجد اور کنویں تعمیر کرائے۔ شراب اور افیوں بنانا اور بیچنا ممنوع قرار دیا گیا۔ شفاخانے تعمیر کئے گئے کاشتکاروں کی بیدخلی کی ممانعت کی گئی اور بعض محاصل کی تنسیخ کا حکم جاری کیا۔ مال تجارت کی نقل و حمل پر عائد پابندی اٹھالی گئی۔ جاگیرداروں کو سختی سے منع کیا گیا کہ وہ رعایا کی زمینوں پر قبضہ نہ کریں۔ یہ بھی حکم دیا کہ وفات کے بعد کسی عہدیدار کی جائیداد ضبط نہ کی جائے بلکہ مرحوم کے وارثوں کو دیدی جائے۔ مجرموں کے ہاتھ' پاؤں اور کان نہ کاٹے جائیں خاص ایام میں ذبیحہ کی ممانعت کی گئی۔ اکبر کے زمانے کے تمام منصب داروں کے مناصب اور جاگیرداروں کی جاگیروں کی عام توثیق کا حکم جاری کیا گیا۔

جہانگیر کی زنجیر عدل نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس زنجیر کے کھینچنے سے شاہی محل میں گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی تھیں اور جہانگیر بہ نفس نفیس ہر فریادی کی داد رسی کرتا تھا۔ زنجیر عدل کے بارے میں جہانگیر خود رقم طراز ہے کہ یہ زنجیر تمام کے تمام خالص سونے کی تھی جو تیس گز لمبی اور ساٹھ طلائی گھنٹیوں سے مزین تھی۔ اس کا وزن چار من تھا۔

شہزادہ خسرو جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ بڑا قابل بلند حوصلہ تھا اور اپنے دادا اکبر کا نور نظر تھا۔ درباریوں میں سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید اکبر اپنی وفات کے بعد خسرو کو تخت پر بٹھانا چاہتا ہے۔ ان افواہوں کے پیش نظر جہانگیر نے شہزادہ خسرو کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا تھا۔ ۱۶۰۶ء میں اپنے

دادا اکبر کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بہانے سے خسرو ۳۵۰ سواروں کے ہمراہ تیزی سے دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی فوج کی تعداد ۱۲۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ شہزادہ خسرو نے لاہور کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

جہانگیر نے باغی شہزادے کے تعاقب میں فوج بھیجی اور خود بھی دوسرے دن اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ دریائے چناب کے کنارے بھیروال کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ خسرو کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے ساتھیوں کو سخت سزائیں دی گئیں اور خسرو کو بینائی سے محروم کر دیا گیا۔ خسرو کو شہزادہ خرم (شاہجہاں) کے سپرد کر دیا گیا۔ بالآخر ۱۶۲۲ء میں اس کی وفات ہو گئی۔

جہانگیر کے عہد کا اہم ترین واقعہ اس کی نور جہاں (مہرالنساء) سے شادی ہے۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں جشن نو روز کے دوران مینابازار کی سیر کرتے ہوئے جہانگیر نے اچانک نور جہاں کو دیکھا۔ اس کی خوبصورتی، رعنائی اور حاضر جوابی سے اتنا متاثر ہوا کہ مئی ۱۶۱۱ء میں اس سے شادی کر لی۔ اس شادی کے بارے میں مورخین متضاد نظریات رکھتے ہیں۔ کبوتر والا افسانہ بھی زبان زد عام ہے۔ مزید یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہزادہ سلیم مہرالنساء کی محبت میں گرفتار تھا۔ لیکن مہر النساء کی شادی علی قلی خاں شیر افگن سے کر دی گئی۔ چنانچہ موقع پا کر شیر افگن کو ہلاک کروا کر جہانگیر نے مہرالنساء سے خود شادی کر لی۔ لیکن بیشتر مورخین کی دیانتدارانہ رائے ہے کہ جہانگیر نے مہرالنساء کو پہلے دیکھا تک نہ تھا۔ اور شیر افگن کی ہلاکت سے جہانگیر کا کوئی تعلق نہ تھا۔ شادی کے وقت جہانگیر کی عمر ۴۲ سال اور نور جہاں کی عمر ۳۴ سال تھی۔ نور جہاں تمام نسوانی خوبیوں کی حامل ہونے کے علاوہ اعلیٰ فہم و فراست اور معاملہ فہمی کی صفات بھی رکھتی تھی۔ وہ تمام امور سلطنت کی نگرانی کرنے لگی اور رفتہ رفتہ جہانگیر امور سلطنت سے غافل ہو تا گیا۔ نور جہاں مملکت کی سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔ نور جہاں اس طرح پندرہ سال تک اقتدار پر قابض رہی۔ ہوس جاہ و اقتدار کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ نور جہاں کا اقتدار اگرچہ عام لوگوں کے لیے مفید تھا لیکن

انجام کار سلطنت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔

عہد جہانگیری کی اہم فتوحات میں بنگال کے افغانوں کی سرکوبی، میواڑ کی مہم، کانگڑہ اور کشتواڑ کی فتح، دکن میں بیجاپور کی فتح اور قندھار کا معرکہ بھی شامل ہے۔ لیکن ۱۶۲۳ء میں شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے بغاوت کر دی جو اس عہد کا بیحد اہم واقعہ ہے۔

نور جہاں نے جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار (جو نور جہاں کے سابقہ شوہر کی بیٹی لاڈلی بیگم کا شوہر تھا) کو تخت پر بٹھانے کی سازشیں شروع کر دیں۔ شہزادہ خرم (شاہجہاں) کی بغاوت کا یہی اصل سبب تھا۔ بالآخر تین سال کے کشت و خون کے بعد ۱۶۲۳ء میں شاہجہاں کی بغاوت ختم ہوئی۔ لیکن اس سال مہابت خاں کی بغاوت نے بھی سر اٹھایا۔ نورجہاں کی فراست اور دانائی کی وجہ سے یہ بغاوت بھی تقریباً" تین ماہ کے بعد فرو ہوئی۔

۱۶۲۷ء میں جہانگیر کشمیر سے واپس آ رہا تھا کہ راجوڑی کے مقام پر اسے دمہ کا شدید دورہ پڑا اور ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو وفات پا گیا۔ اس کی لاش کو لاہور لایا گیا اور اس کی وصیت کے مطابق اسے شاہدرہ کے نزدیک دلکشا باغ میں دفن کیا گیا جہاں شاہجہاں نے نورجہاں کی نگرانی میں عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا۔

جہانگیر ایک دلچسپ اور مسحور کن شخصیت کا مالک تھا۔ اعلیٰ تعلیم و تہذیب سے آراستہ، نہایت زیرک، ادب دوست، روشن خیال فیاض اور منصف مزاج تھا۔ عالی ظرف، شائستگی کا پتلا اور شگفتہ مزاج تھا۔ شراب اور افیون کا رسیا ہونے کے باوجود سیر و شکار اور ورزش کا شوقین تھا۔ علوم و فنون سے وابستگی اس کی تصنیف تزک جہانگیری سے ظاہر ہے۔ فن مصوری میں اس کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ تصویر کو دیکھ کر مصور کا نام بتا سکتا تھا۔ اصل اور نقل تصویر کو با آسانی پہچان سکتا تھا۔ فن تعمیر سے لگاؤ ہونے کے باعث متعدد مقامات پر باغ لگوائے۔ مذہب کے لحاظ سے جہانگیر راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتا تھا اور اکبری دور کے الحاد کو ناپسند کرتا تھا۔ مسلم صوفیا کا بڑا معتقد تھا۔ لیکن اپنے با اکبر کی طرح مذہبی رواداری کا حامی تھا اور ہمیشہ

صلح کل پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ اپنی غیر مسلم رعایا کو پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ اور کسی کو مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا نشانہ نہ بنایا۔

جہانگیر کے بارے میں ڈاکٹر بینی پرشاد کا قول درست معلوم ہوتا ہے۔

۔ لکھتے ہیں کہ "جہانگیر کو سنگدل' متلون مزاج' جابر اور افیون اور شراب کا رسیا کہنا سراسر زیادتی ہے۔ اس کی شہرت اپنے باپ کی عظمت اور بیٹے شاہجہاں کی شان و شوکت کے سامنے ماند پڑ گئی۔ بحیثیت مجموعی اس کا عہد امن و سکون اور خوشحالی کا دور ہے۔ اس کے عہد میں علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا۔ مصوری منتہائے کمال کو پہنچی اور صنعت و حرفت ترقی پذیر ہوئی۔"

آغا حشر کاشمیری

آغا حشر کا پورا نام آغا محمد شاہ تھا آپ یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ آغا حشر کے آباؤ اجداد سری نگر (مقبوضہ کشمیر) سے ہجرت کر کے بنارس آئے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا۔ ان کے بزرگ شالوں کی تجارت کرتے تھے۔ آغا حشر کے والد کا نام آغا محمد غنی شاہ تھا۔ آغا حشر کا گھرانہ مذہبی تھا چنانچہ بچپن سے ہی ان کے والد اور نانا نے ان کی تعلیم و تربیت کے ضمن میں اپنی خاندانی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن مجید اور مذہبی درس کی تکمیل کروائی۔ ان کے بزرگ عربی فارسی کی تعلیم اور اپنے قدیم وضع کے اصولوں کی پیروی اپنی اولاد پر فرض سمجھتے تھے چنانچہ آغا حشر کو اس کی تدریس بھی کروائی گئی۔ آغا حشر کو سات برس کی عمر میں مکتب میں داخل کروایا گیا۔ دس برس کی عمر تک ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آغا حشر نے قران مجید ناظرہ پڑھنے کے علاوہ سولہ پارے حفظ بھی کئے۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد آغا حشر کو جے نرائن مشن سکول بنارس میں داخل کروایا گیا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اور گھریلو مذہبی ماحول نے ان کی تربیت پر ایسا اثر ڈالا کہ اسلام کی حقانیت آغا حشر کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

آغا حشر کی شادی ۱۹۱۱ء میں ہوئی۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا نادر شاہ پیدا ہوا لیکن ایک سال عمر پانے کے بعد لکھنؤ میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد آغا حشر لاہور آ گئے اور ان کی بیوی بھی ۱۹۱۴ء میں وفات پا گئیں۔ اس کے بعد آغا حشر نے مرتے دم تک شادی نہ کی۔ آغا حشر اپنے کام کے سلسلے میں مختلف وقتوں میں مختلف علاقوں میں گھومتے پھرتے رہے۔ زیادہ عرصہ لکھنؤ، بمبئی اور

لاہور میں گزرا۔ آغا حشر کے قریبی دوستوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا تاجور نجیب آبادی اور مولانا چراغ حسن حسرت شامل تھے۔

آغا حشر نے اگرچہ ہزاروں کمائے اور لاکھوں اڑائے۔ مگر فطرت کی سادگی کی بدولت ان کا رہن سہن ہمیشہ سادہ رہا۔ ان کے مزاج میں خود داری اور خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، لیکن اسے غرور کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ عزت نفس کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ مستقل مزاجی اور قوت ارادی آغا حشر کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ انہوں نے اپنے کردار میں کبھی لچک نہ آنے دی یہاں تک کہ اس اصول کے لیے جان تک دیدی۔ ساری عمر شراب پیتے رہے لیکن جب اسے ترک کیا تو ڈاکٹروں کے کہنے کے باوجود اسے دوبارہ ہاتھ نہ لگایا۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں کی رائے کے مطابق ناؤ نوش کی عادت ایک دم ترک کر دینے کے باعث آغا حشر کی صحت گر گئی تھی۔

آغا حشر وسیع المشرب، زندہ دل اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی یہ خوبی تھی کہ وہ اپنی حاضر جوابی، بذلہ گوئی اور برمحل لطافت و ظرافت سے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ زندہ دلی اور خوش طبعی انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔ وہ اپنی پر تاثیر اور مزاحیہ گفتگو سے دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ان کو ہر موضوع پر بے تکلف گفتگو کرنے پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ خشک ترین موضوعات کو بھی اپنے لطیفوں اور پھبتیوں سے رنگین بنا دیتے تھے۔

آغا حشر ایک بلند پایہ ڈرامہ نویس ہی نہ تھے بلکہ ایک فلاسفر، ایک شاعر، ایک مصور جذبات اور بلند پایہ ادیب بھی تھے بمبئی میں قیام کے دوران آغا حشر عیسائی مشنری اور آریہ سماج تبلیغ کے خلاف مناظروں اور مباحثوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کی بساط پر پٹ چکے تھے۔ مذہب کے میدان میں بھی انہیں پسپائی کا سامنا تھا آریہ سماج تبلیغ اور عیسائی مشنری ایک منظم تحریک کی صورت میں مسلمانوں

کے خلاف برسرپیکار تھی۔ ان کا یہ حربہ اسلام کی روح سے ناآشنا لوگوں کو مذہب سے بیگانہ کرنے میں مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ اس مشکل وقت میں آغا حشر، مولانا ابوالکلام آزاد، نظر حسین سخا اور خواجہ حسن نظامی نے مل کر ایک انجمن قائم کی۔ جس کا نام "انجمن نصرت اسلام" رکھا۔ یہی وہ مضبوط محاذ تھا۔ جس کے سامنے بڑے بڑے پادری نہ ٹھہر سکے۔ اس انجمن نے "البلاغ" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا۔ ابوالکلام آزاد اور آغا حشر اس کو مرتب کرتے تھے مگر ان کا نام رسالے میں نہیں دیا جاتا تھا۔ آغا حشر بہت سی ایسی صلاحیتوں کے مالک تھے جو عام شاعروں، خطیبوں، اور ڈرامہ نویسوں کے حصے میں نہیں آئیں۔ یہ ان کا خطابت، تقریر، مناظرہ اور بحث و مباحثہ کا فن تھا۔ جس محفل میں جاتے اپنے علم و فضل، زور بیان، حاضر جوابی اور برجستہ گوئی سے اہل محفل پر چھا جاتے۔ انداز خطابت کا یہ عالم تھا کہ جس محفل میں تقریر کرتے سننے والوں پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا۔ زور بیان اور اثر آفرینی کی بدولت نہ صرف ڈرامہ کے میدان میں اپنا سکہ منوایا بلکہ دنیا میں ایک بڑے خطیب، مقرر اور مناظر کی حیثیت سے بھی تسلیم کیے گئے۔

لاہور میں قیام کے دوران انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں نظمیں پڑھتے رہے۔ آغا حشر کی زندگی کا ابتدائی حصہ ڈرامہ نویسی میں بسر ہوا۔ یہی ان کا محبوب مشغلہ رہا اور یہی پیشہ انہوں نے تمام عمر اختیار کیا۔ انہوں نے پہلا ڈرامہ "آفتاب محبت" لکھا۔ یہ ڈرامہ "مطبع اکسیر المطابع" بنارس سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں آغا حشر بمبئی گئے اور وہاں بہت سی تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکان سے ملے۔ اس وقت وہاں "الفریڈ تھیٹریکل کمپنی" کا طوطی بولتا تھا۔ اس کمپنی کے ڈائریکٹر مسٹر امرت لال ایک مردم شناس آدمی تھے۔ انہوں نے آغا حشر کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور اپنی کمپنی میں پندرہ روپے ماہوار پر مستقل ملازم رکھ لیا۔

یہ آغا حشر کی ڈرامائی زندگی کا پہلا مرحلہ تھا اور یہیں سے ان کی شہرت و مقبولیت کا آغاز ہوا۔ اس کمپنی کے لیے انہوں نے اپنا پہلا ڈرامہ "مرید شک"

لکھا۔ اس کا پلاٹ شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے (Winters Tale) سے ماخوذ تھا۔ اسے ۱۸۹۹ء میں سٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامے نے ان کے لیے کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے۔

پھر مختلف کمپنیوں میں کام کرتے رہے۔ الفریڈ تھیٹریکل کمپنی چھوڑ کر نوروزجی کی کمپنی میں چلے گئے اور اس کمپنی کے لیے دو ڈرامے "میٹھی چھری عرف دورنگی دنیا" اور "دام حسن" پیش کیے۔ اس کے بعد دوبارہ الفریڈ کمپنی میں چلے گئے اور مشہور ڈرامہ "شہید ناز" لکھا جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر شیردار بھائی کی کمپنی میں چلے گئے اور دو ڈرامے "سفید خون" اور "قید ہوس" لکھے۔ وہاں سے جی اچاٹ ہوا تو "نیو الفریڈ کمپنی" میں چلے گئے اور اپنا مشہور ڈرامہ "خوبصورت بلا" اسٹیج کیا۔

اس کے بعد پونا میں رائزنگ اسٹار کمپنی میں ملازم ہو گئے مگر جلد ہی اس سے علیحدگی اختیار کر کے حیدر آباد میں ایک جاگیردار کی کمپنی میں ملازم ہو گئے اور ڈرامہ "سلور کنگ" لکھا۔ ۱۹۱۲ء میں اس کمپنی کی ملازمت ترک کر کے لاہور آ گئے۔ لاہور ان دنوں علم و ادب کا گہوارہ بن چکا تھا۔ اردو کی ترویج و ترقی کے لیے بہت کام ہو رہا تھا۔ مختلف انجمنیں سرگرم عمل تھیں جن میں انجمن حمایت اسلام، بزم اردو اور بزم سخن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آغا حشر بھی لاہور آ کر ان تنظیموں کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور اردو کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔

۱۹۱۶ء میں جب ان کی بیوی کا انتقال ہوا تو انہیں از حد صدمہ ہوا۔ اس صدمہ کو بھلانے کی خاطر "جے ایف میڈن تھیٹر" کلکتہ میں ملازم ہو گئے یہاں "ترکی حور"، "رستم و سہراب" جیسے شہرہ آفاق ڈرامے لکھے۔ اردو کے علاوہ ہندی زبان میں بھی "مدھر مرلی"، "بھگرت گنگا"، "ہندوستان"، "بھیشم پرتگیا"، "آنکھ کا نشہ" جیسے مشہور ڈرامے لکھے۔

۱۹۲۴ء میں جے ایف کمپنی چھوڑ کر اپنی کمپنی بنانے کی دھن میں بنارس چلے گئے۔ اپنی کمپنی بنا کر آگرہ، الہ آباد اور دیگر مقامات کا دورہ کیا۔

متکلم فلمیں شروع ہوئیں تو آغا حشر نے اس میدان میں بھی قدم رکھا اور "شیریں فرہاد" "عورت کا پیار" "یہودی کی لڑکی" "قسمت کا شکار" اور "دل کی لگی" جیسی مشہور فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ ان میں شیریں فرہاد، عورت کا پیار اور یہودی کی لڑکی نے خاص شہرت حاصل کی۔ حشر نے شاعری کے جس میدان کو عبور کیا۔ ڈراما نویسی کی جو منازل طے کیں وہ اس دور کے کسی مصنف، شاعر یا ڈرامہ نویس سے طے نہ ہو سکیں۔ حشر اپنے رنگ طرز کے واحد لکھنے والے تھے۔ آغا حشر کے لکھے ہوئے مشہور ڈرامے درج ذیل ہیں۔

مرید شک، مار آستین، اسیر حرص، میٹھی چھری عرف دو رنگی دنیا، دام حسن عرف ٹھنڈی آگ، شہید ناز عرف اچھوتا دامن، سفید خون، صید ہوس، خواب ہستی عرف داؤ پیچ، خوبصورت بلا، سلور کنگ عرف نیک پروین، پہلا پیار، بن دیوی، یہودی کی لڑکی، بلوا منگل عرف سور داس، شیر کی گرج عرف نعرہ تکبیر، مدھر مرلی، بھگرت گنگا، عورت کا پیار، ہندوستان، ترکی حور، آنکھ کا نشہ، ستیا بن باس، یحیشم پر تنگیا، دھرمی بالک عرف غریب کی دنیا، بھارتی بالک عرف سماج کا شکار، دل کی پیاس، رستم و شہراب

۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو عروس ڈرامہ کا سہاگ ہمیشہ کے لیے لٹ گیا۔ انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کی آخری آرام گاہ علاقہ بڑا مکان نزد نظامیہ مسجد حضرت طاہر بندگی روڈ قبرستان میانی صاحب میں واقع ہے۔

آغا شورش کاشمیری

آغا شورش کاشمیری کا اصل نام عبدالکریم تھا۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا۔ ان کے پردادا کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر میں آباد ہوئے۔ پھر یہ خاندان لاہور آگیا۔ ان کے دادا امیر بخش صاحب نے انار کلی بازار ایبک روڈ میں باقر خانی اور کلچہ کا تنور لگایا۔ اس کاروبار سے ان کی گزر اوقات ہونے لگی۔ آغا صاحب کے والد نظام الدین صاحب کا قیام امرتسر ہی میں تھا جہاں وہ ٹین کے کارخانے میں ملازم تھے۔ آغا صاحب کی والدہ کا خاندان بھی کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر میں آباد ہوا جہاں انہوں نے پشمینہ اور شالوں کی تجارت شروع کی۔ آغا صاحب کی پرورش اور تعلیم میں والد کے بجائے ان کے دادا اور دادی کا بڑا ہاتھ تھا۔ خود فرماتے ہیں "دوران تعلیم نویں اور دسویں جماعت میں زمیندار بلاناغہ پڑھتا تھا۔ اس سے مجھے اتنا فائدہ پہنچا کہ بیان سے باہر ہے۔"

آغا شورش کاشمیری ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آغا صاحب چھ بہن بھائی تھے۔ بڑے بھائی کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ چھوٹا بھائی عین جوانی میں تپ دق میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔ سات آٹھ برس کے ہوئے تو والدہ نے وفات پائی۔ والد صاحب نے ان کی خالہ سے شادی کر لی لیکن یہ بندھن بھی ۴ سال بعد ٹوٹ گیا اور پھر دادا اور دادی نے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ دادا نے لاہور میں دیو سماج ہائی سکول واقع ست گرہ میں پہلی جماعت میں داخل کرا دیا۔ یہیں سے آغا صاحب نے میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۳۲ء میں پاس کیا۔ میٹرک کے بعد دو ڈھائی سال بیکاری میں گزرے لیکن سارا دن پنجاب پبلک لائبریری میں گزارتے اور بے

شمار کتب زیر مطالعہ آئیں۔ مالی مشکلات کے باعث آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے لیکن اعلیٰ تعلیم کالج کی بجائے جیل کی تنہائیوں میں حاصل کی۔ جیل ہی میں پروفیسر تلک راج چڈھا سے مارکسزم' سوشلزم اور کمیونزم پڑھی۔ جیل ہی میں مولانا محمد گل شیر سے قرآن مجید اور ترجمہ پڑھا۔ مارکسزم کے مطالعہ کے بعد کمیونسٹوں کی طرح خدا کی نفی کے ہمنوا ہو گئے۔ لیکن سید سلیمان ندوی کے "خطبات مدراس" نے انہیں دوبارہ خدا کی وحدانیت اور سرور کائنات کی سیرت طیبہ پر مکمل ایمان دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن نے انہیں پکا مسلمان بنا دیا۔

چھٹی جماعت میں تھے کہ سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ اس کے خلاف لاہور ریلوے سٹیشن پر زبردست احتجاج ہوا اور پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ لالہ جپت رائے شدید زخمی ہوئے اور بعد میں چل بسے۔ یہی واقعہ سیاست میں دلچسپی اور انگریزی حکومت سے شدید نفرت کا باعث ہوا۔ گھر میں زمیندار اخبار کا مطالعہ اور مولانا ظفر علی خاں سے مراسم ہونے کے باعث گھر کا ماحول سیاسی تھا۔ اپنے ایک دوست اوم پرکاش کے ساتھ مل کر اٹھارہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کی جماعت بنائی جس کا نام بال بھارت سبھا رکھا۔ اس کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہو تا گیا۔ اس کا کام روزانہ جلسہ عام کرنا اور جلوس نکالنا تھا۔ اس کے بعد آغا صاحب نے مولانا ظفر علی خاں کی جماعت مجلس اتحاد ملت پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اسی زمانہ میں ۳۶-۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا واقعہ ہوا۔ اس کے سلسلے میں جو جلسے ہوئے ان میں آغاز صاحب نے کم عمری کے باوجود بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی پہلی تقریر یہیں کی۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں شاہی مسجد لاہور میں ایک دھواں دھار تقریر کی اس طرح اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ اس بارے میں آغا صاحب خود فرماتے ہیں کہ "اس واقعہ کے بعد دنوں ہی میں مہینوں کی مشق ہو گئی۔ آخر ایک دو برس میں وہ تمام لوازم میری تقریر میں جمع ہو گئے جو ایک خطیب میں ضروری ہیں"

مسجد شہید گنج کے واقعہ کے بعد قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

پھر مجلس احرار میں شمولیت اختیار کی۔ مشہور احراری لیڈر چودھری افضل حق کے ساتھ گفتگو سے اتنے متاثر ہوئے کہ مجلس احرار میں شامل ہو گئے۔ مجلس احرار کا دائرہ کار پنجاب تک محدود تھا۔ اس کے پیروکار درمیانہ درجہ کے شہری تھے۔ ان کا پروگرام انگریزی حکومت کا خاتمہ تھا۔ انہوں نے ہندوستان کی قومی تحریک میں بے مثال قربانیاں دیں لیکن کانگریس اور لیگ دونوں نے صرف نظر سے کام لیا۔ احرار میں قربانی' احتجاج' حوصلہ اور خطابت کا جوہر وافر تھا لیکن فکر و نظر' کسوٹی اور قیادت کا تناسب نسبتاً کمزور تھا۔

آغا شورش مولانا ظفر علی خاں سے بے حد متاثر تھے اور ان کی مجلس اتحاد ملت کے تحت اپنی سیاسی زندگی شروع کی۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب کی تمام زندگی سیاسی جدوجہد میں گزری۔ پہلے وہ انگریزی استبداد کے خاتمے اور آزادی کے لیے جدوجہد کرتے رہے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ جیل میں ایسے مظالم برداشت کیے جو بیان سے باہر ہیں۔ ہر طرح کی مارپٹ تو معمولی بات تھی۔ ان کی پیٹھ پر گرم دودھ ڈالا گیا جس سے پیٹھ اور کمر جل گئی۔ چنانچہ تقسیم ہندوستان تک آغا صاحب کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے رہے جن کے باعث تشدد سے آغا صاحب ذہنی اور جسمانی مریض بن گئے۔ ذیابیطس کا مرض بھی جیل میں لاحق ہوا۔ اس کے باوجود انہوں نے انگریزی حکومت کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے۔ قیام پاکستان سے قبل ان پر یکے بعد دیگرے سات مقدمات قائم کئے گئے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک کا عرصہ گزار کر ۱۹۴۴ء میں جیل سے رہا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کسی سیاسی تنظیم کے رکن تو نہیں رہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی ایک ہی سیاسی پارٹی تھی وہ ہے "پاکستان" اور ایک نظریہ تھا جس کا نام ہے "اسلام"۔ قیام پاکستان کے بعد تحریک ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۲ء میں گرفتار ہوئے لیکن ضمانت پر رہا ہوئے۔

آغا شورش کی عظمت یہ ہے کہ مولانا ظفر علی کی طرح وقت کے

ٹوڈیوں، جعلی مشائخ، بے کردار سیاست دانوں، صحافیوں اور جعلی دانشوروں اور انگریز کے بوئے ہوئے ثمرات کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ آغا صاحب فن خطابت کے ماہر تھے۔ شعلہ بیان مقرر تھے۔ ان کی جرات، راست گفتاری اور جوش و حرارت ایمانی کی بنا پر وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ آغا صاحب کی صحافتی زندگی کا آغاز "زمیندار" اخبار سے ہوا۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کے رسالہ شاہکار کے ایڈیٹر رہے۔ باقاعدہ صحافتی زندگی کا آغاز "روزنامہ سیاست" سے کیا اور اس کے مدیر رہے۔ اس کے علاوہ الہلال، آزاد اور زمیندار سے بھی منسلک رہے۔ وہ ایک نڈر اور بے باک صحافی تھے اور صحافت کو بطور پیشہ نہیں بلکہ قومی خدمت کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا۔ یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو لاہور سے ہفت روزہ چٹان کا اجراء کیا۔ آغا صاحب اداریے بھی لکھتے، شذرات بھی تحریر کرتے۔ مختلف ناموں سے کالم نویسی بھی کرتے اور مضامین بھی لکھتے۔ پہلے الفت تخلص اختیار کیا۔ بعد میں شورش کے نام سے مشہور ہوئے۔ صحافت میں اسرار بصری کے نام سے بھی لکھتے تھے۔ آغا شورش نے نعت، غزل اور نظم میں بھی طبع آزمائی کی لیکن اصل میدان ہنگامی اور سیاسی شاعری تھا۔ چٹان بیک وقت سیاسی، ادبی، تہذیبی اور اصلاحی ہفت روزہ تھا۔ یہ رسالہ معاشرتی برائیوں کا زبردست نقاد تھا اور اس روش کی بدولت متعدد مرتبہ اس کی بندش ہوئی۔ مگر جمہور کی اس آواز کو دبایا نہ جا سکا اور اس کی مسلسل بندشوں کے باوجود اس کی مقبولیت کا سلسلہ کم نہ ہوا۔ جب بھی یہ دوبارہ چھپنا شروع ہوتا تو ایک نئی آب و تاب ہوتی۔

آغا شورش کاشمیری احراری ہونے کے باوجود سچے محب وطن صحافی اور مخلص انسان ہونے کے ناتے مسلم لیگ کے بھرپور ترجمان تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح اور پاکستان سے جس خلوص، محبت، جانسوزی اور عقیدت کا عملی اظہار کیا اس کی مثال خود مسلم لیگ کے پاس بھی نہیں ملتی۔ چٹان میں شورش کی نظمیں اور اداریے خصوصی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ اس رسالے کے نادر اہل قلم اور معاونین میں

مولانا صلاح الدین احمد، احسان دانش، رئیس امروہوی، ملاواحدی، رشید احمد صدیقی، جگن ناتھ آزاد اور سید عابد علی عابد وغیرہ شامل تھے۔

آغا شورش کاشمیری کی اہم تصانیف درج ذیل ہیں۔

(۱) بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل (۲) پس دیوار زنداں (۳) موت سے واپسی

تینوں کتابیں آغا شورش کی خود نوشت سوانح ہیں۔ ان میں بوئے گل کی ضخامت ۵۳۴ صفحات، پس دیوار زنداں ۴۳۲ صفحات اور موت سے واپسی ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴) گفتنی ناگفتنی (شاعری) (۵) تحریک ختم نبوت (۶) اقبال اور قادنیت (۷) فیضان اقبال (۸) سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۹) الجماد و الجماد (شاعری) (۱۰) حسین شہید سہروردی (۱۱) دہلی چلو (۱۲) شب جائے کہ من بودم (۱۳) اس بازار میں (۱۴) ظفر علی خان (۱۵) تمغہ خدمت (۱۶) نورتن (۱۷) حمید نظامی (۱۸) میاں افتخار الدین (۱۹) عجمی اسرائیل (۲۰) اسلام کے غدار (۲۱) اقبالی مجرم (۲۲) چہ قلندرانہ گفتم (شاعری) (۳۲) اقبال پیامبر انقلاب (۲۴) چہرے (۲۵) فن خطابت (۲۶) ابوالکلام آزاد

ادب و صحافت کا یہ درخشندہ ستارہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو غروب ہوا۔ آپ کی قبر دل فیروز روڈ بالمقابل باغیچی چراغ شاہ سعدی پارک قبرستان میانی صاحب میں واقع ہے۔

اختر شیرانی

محمد داؤد خاں اختر شیرانی راجپوتانہ (بھارت) کی ایک چھوٹی سی ریاست ٹونک میں ۴ مئی ۱۹۰۵ء کو پٹھانوں کے ایک معزز خاندان "شیرانی" میں پیدا ہوئے۔ افغانوں کی روایت کے مطابق ان کے مورث اعلیٰ ملک قیس عبدالرشید کے پڑپوتے کا نام "شیرانی" تھا۔ چنانچہ اس کی اولاد افغانوں میں قبیلہ شیرانی یا شیرانی خیل کے نام سے معروف ہے۔ اختر شیرانی کے والد حافظ محمود شیرانی کی شخصیت میں قدرت نے بے شمار اوصاف اور فضائل جمع کر دیئے تھے۔ وہ بے مثل مدرس، اعلیٰ پائے کے مورخ و محقق اور عالی مرتبہ نقاد تھے۔

اختر شیرانی کی ابتدائی تعلیم ٹونک ہی میں ہوئی۔ ان کے والد نے انہیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کیلئے بہترین اتالیق مقرر کئے۔ یہ زمانہ ٹونک میں شعر و ادب کے فروغ کا زمانہ تھا۔ ہر طرف شاعری کا چرچا تھا۔ ابتدائی تربیت اور شاعرانہ ماحول نے اختر کو شعر و شاعری کی طرف راغب کیا اور انہوں نے اپنے استاد محمد صابر شاکر کی محبت میں گیارہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا۔

۱۹۲۱ء میں اختر شیرانی لاہور اورینٹل کالج میں داخل ہوئے اور یہاں سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ طبیعت کے لاابالی پن کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے البتہ انگریزی زبان و ادب کا مطالعہ ذاتی طور پر جاری رکھا اور مضمون نگاری و شاعری شروع کر دی۔ لاہور کے قیام نے ان کی شاعری کو جلا بخشی۔ یہاں معاشی بے فکری، شاعروں کی صحبت اور سحر آفرین ماحول نے ان کو عشق و عاشقی کی طرف مائل کیا۔ جلد ہی ان کا شہرہ لاہور کے حلقوں میں بطور

رومانی شاعر ہونے لگا۔ اس دور میں ان کی مختلف خواتین سلمیٰ، عذرا، شیریں، ریحانہ، شمسہ، زلیخا، لیلیٰ اور پروین وغیرہ سے جذباتی وابستگی رہی جس کے سبب ان کے رومانی رجحانات کی خوب پرورش ہوئی۔ یوں بھی اس وقت تک رومانویت نے اردو ادب میں ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی اور اختر اس تحریک کے علمبردار تھے۔

اختر شیرانی مختلف رسائل کے مدیر بھی رہے۔ ۱۹۲۸ء میں انہوں نے اپنا ذاتی رسالہ "بہارستان" شروع کیا۔ لیکن اختر اس کے بھرپور توجہ نہ دے سکے جس کی وجہ سے جلد ہی بند ہو گیا۔ اس کے بعد خیالستان جاری کیا وہ بھی زیادہ دیر نہ چل سکا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے ماہنامہ "رومان" نکالا لیکن یہ بھی صرف آٹھ ماہ بعد بند ہو گیا۔ غرض یہ ثابت ہو گیا کہ کسی رسالے کی ادارت اختر کے بس کا روگ نہیں۔ البتہ اس اثناء میں ان کی شاعری کی دھوم مچ چکی تھی اور ان کا شمار ملک کے چوٹی کے شعراء میں ہونے لگا تھا۔

۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی اورینٹل کالج کی ملازمت چھوڑ کر ٹونک چلے گئے اور اختر کو بھی نہ چاہتے ہوئے لاہور چھوڑنا پڑا۔ جنگ عظیم کے دوران وہ دوبارہ لاہور آ گئے اور مولانا تاجور نجیب آبادی کے رسالے "شاہکار" کی ادارت سنبھال لی لیکن اختر پابندی برداشت نہ کر سکتے تھے لہٰذا تھوڑے ہی عرصے بعد شاہکار سے الگ ہو گئے۔ اس عرصے میں انہوں نے اپنے کلام کے مجموعے "نغمہ حرم"، "شعرستان" صبح بہار، اخترستان اور طیور آوارہ کے نام سے شائع کیے۔ عمر کے آخری حصے میں کثرت مے نوشی کے سبب ان کی صحت بہت گر گئی تھی اور عرصہ دراز تک صاحب فراش رہے۔

اختر شیرانی کا شعری اور نثری سرمایہ درج ذیل ہے:

۱۔ نغمہ حرم (عورتوں اور بچوں کیلئے نظمیں)
۲۔ صبح بہار (رومانی نظموں کا پہلا مجموعہ)
۳۔ اخترستان (رومانی نظموں کا دوسرا مجموعہ)
۴۔ لالہ طور (رومانی نظموں اور سانیٹ کا مجموعہ)

۵۔ طیور آوارہ (غزل، گیت اور ماہیوں کا مجموعہ)
۶۔ شہناز (نظموں، غزلوں اور ماہیوں کا مجموعہ)
۷۔ شہرود (باقیات اختر)
۸۔ شعرستان (سانیٹ اور نظموں کا مجموعہ)
۹۔ پھولوں کے گیت (بچوں کی نظموں کا مجموعہ)
۱۰۔ ضحاک (سامی بے کے ایک ترکی ڈرامے کا ترجمہ)
۱۱۔ آئینہ خانے میں (افسانوی خاکے)
۱۲۔ جوامع الحکایات ولوامع الروایات (فارسی حکایات کا ترجمہ و تلخیص)
۱۳۔ دھڑکتے دل (طبع زاد اور ترجمہ افسانے)
۱۴۔ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ (اردو کے نوجوان ڈرامہ نگاروں کی تخلیقات)
۱۵۔ اختر و سلمیٰ کے خطوط (سلمیٰ اور اختر کی باہمی مراسلت)

اختر شیرانی اردو ادب میں رومانی شاعروں کے نمائندوں میں اعلیٰ ترین تخلیق کار ہیں۔ شاعری میں رومانی رجحان سب سے زیادہ واضح اور دلاویز شکل میں انہی کے کلام میں ملتا ہے۔ انہیں جو چیز دوسرے رومان نگاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ حسن سے اکتساب کیف کا بے ساختہ جذبہ ہے۔ اختر نے حسن اور جمالیات کی پرستش نہیں کی بلکہ اس سے لذت اور کیف کا اکتساب کیا ہے۔ اختر کی رومانی شاعری اداس اور درد آفریں نہیں بلکہ پرکیف اور رجائی ہے۔

اختر شیرانی کا انداز بیان بڑا اہم ہے۔ انہوں نے شعری ہیئت میں حقیقتاً ایک جداگانہ راستہ اختیار کیا ہے۔ مغربی سانیٹ کو ہلکے پھلکے انداز میں اختیار کر کے انہوں نے اردو شاعری کو نئی ہیئت دی ہے۔ اختر شیرانی نے واعظانہ موضوعات میں ترنم اور کیف پیدا کیا ہے۔ انہوں نے اردو نظم میں داخلی جذبوں کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے جیتی جاگتی عورت کو نظم میں اہم موضوع کی حیثیت دی اور نظم کو خارج سے باطن کی طرف موڑ دیا۔

انہوں نے گیت میں تخلیقی اظہار کیا تو مفارقت سے ابھرنے والی یادوں کو اہمیت دی۔ ان کی شاعری پڑھنے والوں کے دلوں پر مترنم آبشار کی طرح گرتی ہے اور چودھویں کے چاند کی مانند ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔

اردو ادب کیلئے اختر شیرانی کی لازوال خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

اختر شیرانی کا انتقال ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوا اور آپ کو قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا گیا ہے۔ آپ کی قبر بہاولپور روڈ پر واقع ہے۔

احسان دانش

احسان الحق نام احسان تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام قاضی دانش علی تھا اسی مناسبت سے اپنا نام احسان دانش لکھتے تھے۔ آپ کا تعلق صدیقی خاندان سے تھا۔ احسان دانش ۱۹۱۴ء میں قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی دانش علی نہروں کی کھدائی کرنے والے ٹھیکیداروں کے ساتھ بطور مزدور کام کرتے تھے۔ دانش کا بچپن انتہائی عسرت و تنگدستی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز قرآن کی تعلیم سے ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں پرائمری کا امتحان پاس کیا آپ کے استاد منشی عبدالرحیم جلال آبادی نے آپ کی صلاحیتوں کو جلادینے میں بھرپور معاونت کی۔

احسان دانش کے والدین کی یہ بھرپور خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے چشم و چراغ کو زیور تعلیم سے۔ آراستہ کریں لیکن شومئی قسمت وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے اور غربت و افلاس نے ان کے اس خواب کو چکنا چور کر دیا۔ اور احسان دانش والدین کی غربت کے سبب پرائمری کے بعد مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ تعلیم کی کمی کے باوجود دانش بچپن ہی سے موسیقی اور شاعری کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ موسیقی سے دلچسپی کی بدولت بڑے خوش الحان واقع ہوئے ہے۔ ان کی اس خوبی نے انہیں آئندہ زندگی میں مقبول و معروف بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

پرائمری کے بعد ایک دفتر میں کلرک کی ملازمت اختیار کر لی لیکن تنخواہ نہ ملنے کے سبب جلد ہی اس کو ترک کر دیا اور ایک ان پڑھ بیوپاری کی

دوکان پر پانچ روپے ماہوار پر ملازمت اختیار کرلی۔ اس دوکان سے فارغ ہونے کے بعد اپنے والد کے ساتھ نہروں کی کھدائی کرنے والے مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد خانساماں کی نوکری کی اور کچھ عرصہ تلاش معاش کے سلسلے میں دلی بھی رہے لیکن والدین اور وطن کی یاد انہیں دوبارہ واپس لے آئی۔ اپنے کچھ محلے داروں کے ساتھ کاندھلہ سے روزی کی تلاش میں لاہور آ گئے اور معماروں کے ساتھ اینٹ، گارا اٹھانے کی مزدوری شروع کر دی۔ پنجاب یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) کی لاہور کی تعمیر میں آپ نے بطور مزدور حصہ لیا۔ اسی دور میں رات کی چوکیداری بھی کی۔ دھنی رام روڈ پر منشی سراج دین کی دوکان پر منشی بھی رہے۔ گورنر ہاؤس میں نائب باغبان مقرر ہوئے۔ ریلوے پلور ہاؤس میں چپراسی رہے۔ گیلانی بک ڈپو پر ملازم رہے۔ غرضیکہ احسان دانش نے ہر طرح کی مزدوری کی اور اپنی زندگی کے شب و روز انتہائی محنت و مشقت میں گزارے اور راحت و آرام کو ترستے رہے۔ آخر کار احسان دانش نے ایبک روڈ پر مکتبہ دانش کے نام سے کتابوں کی دوکان کھول لی اور آخر عمر تک اسی سے وابستہ رہے۔

احسان دانش کی شاعری میں زندگی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک بحر بیکراں ہے۔ جس کی موجیں حد نگاہ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جس میں سیلاب ہے طوفان ہیں جو کسی پل نہیں تھمتے کسی رکاوٹ سے اس کا اضطراب کم نہیں ہوتا۔ حتی کہ موت جیسی قوت جس کے سامنے دنیا کی ہر طاقت سر تسلیم خم کرتی ہے وہ بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔ بحیثیت مسلمان وہ اسلام کے دل و جان سے شیدائی تھے۔ احسان دانش کی شخصیت عمدہ اور پاکیزہ نظریات کا مرکب تھی۔ وہ بہت شگفتہ، بردبار، حلیم الطبع اور خود دار انسان تھے۔

احسان دانش کے علمی و ادبی سرمائے میں ان کی درج ذیل نثری اور شعری تصانیف ان کی اعلیٰ فکر، مشاہدے کی گہرائی اور وسعت مطالعہ کی ترجمان ہیں۔

نثری تصانیف:

۱۔ جہاں دانش

یہ کتاب ان کی سوانح عمری ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی زندگی کے تمام نشیب و فراز اور ادبی رویوں کا احاطہ کیا ہے۔

۲۔ لغات الاصلاح

لغات الاصلاح میں آپ نے اردو کے ایسے پانچ ہزار غلط الفاظ کی تحقیق و تصحیح کی ہے جو روزمرہ محاورات اور تقریر و تحریر میں لکھے اور بولے جاتے ہیں۔

۳۔ دستور اردو

اردو نثر کے تحسینی و تالیفی کارناموں اور روزمرہ کے اغلاط کی اصلاح و تحقیق کی، جو عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں اس طرح آپ نے تحریر کو فصاحت کے معیار سے گرنے کی طرف توجہ دلا کر بہت بڑا علمی فریضہ انجام دیا۔

۴۔ خضر عروض

علم عروض کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے لکھی گئی۔

۵۔ اساس الامثال

یہ ضرب الامثال اور محاورات پر لکھی گئی تحقیقی کتاب ہے۔

۶۔ فرہنگ دانش

یہ اردو لغت ہے۔

۷۔ توضیح غالب

اس کتاب میں غالب کی شاعری کی جامع وضاحت کی گئی ہے۔

۸۔ آئینہ تذکیر و تانیث

مذکر مونث کے اصول وضع کیے گئے ہیں۔

شعری تصانیف

احسان دانش کی اصل پہچان ان کی شاعری ہے ان کی شعری کتابوں میں درج ذیل کتب منظر عام پر آکر خوب داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

(۱) نوائے کارگر (۲) چراغاں (۳) آتش خاموش (۴) جادۂ نو (۵) نصیر فطرت (۶) شیرازہ (۷) مقامات (۸) زخم و مرہم (۹) گورستان

غیر مطبوعہ کلام:

(۱) قصر نگاراں (۲) فصیل سلاسل (۳) شمشیر و سناں اول (۴) قفس رنگ (۵) کشت زخم

احسان دانش اردو شاعری کی روایت میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جدید اردو شاعری کو آگے بڑھانے میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے معاملات مسائل کو بڑی خوبی سے شعروں کے سانچے میں ڈھالا ہے اور اس اعتبار سے ان کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ انہوں نے زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور ایک واضح نقطہ نظر کو بنیاد بنا کر اس پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ تفصیل اور جزئیات کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع سب سے زیادہ توجہ طلب ہے۔ ان کی شاعری میں انسانیت کی آواز سنائی دیتی ہے۔

احسان دانش کے احاطہ فکر اور مشاہدے سے بالعموم وہ مناظر اور واقعات غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں جو ایک مزدور اور پست حال طبقے کے فرد کی حیثیت سے ان کی روزانہ زندگی کے تلخ تر حقائق اور تجربات کا لازمی بن چکے تھے۔ ان کی بیشتر نظمیں مزدور اور عام انسان کے حالات زندگی اور محسوسات کو پیش کرتی ہیں۔ احسان دانش نے مزدور کی زندگی کے ہر پہلو اس کی معاشرت، تہذیب و تمدن، اقتصادی بدحالی کی حقیقت افروز عکاسی کی ہے۔

احسان دانش کی شاعری سے محنت کا درس ملتا ہے۔ ان کے نظریہ حیات کی بنیاد ہی حوصلہ مندی اور جگر داری ہے۔ وہ انسان کو زندگی کی مشکلات سے مردانہ وار لڑنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں اور اس کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

عزم و ہمت کے اس عظیم پیکر اور شاعر مزدور کا انتقال ۲ مارچ ۱۹۸۲ء میں ہوا آپ کی قبر طاہر بندگی روڈ قبرستان میں مسجد قادری بٹالہ شریف والی کے سامنے واقع ہے۔

احسان دانش کا جسد خاکی ہم سے جدا ہو چکا ہے لیکن ان کے نظریات آج بھی تر و تازہ ہیں۔

استاد دامن

چراغ دین نام اور دامن تخلص تھا۔ آپ ۴ ستمبر ۱۹۱۱ء میں چوک متی لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میراں بخش درزیوں کا کام کرتے تھے۔ بچپن ہی میں استاد دامن نے گھریلو حالات کے پیش نظر تعلیم کے ساتھ ٹیلرنگ کا کام بھی کرنا شروع کیا۔ جب استاد دامن کی عمر تیرہ سال ہوئی تو ان کا خاندان چوک متی سے باغبانپورہ منتقل ہو گیا۔ انہوں نے باغبانپورہ میں درزیوں کی دوکان شروع کی اور دیو سماج سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ کو شاعری کا شوق تو بچپن ہی سے تھا لیکن باقاعدہ طور پر شاعری کا آغاز میٹرک کے بعد کیا اور مختلف جلسوں اور مشاعروں میں اپنا پنجابی کلام سنانے لگے۔ ۱۹۴۰ء میں میاں افتخار الدین کی صدارت میں ہونے والے میونسپل کمیٹی لاہور کے اجلاس میں کمیٹی کی کارکردگی پر تنقیدی نظم پیش کی اور خوب داد حاصل کی۔ ان کے بعد ان کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہو تا گیا اور انہوں نے سیاسی جلسوں میں بھی نظمیں پڑھنے کا آغاز کیا۔ آپ کی شاعری زبان زد عام و خاص ہو گئی اور آپ ہر مکتبہ فکر کے لوگوں میں ہر دلعزیز شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ پاکستان کی آزادی کے بعد ہونے والے فسادات میں آپ کی دوکان لوٹ لی گئی جس کے سبب آپ زبردست مالی بحران کا شکار ہو کر باغبانپورہ سے باشاہی مسجد کے قریب حجرے میں منتقل ہو گئے۔ آپ کے پاس کل اثاثہ ان کی چند کتابیں تھیں۔ ۱۹۴۹ء میں آپ نکسالی گیٹ میں واقع اس حجرے میں منتقل ہو گئے جس میں حضرت شاہ حسین (مادھو لال حسینؒ) بھی مقیم رہے تھے اور تادم مرگ یہی حجرہ ان کا مسکن ٹھہرا۔ اسی دور میں استاد دامن کی شادی ہوئی لیکن کچھ ہی

عرصہ بعد ان کا کم سن بیٹا اور بیوی انتقال کر گئے اور پھر تمام عمر شادی نہ کی۔

استاد دامن نے جب شاعری کا آغاز کیا تو ہمدم تخلص کرتے تھے لیکن جلد ہی اسے ترک کر کے "دامن" تخلص کرنے لگے۔ پنجابی شاعری میں استاد ہمدم کے شاگرد ہوئے اور ان کی شاگردی کو اپنے لئے باعث فخر تصور کرتے تھے۔ دامن نے پنجابی شاعری کی فنی خوبیوں پر ملکہ رکھنے کی بدولت اہل علم و فن افراد سے استاد کا خطاب حاصل کیا۔

استاد دامن مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور مظلوموں کے شاعر تھے۔ انہوں نے ان طبقوں کی حمایت اور حقوق کیلئے آواز اٹھائی اور ہمیشہ استحصالی طبقوں کی مذمت کرتے رہے۔ انہوں نے پنجابی زبان و ادب کے فروغ کیلئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں اور ادبی تنظیم "پنجابی ادبی سنگت" کی بنیاد رکھی اور اس تنظیم کے سیکرٹری رہے۔

استاد دامن کی سب سے بڑی خوبی ان کی فی البدیہہ گوئی تھی۔ خدا نے انہیں ایسے ذہن اور فکر سے نوازا تھا کہ وہ موقع کی مناسبت سے چند لمحوں میں اشعار کی مالا پرو دیتے تھے اور حاضرین کیلئے تسکین کے ساتھ ساتھ حیرت کے اسباب بھی پیدا کر دیتے تھے۔ آزادی کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے دلی میں منعقدہ مشاعرے میں یہ فی البدیہہ نظم پڑھی:

جاگن والیاں آج کے لٹیا اے
سوئے تسی وی او، سوئے اسیں وی آں
لالی اکھیاں دی پئی دس دی اے
روئے تسی وی او، روئے اسیں وی آں

اس نظم کی سماعت پر حاضرین مشاعرہ بے اختیار رونے لگے۔ اس وقت مشاعرے میں پنڈت جواہر لعل نہرو (وزیراعظم بھارت) بھی موجود تھے، انہوں نے استاد دامن سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مستقل طور پر بھارت میں قیام فرمائیں لیکن جواب دیا کہ اب میرا وطن پاکستان ہے میں لاہور ہی میں رہوں گا بے شک جیل ہی میں کیوں نہ رہوں۔ اس محب وطن شاعر نے ساری

زندگی کسمپرسی کی حالت میں گزاری مگر مرتے دم تک اپنے وطن سے محبت کے گیت گاتا رہا۔ اس دھرتی کو نفرتوں' بے ایمانیوں اور عیاریوں سے پاک کرنے کیلئے محبتوں کے پھول بکھیرتا رہا اور ان برائیوں کی اعلانیہ نشاندہی اور مذمت کرتا رہا۔

آزادی کے بعد رونما ہونے والے سیاسی زوال پر سیاست دانوں کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان پر بھرپور تنقید کی اور عوامی شعور کو بیدار کیا۔ وہ وطن عزیز کی ترقی کا خواہاں تھا۔ اس ملک کے دن بدن زوال کی وجہ سے اس کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ ملکی و ملی پستی کی خوبصورت تصویر کشی کرتے ہوئے استاد دامن کہتے ہیں:

بھج بھج کے وکھیاں چور ہوئیاں
مڑ کے ویکھیا تے کھوتی بوہڑ بیٹھاں

استاد دامن اپنی شاعری میں زبان کے تکلف سے ہٹ کر اپنے خیالات اور نظریات کے پرچار پر زیادہ زور دیتے تھے۔ وہ عام بول چال کی زبان میں اپنا خیال پیش کر کے سامعین و قارئین کے دلوں کی گہرائیوں کو چھو لیتے تھے۔ یہی ان کا مدعا تھا اور یہی ان کا مقصد حیات کہ بات دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔ اس مقصد میں انہیں بھرپور کامیابی حاصل ہوئی۔

استاد دامن نے پنجابی شاعری کے ذریعے پنجاب کی ثقافت کے تمام رنگوں کو اجاگر کیا۔ پنجاب کی ثقافت سے مزین ان کی لوک شاعری نے لوگوں کو خصوصی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کے لہجے میں طنز اور مزاح تھا۔ انہوں نے مزاح کے انداز میں لوگوں کو معاشرتی برائیوں سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہمیشہ سچ کی تائید اور جھوٹ کی تردید کی۔

استاد دامن کی شاعری میں لوک رنگ' تصوف' سیاسی موضوعات' روایتی موضعات کے علاوہ روزمرہ زندگی کا ہر رنگ ملتا ہے۔ ان کی شاعری حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کی خوبیوں سے مالا مال ہے اور انسانی زندگی کی خوبصورت عکاس ہے۔

استاد دامن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اس عہد کے عظیم اور منفرد شاعر فیض احمد فیض نے ایک نجی محفل میں یہ کہہ کر کیا کہ میں پنجابی میں صرف اس لیے شاعری نہیں کرتا کہ پنجابی میں شاہ حسین، وارث شاہ اور بلھے شاہ کے بعد استاد دامن جیسے شاعر موجود ہیں۔ بلاشبہ استاد دامن پنجابی شاعری کا ناز ہیں اور ان کا شعری سرمایہ پنجابی ادب کا انمول خزانہ ہے۔

استاد دامن کی ایک خوبی ان کے حافظے کی تیزی تھی۔ ان کی یادداشت بہت زیادہ تھی۔ جب قیام پاکستان کے بعد کچھ شرپسند عناصر نے ان کی ذاتی لائبریری اور دوکان کو آگ لگا دی تو ان کی ذاتی تحریریں، ہیر کا مسودہ جسے وہ مکمل کر رہے تھے اور دوسری کتابیں جل کر راکھ ہو گئیں تو انہوں نے دل برداشتہ ہو کر اپنا کلام صفحات پر محفوظ کرنا چھوڑ دیا اور صرف اپنے حافظے پر بھروسہ کرنے لگے۔ اس وجہ سے ان کا زیادہ تر کلام ضائع ہو گیا لیکن ان کی یاد میں قائم ہونے والی استاد دامن اکیڈمی کے عہدیداروں نے بڑی محنت و کاوش سے ان کے مختلف ذہنوں میں محفوظ اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے کلام کو یکجا کر کے "دامن دے موتی" کے نام سے ایک کتاب ہمارے سامنے پیش کی۔ "استاد دامن اکیڈمی" کی اس کاوش سے جہاں پنجابی ادب کو بہت فائدہ ہوا اور اس کے شعری سرمائے میں اضافہ ہوا وہاں شعری ذوق رکھنے والے افراد کو بھی استاد دامن کی شاعری سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ استاد دامن نے فلموں کیلئے بھی گیت لکھے۔ ان کا فلم "غیرت تے نشان" میں شامل یہ گیت بہت مشہور ہوا۔

مینوں دھرتی کلی کرا دے میں نچاں ساری رات
نہ میں سونے دی نہ میں چاندی دی میں پتل بھری پرات

استاد دامن، پنجابی کے علاوہ اردو، سنسکرت، ہندی اور انگریزی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے لیکن انہوں نے وسیلہ اظہار اپنی ماں بولی زبان پنجابی ہی کو بنایا۔ استاد دامن بلھے شاہ اکیڈمی کے سرپرست، مجلس شاہ حسین کے سرپرست اور ریڈیو پاکستان شعبہ پنجابی کے مشیر بھی تھے۔ ان مختلف حیثیتوں

میں انہوں نے پنجابی زبان و ادب کی ناقابل فراموش خدمت سرانجام دی۔

عوام سے پیار کرنے والا یہ عوامی شاعر ۳ دسمبر ۱۹۸۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا اور اپنی وصیت کے مطابق مزار مادھولال حسین کے احاطے میں واقع قبرستان میں دفن ہوا۔

استاد دامن اپنے بکھیرے ہوئے قیمتی موتیوں اور منفرد لہجے کے پنجابی شاعر کی حیثیت سے تاابد زندہ و تابندہ رہیں گے۔

maablib.org

ڈاکٹر تصدق حسین خالد

ڈاکٹر تصدق حسین خالد مشہور تاریخی بھٹی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کا آبائی وطن بٹالہ ضلع گورداسپور تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد کا پیشہ سپاہ گری تھا۔ آپ ۱۹۰۱ء میں بمقام پشاور میاں محمد بخش کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کی زندگی کا ابتدائی دور راولپنڈی میں گزرا کیونکہ آپ کے والد میونسپل کمیٹی راولپنڈی میں ملازم تھے۔ آپ نے ۱۹۱۷ء میں راولپنڈی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ایف۔ اے کا امتحان ۱۹۱۹ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا۔ گریجوایشن کے بعد گھر کے نامساعد حالات کے پیش نظر تعلیم کا سلسلہ موقوف کر کے بٹالہ چلے گئے اور بٹالہ ہائی سکول میں انگریزی کے استاد مقرر ہوگئے۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی شادی راولپنڈی کے ایک خوشحال گھرانے کی بیٹی سلمیٰ محمودہ سے ہو گئی۔ ان کی بیوی بعدازاں سلمیٰ تصدق حسین کے نام سے معروف ہوئیں اور تحریک پاکستان کی سرگرم کارکن رہیں۔ ایک مرتبہ پھر تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور شادی کے بعد ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا اور پنجاب سروس کے امتحان ای۔ اے۔ سی میں ریکارڈ نمبر حاصل کر کے مجسٹریٹ ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۲ء تک مختلف اضلاع میں اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۲ء کے بعد حکومت برطانیہ سے فکری و نظری اختلافات کی بناء پر آپ کو اس ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

۱۹۳۲ء ہی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے انگلستان روانہ ہوئے۔ قیام لندن کے دوران آپ نے بیرسٹری کے تین سالہ کورس کو صرف نو ماہ میں

ختم کر کے کامیابی حاصل کی اور مولانا الطاف حسین حالی پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۳۵ء میں وطن واپس آ گئے اور لاہور میں وکالت کی پریکٹس شروع کر دی۔ آپ نے اس پیشے میں اپنی قابلیت اور فنی مہارت کے خوب جوہر دکھائے اور تھوڑے ہی عرصے میں آپ کا شمار نامور وکلاء میں ہونے لگا۔ فوجداری قوانین میں آپ قابلیت مسلمہ تھی۔ قیام پاکستان کے وقت آپ لاہور ہی میں تھے اور آپ نے اپنی بیوی سلمیٰ تصدق حسین کے ساتھ مل کر مہاجرین کو خوراک، رہائش، لباس اور دیگر ضروریات کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان کی دل کھول کر مالی مدد کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ مختلف یونیونوں کے عہدیدار بھی رہے اور آپ نے یہ فرائض بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیئے۔

آپ کی سیاسی و سماجی خدمات کے ساتھ ادبی خدمات بھی ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ تصدق حسین خالد آزاد نظم کے بانیوں میں سے ہیں۔ آزاد نظم کی اردو میں ابتداء سے متعلق تو مختلف آراء ہیں لیکن اس روایت کو باقاعدہ طور پر آپ نے مربوط کیا اور ایک بھرپور و توانا شاعری کی بنیاد رکھی۔ خالد نے آزاد نظم کے تجربات کا آغاز زمانہ طالب علمی سے کیا اور ۱۹۲۶ء میں فیروزپور کے مشاعرے میں آزاد نظم سنائی جسے خوب سراہا گیا۔ ان کی شاعری کی بنیادی خوبی ان کی تمثال نگاری ہے۔ انہوں نے مناظر فطرت کی خوبصورت تمثیلیں پیش کی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظمیں "میری روح"، "چاند آج کی رات نہیں نکلا" اور "فوارہ" اہم ہیں۔

خالد جوش زندگی کا انبساطی شاعر ہے اور اس کی شاعری میں جذبے کی شادابی نمایاں طور پر موجود ہے۔ وہ فطرت پرست شاعر ہے اور فطرت ہی کی علامتیں، استعارے، تشبیہات اور تمثالیں پیش کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں موجود مقامی رنگ ان کی سرزمین وطن سے محبت کا ثبوت ہے۔

ان کی شعری تصنیف "سرودنو" بہت مقبول ہوئی جسے بعدازاں ۲۵ نظموں کے اضافے کے ساتھ "لامکاں تالامکاں" کے نام سے شائع کیا گیا۔

آپ کی نثری تصانیف ہیں آسکر وائیلڈ کے ڈراموں کا ترجمہ اور کارل چیک کی تصنیف کے علاوہ دیگر تراجم بھی شامل ہیں۔

اس عظیم شاعر اور کامیاب انسان نے ۱۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو لاہور میں وفات پائی۔ آپ کی قبر شیر شاہ ولی قبرستان اچھرہ کے شمال مغربی گوشے میں ہے۔ آپ کی قبر کے ساتھ مسجد اور ڈسپنسری بھی واقع ہے۔

maablib.org

چراغ حسن حسرت

چراغ حسن حسرت جون ۱۹۰۲ء موضع عیار جاگیر سٹھائی (آزاد کشمیر) میں بدرالدین بدر کے گھر پیدا ہوئے۔ حسرت نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ آپ کے والد عمدہ شعری ذوق رکھتے تھے اس طرح حسرت کی نشوونما ادبی ماحول میں ہوئی۔ گھر پر حسرت نے شیخ سعدی شیرازی کی گلستاں' بوستان کے علاوہ متعدد اردو' عربی اور فارسی کی کتب پڑھیں۔ حسرت کی عمر جب دس برس ہوئی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی تربیت کی ذمے داری کا فریضہ ان کے نانا حسن علی ادا کرنے لگے۔ حسرت کے نانا بھی ادبی شخصیت تھے اس طرح ان کی پرورش اور ادبی ذوق کی نشوونما بدستور جاری رہی مگر والد کی وفات کے صرف تین سال بعد حسن علی بھی انتقال فرما گئے۔ نانا کے انتقال کے بعد گھر کی تمام تر ذمہ داری حسرت کے ناتواں کندھوں پر آ پڑی۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ملازمت کی تلاش شروع ہو گئی۔

حسرت کی سب سے پہلی ملازمت پونچھ جیل میں کلرک کی تھی۔ یہاں پر انہوں نے کتابت میں ملکہ حاصل کیا اور خطاطی کی باریکیوں کو سیکھا اور سمجھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ نوکری چھوڑ کر ایک پرائمری سکول میں استاد ہو گئے۔ سکول کی تنخواہ چونکہ بہت کم تھی اس لیے گھر سے آٹے کی بوری کندھوں پر اٹھا کر سکول لے آتے۔ بچوں کو تعلیم دینے کے ساتھ آٹا بھی بیچتے رہتے اور اس طرح اپنے گھر کا خرچ چلاتے۔ شملہ کے ایک سکول میں اردو' فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ شملہ میں انہیں اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کا موقع ملا۔ یہاں پر حسرت نے منشی فاضل' ادیب فاضل' میٹرک اور ایف۔ اے کے امتحانات پاس

کئے مگر بے حد خواہش کے باوجود گریجوایشن نہ کر سکے۔

حسرت شعبہ تدریس سے مطمئن نہ تھے چنانچہ ۱۹۲۵ء میں اس پیشے کو ہمیشہ کیلئے خیرباد کہہ دیا اور کلکتہ چلے گئے۔ کلکتہ میں ان کی زندگی کا وہ صحافتی دور شروع ہوا جس کی بدولت انہیں اپنی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے بھرپور مواقع ملے۔ حسرت نے یہاں پر اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اخبار "عصرجدید" میں بطور سب ایڈیٹر کیا۔ صرف ایک ماہ کی محنت اور اپنی صلاحیتوں کے بل پر اس اخبار کے مدیر ہو گئے کچھ عرصہ بعد "عصرجدید" کی ادارت سے الگ ہو گئے اور برج لال بابو (فائن آرٹ پریس والے) کے ساتھ مل کر "آفتاب" کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ روزنامہ "نئی دنیا" میں "کوچہ گرد" کے قلمی نام سے کالم "کلکتہ کی باتیں" اور "کولمبس" کے قلمی نام سے کالم نئی دنیا لکھنا شروع کیا۔ آپ نے ان کالموں میں اپنی ذہانت و فطانت کے وہ جوہر دکھائے کہ حسرت کی شہرت کلکتہ سے لاہور پہنچ گئی۔

ماہنامہ "زمیندار" لاہور کا معروف اخبار تھا۔ ۱۹۲۷ء میں زمیندار کے ادارتی اور کتابتی ملازمین نے مستعفی ہو کر روزنامہ "انقلاب" جاری کر لیا تو چراغ حسن حسرت، مولانا ظفر علی خان کی دعوت پر کلکتہ سے لاہور آ گئے اور "حکایات" کے نام سے اس اخبار کیلئے کام کرنے لگے۔ اخبار "زمیندار" چونکہ مالی بحران کا شکار تھا اس لیے کچھ عرصہ بعد اس سے الگ ہو کر چند احباب کے ساتھ مل کر اپنا ذاتی اخبار "انصاف" کے نام سے جاری کیا۔ یہ اردو کا پہلا مکمل اخبار تھا۔ جو لاہور سے شائع ہوا۔ یہ اخبار کچھ عرصہ چلنے کے بعد بند ہو گیا لیکن اردو صحافت کو نئے ادوار سے روشناس کروا گیا اور آج کا صحافتی انقلاب بھی چراغ حسن حسرت کے اس پہلے مکمل اخبار کا مرہون منت ہے۔

"انصاف" بند ہونے کے بعد حسرت سید ممتاز علی اور امتیاز علی تاج کے ادارے دارالاشاعت پنجاب میں ملازم ہو گئے اور اس طرح بچوں کے رسالے "پھول" اور خواتین کے رسالے "تہذیب نسواں" کی ادارت میں شامل ہو گئے۔ زندگی کے چند سال یہیں گزارے اور بچوں کیلئے کچھ اچھی کتابیں

بھی لکھیں۔

اس ادارے کے بعد آپ روزنامہ "احسان" سے وابستہ ہو گئے۔ اس اخبار میں آپ نے "سند باد جہازی" کے قلمی نام سے کالم "مطائبات" (مزاح) لکھنا شروع کیا یہ کالم اس قدر مشہور ہوا کہ اس کے سامنے حسرت کی شہرت بھی ماند پڑ گئی۔ اس زمانے میں انہوں نے چند پروڈیاں اور مزاحیہ نظمیں بھی لکھیں۔ اسی دور میں انہوں نے ایک ہلکا پھلکا مزاحیہ ہفت روزہ "شیرازہ" بھی جاری کیا۔ یہ اپنی وضع کا واحد ادبی اور فکاہیہ رسالہ تھا۔ یہ رسالہ عوامی اور ادبی حلقوں میں ازحد مقبول ہوا اور کئی سال تک گاہے بگاہے چھپتا رہا۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک روزنامہ "احسان" سے وابستہ رہے۔ "احسان" سے الگ ہو کر چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر اخبار "شہباز" جاری کیا۔ یہ "احسان" سے زیادہ شگفتہ اور پرشکوہ اخبار تھا اس لئے جلد ہی مقبول ہو گیا۔ اسی سال یعنی ۱۹۳۷ء میں آپ کی شادی بھی ہوئی۔ "شہباز" کے بعد مجلس احرار کے اخبار "احرار" کی ادارت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ "احرار" کی بندش کے بعد ڈاکٹر ستیہ پال کے اخبار "نیشنل کانگرس" کے مدیر ہو گئے۔ اس اخبار میں اداریہ اور مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ اس اخبار کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی بدولت اس ادارہ سے الگ ہو گئے اور پطرس بخاری کے ساتھ دہلی جا کر آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے۔ نومبر ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۱ء کا وقت ریڈیو کی ملازمت میں گزارا۔ اس کے بعد پنجاب حکومت کے اخبار "پنچایت" کے مدیر مقرر ہوئے۔ اس اخبار میں وہ "دیپک" کے نام سے "شاعری" اور "الیاس ہارون" کے قلمی نام سے نثر لکھا کرتے تھے۔ اس کے بعد دوران جنگ عظیم فوج کے محکمہ تعلقات عامہ میں بھرتی ہو گئے اور "فوجی اخبار" جو دہلی ہی سے چھپتا تھا کی ادارت سنبھالی۔ فوج ہی کی طرف سے آپ کو سنگاپور بھیجا گیا اور وہاں آپ نے اردو روزنامہ "جوان" جاری کیا۔ فوج کی ملازمت کے سلسلے میں سنگاپور سے اردو کا روزنامہ جاری کرنا حسرت کا ایسا کارنامہ ہے جو اردو صحافت میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

۱۹۴۶ء میں فوج کی ملازمت سے مستعفی ہو کر پونچھ کشمیر میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد تقسیم ہند کے وقت لاہور آ گئے۔ یہاں آ کر ہفت روزہ "مہاجرین" اور روزنامہ "امروز" کے مدیر ہو گئے۔ روزنامہ امروز میں حسرت نے "حرف و حکایت" کے نام سے مزاحیہ کالم لکھنا شروع کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ حسرت نے "امروز" میں انقلابی تبدیلیاں کیں اور اسے اپنے دور کا ممتاز اخبار بنایا۔ امروز سے مستعفی ہونے کے بعد کراچی ریڈیو' امریکن پبلشنگ کمپنی اور روزنامہ نوائے وقت سے وابستہ رہے۔

چراغ حسن حسرت گوناں گوں خوبیوں کے مالک تھے۔ صاحب طرز انشاء پرداز' منفرد صحافی اور بے باک طنز و مزاح نگار تھے۔ حسرت تاریخ' منطق' فلسفہ اور ادب جیسے موضوعات پر گہری معلومات رکھتے تھے۔ انہوں نے شاعری بھی کی اور شخصیت نگاری بھی۔ جن شخصیتوں کا انہوں نے تجزیہ کیا ان کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ انہوں نے بطور صحافی اپنے قلم سے صحافت کو نئے دور میں داخل کیا اور آج کی صحافت کی بنیاد رکھنے والے حسرت ہی تھے۔ چراغ حسن حسرت نے بطور شاعر انسان کے لطیف جذبات مہر و محبت اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والی خوشی اور الم کے احساسات کو بھرپور انداز سے بیان کیا ہے۔ ان کی غزل کی بنیادی خوبی تغزل ہے۔ ان کی غزلیات کا سرمایہ زیادہ نہیں مگر جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے وہ کیفیت کے اعتبار سے بے حد گرانقدر ہے۔ ان کی یہ غزل بڑی مقبول ہے۔

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا
غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا
اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

اس پوری غزل کے تمام اشعار میں ایک سلگتی سی حرارت دکھائی دیتی

ہے۔ الفاظ سادگی کے باوجود دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

صحافی کے طور پر ان کی تحریریں ان کی علمیت' قابلیت اور زور قلم کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ صحافت ایک ایسا فن ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور زمانے کی روش کو جتنا ایک صحافی سمجھتا ہے شاید کوئی دوسرا سمجھتا ہو۔ کسی بھی صحافی کی کامیابی کا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ سیاسی و سماجی' ملکی و ملی' معاشی و معاشرتی' تعلیمی و تمدنی اور اخلاقی و عمرانی پہلوؤں کے باریک گوشوں سے آشنا ہو۔ حسرت ان تمام خوبیوں سے مالا مال تھے۔ انہوں نے اردو صحافت میں تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ لطافت و تاثریت بھی بدرجہ وافر سمودی جس سے اردو صحافت میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حسرت کی قائم کردہ اردو صحافت کی بنیادوں پر آج اردو صحافت کی بلند و بالا عمارت کھڑی ہے۔

چراغ حسن حسرت کا نثری سرمایہ ان کے حکایات اور اداریوں کے علاوہ درج ذیل کتب ہیں:

۱۔ مردم دیدہ (خاکے)
۲۔ کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین
۳۔ کشمیر
۴۔ دو ڈاکٹر (خاکے)
۵۔ سرگذشت اسلام
۶۔ قائداعظم
۷۔ جغرافیہ پنجاب
۸۔ تاریخ اسلام
۹۔ بغاوت عرب اور کرنل لارنس .
۱۰۔ مضامین حسرت
۱۱۔ جدید جغرافیہ (خاکے)
۱۲۔ پربت کی بیٹی

ان کتب میں سے کیلے کا چھلکا اور دوسرے مضامین' مردم دیدہ اور پربت کی بیٹی نے خاص شہرت حاصل کی۔ ان کی کتاب "کیلے کا چھلکا" اور دوسرے مضامین بہت مقبول ہوئی۔ اس میں حسرت کے تیرہ مضامین' افسانے اور خاکے شامل ہیں جو زیادہ تر انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادب پاروں سے ماخوذ ہیں۔ مگر اخذ اتنا رواں ہے کہ تخلیق کا گماں ہوتا ہے۔

پربت کی بیٹی ہندوستان قدیم کی چھ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہانیاں تمام تر مہابھارت اور کالیداس کے ڈراموں سے لی گئی ہیں اور نہایت دلچسپ ہیں۔ حسرت نے اس کتاب میں اپنی انشاء پردازی کا پورا کمال دکھایا ہے۔ یہ کتاب عربی فارسی کے ثقیل اور بوجھل جملوں سے خالی' سہل اور آسان الفاظ سے بھری ہوئی' تشبیہیں لاجواب' مناظر بے نظیر' طرز بیان شگفتہ' زبان نہایت پیاری اور رس بھری اور خوبصورت عبارت آرائی سے مزین ہے۔ نظم کی صورت میں مولانا حالی کی "مناجات بیوہ" اور نثر کی صورت میں حسرت کی یہ کتاب پورے اردو ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

اس عظیم المرتبت صحافی و ادیب کا انتقال ۲۶ جون ۱۹۵۵ء کو لاہور میں ہوا۔ آپ کی آخری آرام گاہ دل فیروز روڈ بالمقابل باغیچی چراغ شاہ سعدی پارک' قبرستان میانی صاحب میں آغا شورش کاشمیری کی قبر کے ساتھ واقع ہے۔

حبیب جالب

•

حبیب جالب کا تعلق گاؤں میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور (بھارت) سے تھا جسے دو آبہ بشت کا گلابہ بھی کہتے تھے۔ میانی افغاناں دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے۔ یہ سرسبز و شاداب باغوں کا علاقہ مہمند پٹھانوں کی ملکیت تھا۔

حبیب جالب ۱۰ جنوری ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام حبیب احمد جالب تھا۔ آپ کے والد کا نام صوفی عنایت اللہ تھا۔ جو صاحب علم شخص تھے۔ انہوں نے بے شمار قلمی نسخوں کے علاوہ ایک کتاب "گلہائے عقیدت" بطور یادگار چھوڑی ہے۔ جالب نے ابتدائی تعلیم گاؤں میانی افغاناں ہی سے حاصل کی۔ گاؤں کے سکول سے ساتویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد دلی چلے گئے اور اینگلو عربک ہائی سکول موری گیٹ میں داخل ہو گئے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کے وقت ان کا خاندان کراچی منتقل ہو گیا۔ پاکستان آکر کچھ عرصہ تک ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا اور پھر وہ کراچی سے لاہور آکر اورئنٹل کالج میں داخل ہو گئے۔

حبیب جالب نے اپنی عملی زندگی کا آغاز دوران تعلیم صحافت سے کیا اور اخبار "آفاق" میں ملازم ہو گئے۔ اس دوران ان کی غزلیں رسالہ "ماہ نو" میں چھپنے لگیں۔ لیکن روزگار کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم اور لاہور کو خیرباد کہہ کر کراچی چلے گئے اور وہ روزنامہ "جنگ" کراچی میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد روزنامہ "امروز" لاہور میں آ گئے اور لاہور ہی سے ان کی پہلی شعری تصنیف "برگ آوارہ" شائع ہوئی۔ لاہور آکر شاعر اور فلمی مصنف

کے طور پر خوب شہرت حاصل کی۔

حبیب جالب ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اسی وابستگی کے سبب انہوں نے عملی سیاست میں قدم رکھا اور نیشنل عوامی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ جالب آمریت کے ہر دور میں سینہ سپر رہے اور اپنے قلم کی مدد سے مظلوموں کی مدد کرتے رہے اور ظالم کو للکارتے رہے۔ وہ محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھیوں میں بھی شامل رہے۔ اپنے ترقی پسندانہ نظریات کی بدولت اکثر و بیشتر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

حبیب جالب کی شعری تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ برگ آوارہ

۲۔ سرمقتل

۳۔ عہد ستم

۴۔ گنبد بے در

۵۔ ذکر بہتے خون کا

۶۔ حرف سردار (کلیات)

حبیب جالب اپنی شاعری کے آغاز میں ایک روایتی غزل گو شاعر تھے۔ مگر جب انہوں نے تقسیم ہند کے وقت انسانیت کا قتل عام اپنی آنکھوں سے دیکھا تو وہ حکومتی طبقوں کے دشمن بن گئے۔ آزادی کے بعد ابتدائی دور میں ترقی پسند شاعروں کا عام موضوع یہ احساس تھا کہ انڈیا اور پاکستان کے حکمران طبقات اور سامراجی طاقتوں کے درمیان ایک گہرا قریبی رشتہ ہے۔ جب جالب ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے بھی اس مسئلے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کی شاعری کا نمایاں پہلو اس موضوع کا سیدھا سادہ اظہار تھا۔ اس دور کے اکثر ترقی پسند شاعروں کے بالکل برعکس انہوں نے عام لوگوں اور مزدوروں کو اپنی شاعری سنانے کیلئے منتخب کیا اور اس طرح وہ بہترین عوامی شاعر ثابت ہوئے۔

اردو زبان نے نظیر اکبر آبادی کے بعد اگر سچ مچ کوئی عوامی شاعر پیدا

کیا ہے تو وہ جالب ہے۔ نظیر کی طرح وہ بھی عوامی انسان ہیں۔ ان کا رہن سہن، سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز، ان کی اقدار، محبتیں اور نفرتیں عوامی تھیں۔ وہ عوام کے دکھ، درد، آرزوؤں اور امنگوں کی ترجمانی عوام ہی کی زبان میں کرتے تھے۔ جالب نے اردو شاعری کو نیا اسلوب بخشا اور عوام کے ذوق شعری کی تشنگی بجھائی۔ ان کی تشفی کی اور ان کی مایوس اور غمزدہ زندگی میں امیدوں کے دیپ جلائے۔ انہوں نے آمریت کے خلاف جدوجہد میں جو خدمات سرانجام دیں وہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔

جالب نظریئے کا شاعر اور نظریئے کا انسان تھا۔ زندگی کی قدریں انہیں بے حد عزیز تھیں۔ وہ بے قاعدگی، ظلم، ناانصافی، تعیش پسندی، اخلاقی پستی اور سماجی ناہمواری کے دشمن تھے۔ وہ جمہور کی آواز تھے۔ اب بھی ہیں اور آئندہ آنے والے دنوں میں اپنی اس توانا آواز کی بدولت زندہ تابندہ رہیں گے۔

حبیب جالب کا انتقال ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ء کو ہوا۔ آپ کا مدفن قبرستان سبزہ زار میں واقع ہے۔

حفیظ جالندھری

اصل نام محمد حفیظ تھا۔ ۱۴ جنوری ۱۹۰۰ء کو پنجاب کے شہر جالندھر کے متوسط مسلم راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شمس الدین اور والدہ کا نام بتول تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر محلے کی مسجد میں دو سال تک قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۷ء میں امریکن مشن ہائی سکول کی پرائمری جماعت میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں دو آبہ ہائی سکول جالندھر میں چوتھی جماعت میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد مشن ہائی سکول جالندھر سے ساتویں جماعت کا امتحان دیا۔ غرضیکہ اسکول میں دل نہ لگا سکے۔ سکول سے بھاگنے پر اکثر سزا ملتی مگر کوئی اثر نہ ہوتا۔ سکول سے بھاگ کر کھلے میدانوں یا گاؤں کا رخ کرتے۔ کہیں بیٹھ کر طلسم ہو شربا' امیر حمزہ کے کارنامے' عمرو عیار کی کہانیاں اور مسدس حالی پڑھتے۔ ساتویں جماعت کے بعد باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ بلکہ گھر سے بھاگ نکلے اور چار ماہ تک گھر سے باہر رہے۔ اس زمانے میں دہلی میرٹھ اور بمبئی میں گھومتے رہے۔ اس زمانے میں اردو سے دلچسپی پیدا ہوئی اور سولہ برس کی عمر میں باقاعدہ شعر کہنے لگے۔

۱۹۱۷ء میں خالہ کی بیٹی زینب خاتون سے شادی ہوئی۔ اس کے بعد معاشی تنگدستی اور پریشانیوں کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۷ء یعنی جنگ عظیم اول کے دوران ایک بڑے انعامی مشاعرے کا اشتہار دیکھا اور جنگ کے موضوع پر لکھی ہوئی دو نظمیں اس مشاعرے میں پڑھیں اور دونوں طلائی تمغوں کی حقدار قرار پائیں۔ سترہ سال کے نوجوان شاعر کے مقابلے میں کئی سکہ بن شاعر منہ دیکھتے رہ گئے۔

۱۹۱۸ء میں ان کی ملاقات ان کے والد کے دوست مولانا گرامی سے ہوئی جو نظام حیدر آباد دکن کے درباری شاعر تھے۔ ان کی مدد سے فارسی کی استعداد میں اضافہ کیا۔ انہی دنوں فوجی وردیوں کی تیاری کا ٹھیکہ بھی لیا۔ سنگر مشین بیچنے کی نوکری بھی کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں حفیظ صاحب نے جالندھر سے ایک رسالہ "اعجاز" نکالنا شروع کیا لیکن ۳ ماہ میں مالی نقصان کی وجہ سے بند کرنا پڑا۔ ۱۹۲۵ء میں میر آف خیرپور سندھ کے درباری شاعر بن گئے۔ مشہور نظم رقاصہ وہیں لکھی اور دربار میں سنا ڈالی جس کی پاداش میں ریاست بدر کئے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں مدراس میں آل انڈیا مشاعرے سے واپسی پر نظام حیدر آباد نے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ میں مشاعرے میں شرکت کی اور "فرشتوں کا گیت" نظم سے داد وصول کی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء تک حفیظ صاحب مختلف رسائل کے نائب مدیر اور مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں ہفتہ وار رسالہ "حمایت الاسلام" کے مدیر اور ۱۹۲۶ء میں "مخزن" کے مدیر ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں لاہور سے ہفتہ وار اخبار "کارزار" نکالا جو دو سال تک چلتا رہا۔ رسالہ "نونہال" "ہزار داستان" "تہذیب نسواں" "پھول" اور "انجمن" کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے۔ روزنامہ "زمیندار" سے بھی جزوقتی طور پر منسلک رہے۔ ان رسالوں کی ادارت سے بطور نثر نگار بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ نظموں کے علاوہ لبغراد افسانے لکھے اور بعض تراجم بھی کئے جو ان رسالوں میں چھپتے رہے۔

۱۹۲۷ء میں اپنی شاہکار نظم "شاہنامہ اسلام" کی ابتدا کی۔ اس وقت تک غزلوں اور گیتوں کا مجموعہ "نغمہ زار" شائع ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۳ء مین "سوز و ساز" اور ۱۹۳۹ء مین "تلخابہ شیریں" منظر عام پر آئی۔ شاہنامہ اسلام کے بقیہ تین حصے ۱۹۳۳ء، ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئے۔

حفیظ صاحب نے ۱۹۳۵ء میں فریضہ حج ادا کیا۔ ۱۹۳۸ء میں لندن گئے اور لارکس سکول آف لنگویجز داخلہ لے لیا۔ وہاں ان کی ملاقات انیلا Anela سے ہوئی جو ان کی شاعری سے بہت متاثر ہوئیں اور ان سے ساتھ

ہندوستان چلی آئیں۔ پہلی بیوی سے سات بیٹیاں تھیں۔ انیلا سے بھی ایک بیٹی ہوئی۔ انیلا ۱۹۵۰ء میں علیحدگی کے بعد لندن و ہیں چلی گئیں۔ انیلا نے انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام Hafeez-Poet son of India ہے۔ ۱۹۵۱ء میں پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ تیسری شادی ۱۹۵۵ء میں بیگم خورشید حفیظ سے ہوئی جن سے ایک بیٹی رضائے حفیظ ہے۔

جنگ عظیم دوم کے دوران سر اکبر حیدری وغیرہ کے ایما پر گورنمنٹ ملازمت اختیار کی۔ اور جنگ عظیم کے حوالے سے کئی جوشیلے گیت لکھے۔ سانگ پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ میں آرگنائزر' ڈائریکٹر اور ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔ یہ ملازمت ۱۹۴۶ء تک رہی اور اس وقت تک آپ دہلی میں مقیم رہے۔ جنگ کے خاتمہ پر حکومت ہند نے خان بہادر کا خطاب دے کر حفیظ صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا۔ جنگ کے بعد حفیظ مسلم لیگ کے جلسوں کی روح رواں بن کر ابھرے۔

تقسیم ہند کے وقت حفیظ صاحب کشمیر میں تھے۔ ۱۹۴۷ء کے جگر دوز واقعات کے درمیان ہی انہوں نے شاہنامے کی چوتھی جلد مکمل کی اور نہایت ہمت اور بہادری سے شملہ کے مظلوم مسلمانوں کو بچانے اور ایک محفوظ جگہ پر جمع کرنے کا کام بھی کرتے رہے۔ بالاخر فوجی امداد کی بدولت پاکستان آنے والے کارواں میں شامل ہو کر پاکستان آئے۔ پاکستان میں آئے ہوئے پناہ گزینوں کی حالت زار قوم کے سامنے پیش کرنے اور سیاسی رہنماؤں تک پہنچانے کی کوشش میں سرگرم عمل رہے۔

۱۹۴۸ء میں حفیظ صاحب نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا جو ان کے نام کو زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں تاشقند میں افریشیائی رائٹرز کانفرنس میں شرکت کی اور پاکستانی وفد کی سربراہی کے فرائض انجام دیئے۔ پاکستانی فوج میں ڈائریکٹر آف موریل کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء تک ولیج ایڈ میں ڈائریکٹر آف پبلسٹی رہے اور پھر ڈائریکٹر آف نیشنل ری کنسٹرکشن اسلام آباد مقرر ہوئے۔ یہ ان کی آخری ملازمت تھی۔ اس کے بعد

ریٹائرڈ زندگی گزارتے رہے۔

حفیظ صاحب شعر و ادب کے ایسے آفتاب ہیں جو غروب ہو کر بھی غروب نہیں ہوا کرتے۔ انہوں نے چھوٹی عمر میں شہرت حاصل کر لی تھی اور زندگی میں انہیں متعدد خطابات سے نوازا گیا۔ ابوالاثر کا خطاب کپور تھلہ کے ایک مشاعرے سے متاثر ہو کر مولانا گرامی نے دیا جو ان کے نام کا ایک حصہ بن گیا۔ برطانوی حکومت نے خان صاحب اور خان بہادر کے خطابات دیئے جو قائداعظم کے ایما پر واپس کر دیئے گئے۔ ملک الشعراء حسان الملک اور فردوسی اسلام کے خطابات مختلف ریاستوں کی طرف سے ملے۔

حفیظ صاحب نے شعری مجموعوں "نغمہ زار" "سوز و ساز" "تلخابہ شیریں" "چراغ سحر" اور "شاہنامہ اسلام" کے علاوہ دیگر تصانیف بھی چھوڑی ہیں۔ "رزم نہیں بزم" "بچوں کے گیت" "معیاری افسانے" "ہفت پیکر" "نثرانے" "چیونٹی نامہ" "عمرو عیار اور الف لیلہ" (بچوں کے لیے) بہت مقبول ہوئیں۔ وفات کے وقت "ظلوم و جہول" اور "اقبال میرا اقبال" کے نام سے دو کتابیں زیر تکمیل تھیں۔

"ہفت پیکر" سات مختلف افسانوں کا مجموعہ ہے۔

"معیاری افسانے" انگریزی افسانوں کے تراجم ہیں یا اخذ کئے گئے ہیں۔ "نثرانے" مختلف مضامین کا مجموعہ ہیں۔

عمرو عیار اور الف لیلہ بچوں کے لیے اپنے بھتیجے علاء الدین مظہر کی فرمائش پر لکھیں۔ اس طرح "بدرالدین کی خوابی دلہن" نامی کتاب بھی بچوں کے لیے لکھی۔

حفیظ جالندھری کی شاعری کے موضوعات متنوع ہیں۔ انہوں نے غزل، نظم اور گیت کی صنف کو استعمال کرتے ہوئے مذہبی، قومی، ملی اور روایتی اور سیاسی شاعری کی ہے۔ ان کی غزلیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی غزلوں میں داخلیت اور خارجیت کے عناصر کا بیان بڑے واضح انداز میں ہوا ہے۔ ان کی غزل کا مرکزی موضوع درد و محبت کا موضوع ہے۔ ان کی غزل

میں گہرے تجربات اور نفسیات محبت کا جو فلسفیانہ تجزیہ ملتا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود ہو۔ غزل میں سیدھی سادھی اور صاف باتیں کرتے ہیں۔ اس کی مثال ان کا یہ شعر ہے۔

او دل توڑ کے جانے والے دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھ کو بھی سمجھاتا جا

حفیظ کی غزلوں میں کائنات کے گہرے مشاہدے کے ساتھ ساتھ بے ثباتی حیات کا تصور بھی نظر آتا ہے۔ ان کی غزل تمنائے حیات کے ولولے سے لبریز ہے۔ غزلوں کی نغمگی قاری کے دل پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ نظموں میں وطن کی محبت کا جذبہ موجود ہے۔

ہر حال میں اپنے وطن عزیز پاکستان کو دنیا کے نقشے پر ایک اعلیٰ و ارفع مقام پر دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ مذہبی شاعری میں ان کی نظم شاہنامہ اسلام بڑی معرکۃ الاراء ہے۔ اس میں شاعر نے اپنے بیانات کو قرآن مجید کی آیات، مستند تاریخوں اور حدیث کی کتابوں سے موثق اور نظم کی قیود کے باوجود تاریخی حقیقت نگاری کی ہے جو انتہائی قابل تحسین کارنامہ ہے۔ گیت نگاری میں حفیظ جالندھری نے گیت کے تمام فنی لوازم کو کماحقہ، پورا کیا ہے۔ اپنے گیتوں کے ذریعے محبت اور اخوت کے رنگ بکھیرے ہیں۔ انہوں نے اپنے گیتوں میں بحروں کے نئے تجربات کئے ہیں اور ہندی، فارسی اور مقامی الفاظ تراکیب و آمیزش سے انہیں جاوداں بنا دیا ہے۔

حفیظ صاحب ۲۱ دسمبر ۱۹۸۲ء کو سروسز ہسپتال میں مختصر علالت کے بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کا مدفن اقبال پارک (منٹو پارک) میں مینار پاکستان کے قریب واقع ہے۔

حمید نظامی

حمید نظامی ۳ جنوری ۱۹۱۵ء کو سانگلہ ہل ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے اور وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۸ء میں اسی کالج سے بی۔ اے کیا۔ زمانہ طالب علمی میں اسلامیہ کالج میگزین "کریسنٹ" اور سالنامہ "فروغ مشرق" کے حلقہ ادارت میں شامل رہے۔ ۱۹۳۷ء میں کالج یونین کے سیکرٹری چنے گئے اور کئی تقریری مقابلوں میں انعامات حاصل کئے۔ ۱۹۳۷ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی تو حمید نظامی اس کے بانیوں میں سے تھے اور اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ستمبر ۱۹۳۷ء سے اپریل ۱۹۳۸ء تک علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں ایف سی کالج سے ایم۔ اے انگریزی میں کیا۔ لی کاک ان کا پسندیدہ مصنف تھا۔ اس کے مضامین کے تراجم کے علاوہ چیخوف اور ٹالسٹائی کے کئی افسانوں کا ترجمہ کیا۔ یہ تراجم "ہمایوں" میں چھپتے رہے۔

کالج کی ابتدائی زندگی میں کانگریس سوشلسٹ نظریات کو پسند کرتے تھے۔ لیکن جب کانگریس کے نظریات واضح ہوئے تو مسلم لیگ کی طرف مائل ہوئے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسوں سے ان کی سیاست نگاری کا سلسلہ جاری ہوا اور ان کی سیاسی خطابت کے جوہر کھلے۔ ان کی تقریریں متوازن اور مدلل ہوتی تھیں۔

علامہ اقبال کی صحبت میں رہ کر ان کے خیالات میں پختگی آئی۔ انہیں دنوں ایسوسیٹڈ پریس آف انڈیا میں رپورٹنگ کی تربیت حاصل کی لیکن سرکاری ملازمت کا خیال نہ تھا۔ جب اورینٹ پریس آف انڈیا کے نام سے مسلمانوں کا

ایک خبر رساں ادارہ قائم ہوا تو حمید نظامی اس کی لاہور برانچ کے مینجر مقرر ہوئے۔

۲۹ مارچ ۱۹۴۰ء کو "نوائے وقت" کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں صحیح شعور پیدا کرنا تھا۔ اس کے سرپرست میاں بشیر احمد تھے۔ اردو کی خدمت کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے پیغام کو عام کرنا اس اخبار کا نصب العین تھا۔ یہ پیغام دراصل مسلم لیگ کا پیغام تھا اور یہی پیغام تھا جو آگے چل کر مطالبہ پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔ "نوائے وقت" پہلے پندرہ روزہ تھا۔ پھر ہفت روزہ ہوا اور ۲۲ جولائی ۱۹۴۴ء سے اسے روزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ اخبار یونینسٹ حکومت کی مخالفت سے مرعوب ہوئے بغیر مسلم لیگ اور پاکستان مخالف قوتوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہوا۔ حمید نظامی کی عظمت اس بات میں ہے کہ وہ کسی دور میں بھی حق گوئی اور بیباکی کے راستے سے نہیں ہٹے۔ انگریزی حکومت، کانگریس، نیشنلسٹ مسلمان اور یونینسٹ پارٹی سے چومکھی جنگ لڑتے رہے اور ہمیشہ حکمرانوں کا احتساب جاری رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ مسلم لیگ کے رہنماؤں کو غیر جمہوری کاروائیوں پر ٹوکا اور احساس دلایا کہ اقتدار محض وقتی ہوتا ہے اور ملک کے مقابلے پر افراد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۱ اپریل ۱۹۵۱ء کو حق گوئی کی پاداش میں "نوائے وقت" کو بند کر دیا گیا۔ اس دور میں "نوائے وقت" کو متعدد مصائب، آلام و دشواریاں برداشت کرنی پڑیں لیکن حمید نظامی صاحب نے آزاد اور نڈر صحافت کے تقاضوں سے دستبردار ہونا گوارا نہ کیا۔

۱۹۵۲ء میں انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہو گئے۔ اور اس ادارہ کی طرف سے مختلف یورپی اور ایشیائی ممالک میں جو اجلاس ہوئے ان میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ کامن ویلتھ پریس کانفرنس کے اجلاس میں بھی شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ جب ۱۹۶۱ء میں کامن ویلتھ پریس یونین کا اجلاس پاکستان میں ہوا تو اس کے انتظامات و پروگرام میں بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظمؒ نے حمید نظامی کو "آتش نوا" کا لقب دیا۔ حمید نظامی واقعی

"آتش نوا" تھے۔ انہوں نے پنجاب کے نوجوانوں میں غیرت و حمیت کے ایسے چراغ روشن کیے جس میں تمام پاکستان دشمن عناصر جل کر راکھ ہو گئے۔ حمید نظامی کی شخصیت کا سب سے درخشاں پہلو حق گوئی و بے باکی تھا وہ علامہ اقبال کے مرد مومن تھے۔

حمید نظامی کی قومی، ملی، ادبی اور صحافتی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور جب بھی تاریخ پاکستان رقم ہو گی اس میں حمید نظامی کا نام جلی حروف میں شامل ہو گا۔

۲۳ فروری ۱۹۶۲ء میں حمید نظامی پر عارضہ قلب کا شدید حملہ ہوا اور تین یوم کی علالت کے بعد یہ مرد مجاہد ۲۶ فروری ۱۹۶۲ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ قبرستان میانی صاحب میں آسودۂ خاک ہوا۔ آپ کی قبر علاقہ نظام شاہ بالمقابل چراغ شاہ سعدی پارک دل فیروز روڈ پر واقع ہے۔

maablib.org

خدیجہ مستور

خدیجہ مستور دسمبر ۱۹۲۷ء میں گاؤں بلسہ (بریلی) میں پیدا ہوئیں۔ آپ کا تعلق بریلی کے یوسف زئی خاندان سے تھا۔ خدیجہ مستور کی پیدائش بلسہ میں ہوئی لیکن انہوں نے پرورش لکھنؤ میں پائی۔ آپ کے والد کا نام تہور احمد خان تھا۔ خدیجہ مستور کے والد سرکاری ملازم اور ادبی ذوق رکھنے والی شخصیت تھے۔ ان کے گھر پر ادبی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ خدیجہ مستور نے اس ادبی ماحول میں پرورش پائی ان کی چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور نے بھی بطور ادیب خوب شہرت حاصل کی۔

خدیجہ مستور نے گھر سے قرآنی تعلیم حاصل کی اور قصبے کے کانونٹ سکول سے نصابی تعلیم کا آغاز کیا۔ گھر کے ادبی ماحول کی بدولت خدیجہ مستور بچپن ہی میں ادب کی طرف راغب ہو گئیں۔ ان کی والدہ انور جہاں بھی اچھی مضمون نگار اور شاعرہ تھیں۔ ان کے مضامین اس وقت کے رسائل "عصمت" اور "سہیل" میں شائع ہوتے تھے۔ خدیجہ مستور کی عمر جب نو برس ہوئی تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ رشتے داروں کی بے رخی اور زمانے کی صعوبتوں کے باعث یہ خوشحال گھرانہ اچانک عسرت و تنگدستی کا شکار ہو گیا۔ ان حالات نے خدیجہ جیسی شوخ، شریر اور نڈر بچی کو بڑی زود حس، حساس طبع اور سنجیدہ بنا دیا۔ ان حالات کے سبب ان کی تعلیم بھی افلاس کی چیرہ دستیوں کی نذر ہو گئی۔ اگرچہ وہ ہونہار طالبہ تھیں مگر کسی ڈگری کے حصول کے مواقع انہیں نصیب نہ ہو سکے۔ یہ خدیجہ مستور کی جرات اور ہمت تھی کہ باقاعدہ تعلیمی کمی کے باوجود انہوں نے اپنی کوشش سے مطالعے کو وسعت دی۔ انہوں نے گھر پر مطالعہ جاری کیا اور اردو کے علاوہ انگریزی، فارسی اور روسی ادب کا مطالعہ کیا۔ روسی ادیبوں میں انہیں "چیخوف" خاص طور پر پسند تھے، جنہیں اپنی تصنیف "ڈان بہتا رہا" (And Quiet Flows the Don) پر نوبل پرائز بھی ملا۔

اردو میں خدیجہ مستور نے سب ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ کیا لیکن زیادہ شوق سے نثر نگاروں میں پریم چند' احمد ندیم قاسمی اور شاعروں میں غالب حافظ سعدی شیرازی اور خیام کو پڑھا۔

خدیجہ مستور نے ۱۸ برس کی عمر میں باقاعدہ لکھنے کا آغاز کیا۔ شروع میں افسانہ نویسی کی طرف بڑی رغبت تھی ان کا پہلا افسانہ' ضیاء تھا۔ ان کے مختلف افسانے اس دور کے مشہور رسائل "خیال"' "عالمگیر" اور "ساقی" میں شائع ہوتے تھے۔ مختلف رسائل میں چھپنے والے ان افسانوں اور کہانیوں کو ۱۹۴۴ء میں کتابی شکل میں "کھیل" کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ۱۹۴۶ء میں "بوچھاڑ" کے نام سے شائع ہوا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ سے پاکستان آ گئیں اور ان کا شمار اردو کے ایسے افسانہ نگاروں میں ہونے لگا جنہوں نے اردو افسانے کو زبان و بیان اور موضوع کے لحاظ سے نئے امکانات اور وسعتوں سے متعارف کروایا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی شادی صحافی ظہیر بابر سے ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ "چند روز اور" شائع ہوا۔ مئی ۱۹۶۲ء میں چوتھا افسانوی مجموعہ "تھکے ہارے" کے نام سے چھپا۔

۱۹۶۲ء ان کے لیے بطور ادیب یادگار سال تھا۔ اس سال ان کا شاہکار ناول "آنگن" منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کا ناول "زمین" چھپا۔ یہ ان کی آخری تصنیف تھی۔ ان کے مختلف افسانوں کو جمع کر کے ان کا مجموعہ "ٹھنڈا میٹھا پانی" ان کی موت کے بعد شائع ہوا۔

ادبی حلقوں میں انکے ناول "آنگن" نے تہلکہ مچا دیا اور اسے آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا اور آج تک خدیجہ مستور کی شناخت اسی ناول سے ہے۔ افسانے اور ناول لکھنے کے علاوہ ریڈیو کیلئے دو ڈرامے لکھے۔ بچوں کیلئے بھی چند کہانیاں لکھیں جن میں سے دو کہانیاں "ادارہ کتاب نما" کی شائع کردہ کتاب "جیتی جاگتی کہانیاں" میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی کہانیوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں رائٹرز گلڈ ملتان شاخ کی اردو محفل میں ان کے پڑھے جانے والے افسانے "راستے" کو سال رواں کا بہترین افسانہ قرار دیا گیا۔ کچھ عرصہ "روزنامہ امروز" کیلئے کالم بھی لکھتی

رہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور شاخ کی سیکرٹری بھی رہیں۔

خدیجہ مستور کا فن ان کی شخصیت اور ماحول کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے نسوانی کردار ان کی شخصیت کا پرتو نظر آتے ہیں۔ خدیجہ مستور چار فٹ گیارہ انچ کی مختصر سی خاتون تھیں لیکن اپنی تخیلی قوت' خوش مذاقی' زندہ دلی اور باغ و بہار طبیعت کی بدولت بڑی قد آور شخصیت کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں۔ خدیجہ مستور کی ادبی زندگی کا شاہکار ان کا ناول "آنگن" ہے۔ اس ناول کا ہندی' بنگالی' گجراتی اور روسی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور سی۔ ایس۔ پی کے نصاب میں اسے شامل کیا گیا ہے۔ خدیجہ مستور کا یہ ناول موضوع کے لحاظ سے دو سطحیں رکھتا ہے۔ ایک جاگیردارانہ نظام کے حوالے سے گھریلو زندگی ہے اور دوسرا اس کا موضوع تحریک آزادی ہے۔ خدیجہ مستور نے اس ناول میں ایک جاگیردار گھرانے کی روایت اور ذہنیت کی کہانی بیان کی ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کی مخصوص تہذیب' رسم و رواج اور سیاسی اثرات کا ترجمان ہے۔

خدیجہ مستور نے اپنے فن کے ذریعے اردو ادب کے لیے جو خدمت سرانجام دی ہے اسے تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

خدیجہ مستور کا انتقال ۲۶ جولائی ۱۹۸۲ء کو عارضہ قلب کے سبب لندن میں ہوا اور ان کا جسد خاکی لاہور لا کر قبرستان گورومانگٹ (کبوترپورہ) میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کی قبر پر خوبصورت چھت تعمیر کی گئی ہے جو ان کے ناول "آنگن" کی طرح قبرستان میں آنے والے ہر فرد کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور خدیجہ مستور کی روح کو ایصال ثواب کیلئے دعا پڑھنے کی دعوت دیتی ہے۔ مٹی کے پردوں میں مستور خدیجہ کو ادب سے پیار کرنے والے لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

خواجہ دل محمد

خواجہ دل محمد شیخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے مورث اعلیٰ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں اسلام لائے۔ ان کا آبائی وطن غزنی تھا ان کے بعد کے بزرگ لاہور آکر آباد ہو گئے۔ آباد اجداد کا پیشہ تجارت تھا۔ حوادث روزگار اور انقلاب زمانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ خاندان ہر دور میں ترقی کرتا رہا۔

خواجہ دل محمد لاہور کے کوچہ "گیان" عقب کشمیری بازار میں فروری ۱۸۸۳ء میں خواجہ نظام الدین ابن خواجہ نور محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ قرآنی تعلیم کا آغاز چار برس کی عمر میں سنہری مسجد سے کیا کلام ناظرہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالا گیٹ میں داخل ہوئے اور میٹرک تک تعلیم اسی سکول سے حاصل کی۔ اسی دوران انجمن حمایت اسلام نے اسلامیہ ہائی سکول کی عمارت کے بالائی حصے میں کالج بھی قائم کر دیا۔ لہٰذا خواجہ دل محمد نے ایف اے اور بی اے کے امتحانات اسلامیہ کالج ہی سے پاس کیے۔ کالج کے زمانے میں شیخ سر عبدالقادر ان کے استادوں میں سے تھے۔ اور ان کی شخصیت نے خواجہ دل محمد کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

ریاضی کے مضمون سے خواجہ صاحب کو ایک فطری مناسبت اور رغبت تھی۔ بی اے میں ان کے مضامین میں ریاضی کا ڈبل کورس تھا اور پھر یہی مضمون ایم اے میں اختیار کیا۔ اور ۱۹۰۷ء میں ایم اے ریاضی کا امتحان پاس کیا۔ ایم اے کے بعد اسلامیہ کالج ہی میں استاد مقرر ہو گئے۔ کالج کے ساتھ آپ کی وابستگی والہانہ تھی۔ مختلف وقتوں میں گرانقدر مشاہرے پر بھی

نوکریوں کی پیشکش ہوئی۔ لیکن خواجہ صاحب نے فیصلہ ہمیشہ اسلامیہ کالج کے حق میں دیا اور ۳۵ برس تک اس کالج میں تشنگان علم کو فیض یاب کرتے رہے۔ ۱۹۴۰ء میں اس کالج کے پرنسپل ہوئے اور ۱۹۴۳ء میں سبکدوش ہو گئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد رجسٹرار ضلع لاہور میں مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں تقسیم ہند کے وقت خرابی صحت کے سبب اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ ملازمت کے اس عرصہ کے دوران تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہے۔

استاد کے طور پر خواجہ دل محمد بڑے کامیاب اور ہر دلعزیز تھے۔ ان کا علم اور تجربہ بڑا وسیع تھا۔ ریاضی جیسے خشک مضمون کو ایسے دلچسپ انداز سے پڑھاتے تھے کہ طلبہ کلاس میں شوق سے آتے اور خوش و خرم جاتے تھے۔ ان کی حیثیت بطور ریاضی دان مسلمہ تھی اور ان کے پائے کے ماہر ریاضیات انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے ہیں۔

آپ کے نامور شاگردوں میں شیخ عبداللہ سابق وزیراعلیٰ ریاست مقبوضہ کشمیر، عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر اور پروفیسر تاج محمد خیال (بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے پہلے چیئرمین) شیخ زاہد حسینؒ (سابق گورنر سٹیٹ بنک) شامل ہیں۔ خواجہ دل محمد ریاضی اور شاعری کی خداداد صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ نے اپنی شاعری کا آغاز نعت گوئی سے کیا۔ ۱۹۰۲ء میں جب آپ ایف اے کے طالب علم تھے تو آپ کے والد نے آپ کی شاعری کے ابتدائی کلام کا مجموعہ "حمد و نعت" کے عنوان سے طبع کرایا لیکن اب اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔

خواجہ صاحب کی شاعری کا باقاعدہ آغاز انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں قومی نظموں سے ہوا۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں خواجہ صاحب ان جلسوں میں نظمیں سناتے تھے جہاں اکابر شعراء کرام حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، ارشد گورگانی نظمیں سناتے تھے۔ خواجہ دل محمد ان اکابر شخصیات سے داد بھی حاصل کرتے اور فیض بھی پاتے تھے۔ خدا نے انہیں ذہن سلیم عطا کیا تھا۔ اس لیے حالی، ارشد گورگانی، سائل دہلوی اور علامہ اقبال کے کلام سے استفادہ

کر کے انہوں نے اپنی شاعری کو بالیدگی بخشی۔ مولانا حالی اور اقبال کے کلام سے متاثر ہو کر انجمن کے سالانہ جلسوں میں بڑی اچھی نظمیں پڑھیں۔ ان سالانہ جلسوں میں پڑھی جانے والی نظموں کا مجموعہ "درد دل" کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بڑا ضخیم تھا۔ چنانچہ بعد ازاں خواجہ صاحب نے اس مجموعے کی نظموں میں کانٹ چھانٹ کی اور دوبارہ ۱۹۵۶ء میں "حیات نو" کے نام سے شائع کیا۔

خواجہ صاحب کی سیاسی اور سماجی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے انہوں نے ملازمت کی پابندیوں کے باوجود قومی اور سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت اور کانگریس کی متحدہ کمیٹی کے ٹکٹ پر میونسپل کمیٹی کے الیکشن میں حصہ لیا اور میونسپل کمشنر (چیئرمین میونسپل کمیٹی) بنے۔ اس حیثیت میں خواجہ صاحب نے ۲۲ سال تک عوام کی سماجی خدمت کی لیکن آخری عمر میں خرابی صحت کے سبب الیکشن اور سیاست کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو گئے۔ تحریک پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دامے، درمے، قدمے، سخنے مسلمانوں کی مدد کرتے رہے اور اپنی شاعری کے ذریعے اپنے ملک پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں آزادی کا جوش اور ولولہ بھی پیدا کرتے رہے۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی جانے والی نظم "محمد بن قاسم فاتح پاکستان" کا یہ شعر ان کے جذبات کا بھرپور ترجمان ہے۔

ملا پنجاب و سندھ و سرحد و کشمیر کو یکجا
خدا کے پاک بندے اپنا پاکستان پیدا کر

(پاکستان کا نام ۱۹۳۳ء میں چوہدری رحمت علی نے اپنے پمفلٹ Now or Never میں تجویز کیا تھا)۔

ریاضی ایک مشکل اور خشک مضمون ہونے کے سبب طلبہ کے لیے ہمیشہ وبال جان رہا ہے لیکن خواجہ صاحب نے اس کی تدریس میں ایسا شگفتہ اور دل کش اسلوب اختیار کیا کہ ریاضی سے بدکنے والے اس کے مداح ہو کر رہ

گئے۔ آپ نے ۱۹۲۴ء میں (Dil,s New Algebra) انگریزی میں تصنیف کیا اور الجبرے کی پیچیدگیوں کا آسان حل پیش کیا۔ یہ الجبرا انتہائی مقبول ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوا۔ اس کی زبردست مقبولیت کے سبب آئندہ سال آپ نے (Dil,s New Arithmetic) تصنیف کیا اور پھر (Dil,s New Geometry) لکھی۔ تینوں کتابوں کا سیٹ ۱۹۳۵ء میں مکمل ہوا۔ یہ تینوں کتابیں ہر سکول میں رائج ہو گئیں۔ یہاں تک یہ کتابیں علی گڑھ یونیورسٹی، بمبئی اور مدارس یونیورسٹی کے نصاب میں بھی منظور ہو گئیں۔ جیومیٹری کا اسلوب اس قدر پسند کیا گیا کہ ہندو سکولوں میں بھی یہ کتاب پڑھائی جانے لگی۔ ان کتب سے پہلے انجمن حمایت اسلام کے اسلامیہ سکولوں میں ہندو اور انگریز مصنفین کی کتابیں رائج تھیں مگر خواجہ صاحب کی ان تصانیف کی طباعت کے بعد یہ کتابیں پڑھائی جانے لگیں۔ قیام پاکستان کے ایک سال بعد خواجہ صاحب نے پاکستانی تعلیمی اداروں کے لیے اس مشہور سلسلے کو اردو میں منتقل کر دیا۔ اردو میں نصابی کتب کا یہ پہلا معیاری سلسلہ تھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان کتابوں کی مانگ آج بھی بدستور برقرار ہے۔ خواجہ صاحب کی مرتب کردہ ریاضی کی ۳۲ کتب مختلف مدارج کے نصاب میں شامل ہیں۔

خواجہ صاحب نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی اعلیٰ جماعتوں کا نصاب تیار کرنے میں بھی حصہ لیا۔ پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے گیارہ برس تک ممبر اور ۲۴ برس تک فیلو آف پنجاب یونیورسٹی رہے۔ لاہور امپرومنٹ ٹرسٹ کے چھ سال تک ٹرسٹی رہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی تمام عمر علم و ادب اور سماجی خدمت میں گزاری۔

خواجہ صاحب کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی خدمات کے اعتراف پر ریلوے سٹیشن کے قریب ایک معروف سڑک (خواجہ دل محمد روڈ) آپ کے نام سے موسوم ہے۔

آپ کا انتقال ۲۸ مئی ۱۹۶۱ء کو سرطان کی بیماری کے باعث ہوا اور

قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے۔

ممتاز ریاضی دان، تجربہ کار معلم، خوش فکر شاعر اور قابل قدر شخصیت اپنی زندگی کو ہمارے لیے مشعل راہ بنا کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے لیکن ان کی خوشگوار یادوں کا سفر ابھی بھی جاری ہے جو تا ابد جاری رہے گا۔ علم کے پیاسے ان کے بحر علوم سے اپنی تشنگی مٹاتے رہیں گے۔ خواجہ دل محمد ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ و تابندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ڈار خاندان کی لاہور شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان کے آباو اجداد چونکہ کشمیر (مقبوضہ) کے دروں کی حفاظت کرتے تھے لہٰذا انہیں دریا ڈار کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ خلیفہ بھی ان کا خاندانی نام تھا۔

خلیفہ عبدالحکیم ۱۳ جولائی ۱۸۹۴ء کو اپنے جدی مکان "مبارک حویلی" واقع اندرون اکبری دروازہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خلیفہ عبدالرحمٰن تھا۔ آپ جس گھر میں پیدا ہوئے اس میں ابوالفضل اور فیضی (اکبر کے رتن) کے والد شیخ مبارک علی رہتے تھے' اسی نسبت سے اس کا نام مبارک حویلی پڑا۔

خلیفہ عبدالحکیم نے ابتدائی تعلیم انجمن حمایت اسلام سکول واقع اندرون موچی گیٹ سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد ایف سی کالج میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا لیکن سائنس سے رغبت نہ ہونے کی وجہ سے اس کالج کو چھوڑ کر علی گڑھ کالج میں آرٹس گروپ میں داخلہ لے لیا۔ فرسٹ ائیر میں آپ ڈیبٹ یونین کمیٹی کے صدر بنے اور یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ کوئی جونیئر اس کمیٹی کا صدر منتخب ہوا۔ علی گڑھ سے ایف۔ اے کرنے کے بعد سینٹ سٹیفن کالج دلی میں داخلہ لیا آپ کا مضمون فلسفہ تھا۔ ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی میں اول آکر فلسفہ کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس امتیاز پر آپ کو وظیفے کے علاوہ مہاراجہ قاسم بازار کا تمغہ ملا۔

اس امتحان کے بہت سے ممتحنوں نے اعتراف کیا کہ انہوں نے فلسفے کا ایسا شاندار پرچہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں سینٹ سٹیفن کالج دلی سے

ایم۔ اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا اور پنجاب بھر میں اول رہے۔ ایم۔ اے میں آپ نے "رومی" پر مقالہ لکھا۔

ایم۔ اے کے بعد لاہور کے لاء کالج میں داخلہ لیا اور ساتھ انگریزی اخبار "آبزرور" کی ادارت کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد وکالت کے بجائے تدریس کا شعبہ اپنایا اور ۱۹۱۹ء میں علامہ اقبال کی سفارش پر عثمانیہ یونیورسٹی کالج حیدر آباد دکن میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔

اس کالج میں علامہ اقبال کو پروفیسر فلسفہ کی دعوت ملی تھی مگر آپ نے اپنی جگہ خلیفہ عبدالحکیم کی سفارش کی اور وزیر اعلیٰ حیدر آباد کے نام خط لکھا کہ جو آدمی میں بھیج رہا ہوں آپ محسوس کریں گے کہ یہ بھی اقبال ہی ہے۔ اقبال کے یہ الفاظ بلاشبہ خلیفہ عبدالحکیم کی ذہانت و قابلیت کی سند ہیں۔

دو سال بعد آپ عثمانیہ یونیورسٹی سے سکالرشپ لیکر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کیلئے ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی میں داخل ہو گئے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی میں آپ کے مقالے کا عنوان "رومی کے مابعد الطبیعیات" تھا۔

۱۹۲۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر کے وطن واپس آئے۔ واپس آکر حیدر آباد دکن میں رہائش اختیار کر لی اور دوبارہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔

۱۹۴۳ء میں امرسنگھ کالج سری نگر (مقبوضہ کشمیر) کے پرنسپل منتخب ہوئے۔ کچھ عرصہ وہیں پر ناظم تعلیمات بھی رہے۔ مہاراجہ کشمیر سے اختلافات کی بناء پر ۱۹۴۷ء میں اس عہدے سے استعفیٰ دیدیا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ فنون کے ڈین آف آرٹس کے طور پر کام کرنے لگے۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۴۹ء میں لاہور آگئے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔

اس ادارے کا مقصد تھا کہ اسلامی نظریات کو عملی شکل دی جائے اور اسلام کی ابدی تعلیمات اور مسلمانوں کے ثقافتی اور علمی کارناموں کو جدید زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اس نازک دور میں ملک و قوم کی قابل قدر علمی خدمت کی اور زندگی کے آخری دس سال اس ادارہ کے استحکام کیلئے وقف کر دیئے۔

اس عرصے میں آپ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں کی دعوت پر مختلف تقریبات میں پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے اور اسلامی تشخص کو اجاگر کرتے رہے۔ بحیثیت مسلمان انہیں اسلام اور رسول خدا سے گہری عقیدت تھی۔ آپ کی زندگی از اول تا آخر مذہب ہی سے روحانی اکتساب کرتی رہی۔ بے پایاں علم و فضیلت کے باوصف خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی میں سادگی، عجز و انکسار اور جذبہ خدمت انسانی بہت نمایاں تھا۔ آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ افکار غالب ۲۔ فکر اقبال ۳۔ تشبیہات رومی ۴۔ حکمت رومی، داستان دانش، ابتدائی کتب میں انہوں نے غالب، اقبال اور رومی کے افکار کی تشریح بہت دل کش تنقیدی اسلوب میں پیش کی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی نثر سادہ اور دل کش ہے اس وجہ سے ان کی تحریروں میں مشکل اور دقیق فلسفیانہ مطالب نہ صرف آسان ہو گئے ہیں بلکہ دل چسپ اور دل کش بھی نظر آتے ہیں بہت کم مصنف اردو میں ایسے ہوں گے جن کے ہاں علم اور حسن انشاء کا اتنا عمدہ امتزاج ملتا ہو گا۔ ان کی کتاب "داستان دانش" کا موضوع فلسفہ ہے لیکن اس کا اسلوب نگارش اس قدر دلنشین سلیس اور عام فہم ہے کہ فلسفے پر ادب کا گمان ہوتا ہے۔

بطور شاعر انہیں نظم گو کے طور پر بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اقبال، آغا حشر کاشمیری اور محمد علی جوہر جیسی عظیم شخصیات نے آپ کی فکر اور نظموں کے فنی حسن کی دل کھول کر داد دی۔

اس کے علاوہ مختلف ادبی رسائل ہمایوں، صحیفہ، ماہ نو، اقبال اور ثقافت میں آپ کے تقریباً ستر علمی و ادبی مقالات مختلف اوقات میں شائع ہوئے۔ آپ نے مختلف انگریزی کتابوں کے خوبصورت اردو تراجم بھی کئے۔

علم و ادب کا یہ بحر بیکراں ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو کراچی میں ڈاکٹر ممتاز حسین کی رہائش گاہ پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ آپ کے جسد خاکی کو بذریعہ جہاز کراچی سے لاہور لا کر قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کیا گیا۔

سیف الدین سیف

سیف الدین سیف ۲۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو کوچہ کشمیریاں چوک لاہ گڑھ' امرتسر کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد کا مسکن کشمیر تھا لیکن آپ کے پردادا کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر آ گئے اور پھر یہی علاقہ اس خاندان کی شناخت کا ذریعہ بنا۔

آپ کے والد کا نام خواجہ معراج الدین تھا جو تمباکو کا کاروبار کرتے تھے۔ خواجہ معراج الدین نیک صفت اور درویش منش آدمی تھے۔ سیاسی' عملی اور ادبی حلقوں میں انہیں نہایت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سیاسی طور پر وہ خاکسار تحریک سے وابستہ تھے۔ مذاق شعر و سخن بھی بڑے اعلیٰ درجے کا تھا۔

سیف الدین سیف کی عمر جب ڈھائی برس ہوئی تو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ سیف کا بچپن امرتسر کی گلیوں میں گزرا۔ سیف کا تعلق چونکہ کاروباری گھرانے سے تھا اس لیے خاندان والوں کا خیال یہ تھا کہ سیف کو تعلیم دلوانے کے بجائے کاروبار کی طرف لگایا جائے لیکن سیف کو کاروبار سے رغبت نہ تھی اس لئے وہ اپنے گھر والوں سے چھپ کر ایک نائٹ سکول میں جانے لگے۔ یہاں ایک پنڈت جی پہلی سے چوتھی جماعت تک بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے تھے۔ یہیں سے سیف نے ابتدائی عمر میں ہی اردو میں کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد انسپکٹر آف سکولز کے پرزور اصرار اور سیف کی ذہنی قابلیت کی بدولت انہیں مسلم ہائی سکول امرتسر میں داخل کروایا گیا۔ اس سکول میں سکھ اور عیسائی بچوں کے مقابلے میں صرف دو مسلمان طلبہ زیر تعلیم تھے۔

سیف اس ماحول کے عادی نہ ہو سکے اور چند ماہ بعد یہ سکول چھوڑ کر چشتیہ ہائی اسکول امرتسر میں داخل ہو گئے۔

یہ دور سیاسی اور مذہبی حوالے سے نہایت پر آشوب تھا اور اس زمانے میں خاکسار تحریک کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ تحریک اپنے مقاصد اور طریقہ کار کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت مقبول تھی۔ یہی سبب تھا کہ سیف بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس تحریک میں شمولیت کے سبب دو مرتبہ گرفتار ہوئے اور اس وجہ سے ایک تعلیمی سال ضائع ہو گیا۔ سیف الدین سیف نے میٹرک کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ میٹرک کرنے بعد سیف ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر ایم۔ ڈی۔ تاثیر اس کالج کے پرنسپل تھے اور فیض احمد فیض انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان علمی و ادبی شخصیات کے قرب سے سیف میں ذوق ادب پیدا ہوا اور آپ کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھرپور طریقے سے حصہ لینے لگے۔ ایف۔ اے اسی کالج سے پاس کیا۔ اس کے بعد بوجوہ بی۔ اے کا امتحان نہ دے سکے اور آپ کی تعلیم کا سلسلہ یہیں ختم ہو گیا۔

سیف الدین سیف کو لکھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ فرسٹ ائیر میں ریڈیو کیلئے ڈرامے لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے پر باقاعدہ طور پر شعر و شاعری کی طرف آ گئے۔ اس زمانے میں آپ کی دو طویل نظمیں "ساربان" اور "مسافر" ریڈیو پر ڈرامائی شکل میں پیش ہوئیں تو فلمی دنیا کے چند لوگ آپ کی شاعری سے متاثر ہو کر آپ کے پاس آئے اور فلمی دنیا میں کام کرنے کے پیش کش کی۔

۱۹۴۵ء کے آخر میں بی۔ آر چوپڑہ کے لئے فلمیں لکھنا شروع کیں اور اس طرح فلم کی دنیا سے وابستہ ہو گئے۔ اس دوران آپ لاہور کی فلمی صنعت کیلئے بھی کام کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور فلمی صنعت کے ساتھ آپ کا مستقل تعلق قائم ہو گیا جو ۳۵ برس تک جاری رہا۔ آپ کی شعری تخلیقات کا پہلا مجموعہ "خم کاکل" کے نام سے ۱۹۴۸ء

میں شائع ہوا۔ پہلا ایڈیشن بغیر کسی تقریظ اور دیباچے کے شائع ہوا لیکن دوسرے ایڈیشن میں فیض احمد فیض کے مضمون شائع شدہ روزنامہ "امروز" کو بطور دیباچہ شامل کر دیا گیا۔ اس مجموعے کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں اس مجموعے میں سو غزلیں، انیس نظمیں اور چھ گیت شامل ہیں۔

خم کاکل کی غزلوں میں بھرپور جذباتی کیفیات کا اظہار نمایاں ہے لیکن ساتھ ساتھ آپ کی نظموں میں آشوب زمانہ کا گہرا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ اس طرح زندگی آموز اور زندگی آمیز صورت سامنے آتی ہے، جس میں ذاتی تجربات کے حوالے سے خارجی زندگی کے حالات و واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

آپ کی نظموں میں خارجی حقائق اور مناظر کے حوالے سے اپنی ذات میں جھانکنے کی کوشش نمایاں ہے اور ان کے اثرات کو داخلی جذبات کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے سیف کے اظہار ابلاغ میں سادگی ہے۔ سیف نے غزل کے تشنہ موضوعات کو نظم میں بطور خاص برتا ہے مثلاً" رات، تلاش، رخصت، ملاقات وغیرہ یوں تو سیف عشقیہ شاعری کے علمبردار ہیں تاہم وہ اپنے معاشرے اور ماحول سے وابستگی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں "ساربان" اور "مسافر" اس کی غماز ہیں حب الوطنی کے موضوع پر لکھی جانے والی ان کی نظمیں "میرے محبوب وطن" اور "بول ارض پاک" لازوال نظمیں ہیں۔

سیف الدین سیف گیت نگار کے طور پر اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے گیتوں میں گیت کی روایت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ گیت کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس میں محبت کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے، سیف نے ان نازک جذبات کو خوبصورت پیرایہ عطا کیا ہے۔ آپ نے فلمی گیتوں میں موضوعات کو وسعت عطا کی اور خوبصورت گیت لکھے جو زبان زد عام و خاص ہوئے۔ ان کے معروف فلمی گیت درج ذیل ہیں:

آئے موسم رنگیلے سہانے جیا نہیں مانے
تو چھٹی لے کر آ جا بالما

تھا یقیں کہ آئیں گی یہ راتاں کبھی
ان سے ہوویں گی ملاقاتاں کبھی

سیف کی شاعری سماج کے مسائل اور زندگی کے حقائق کو حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کرنے کا بدرجہ اتم کمال رکھتی ہے۔ اس کی جھلکیاں ان کی کتاب "خم کاکل" اور بعد میں شائع ہونے والی شعری کتب "محراب" اور "کف گل فروش" میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ وہ غم کی عکاسی بہت ہی مکمل اور متوازن انداز میں کرتے ہیں۔ وہ ندرت افکار کے بیان کیلئے ندرت الفاظ کا انداز اپنا کر معنی آفرینی کی ایسی کیفیت پیدا کرتے ہیں جس نے ان کی شاعری میں سحرکاری اور دل کشی پیدا ہوئی ہے۔

اس عظیم شاعر نے ۱۲ جولائی ۱۹۸۳ء کو وفات پائی اور قبرستان جی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور میں دفن ہوئے۔ آپ کی قبر مرکزی دروازے سے بالکل سامنے قبرستان کے اختتام پر جنوبی دیوار کے قریب واقع ہے۔

اس خوبصورت شاعر کی غزلوں اور گیتوں کی گونج ہمیشہ ہمارے کانوں میں گونجتی رہے گی۔ یہ خوبصورت اشعار اس کو ہمیشہ زندہ جاوید رکھیں گے۔

maablib.org

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالا ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے سعادت حسن منٹو کا تعلق منٹو خاندان سے تھا۔ آپ کے والد کا نام غلام حسن تھا جو حکومت پنجاب کے محکمہ انصاف میں سب جج تھے۔ منٹو خاندان کے مورث اعلیٰ خواجہ رحمت اللہ منٹو ہیں جو کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور آئے اور کشمیری بازار میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔

منٹو کی ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوا۔ روایت کے مطابق تین جماعت تک کی کتابیں گھر پر ہی والد سے پڑھیں اور چوتھی جماعت میں گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں داخل ہوئے اور اسی سکول میں میٹرک تک زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۲۸ء میں میٹرک کا امتحان دیا مگر اس میں فیل ہو گئے۔ میٹرک کا امتحان انہوں نے چوتھی کوشش میں درجہ سوئم میں پاس کیا۔ مگر اس مرتبہ بھی وہ اردو کے امتحان میں فیل ہو گئے۔ ۱۹۳۱ء میں ہندو سبھا کالج امرتسر میں آرٹس کے طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے مگر ۱۹۳۳ء میں ایف اے کے امتحان میں فیل ہونے کے بعد ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں بارھویں جماعت میں داخل ہوئے۔ اس کالج میں انہیں فیض احمد فیض، محمود الظفر اور پروفیسر عبدالبصیر پال جیسے اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ اسی کالج میں انہوں نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر کالج میگزین "ہلال" کا اجراء اور "اسلامک کلچر ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۳۴ء میں منٹو نے ایف اے کے امتحان میں دوبارہ شرکت کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس طرح ان کی تعلیمی زندگی کا باب یہیں پر بند ہو گیا۔

تعلیم کے میدان میں پے در پے ناکامیوں کی وجہ سے ان کی طبیعت پڑھائی کے کاموں سے اچاٹ ہو گئی اور وہ جوئے کی لت میں مبتلا ہو گئے۔ لیکن انہیں جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ انہیں اپنی صلاحیتوں کو اس طرح بے دردی سے ضائع کرنے کے بجائے ان کو درست انداز میں استعمال کرنا چاہیے۔ اس موقع پر ان کی ملاقات باری علیگ سے ہوئی جنہوں نے ان کے اندر چھپے ہوئے ادبی جوہر کو شناخت کیا اور منٹو کو یہ احساس دلایا کہ وہ ادبی میدان میں کامیابی و کامرانی کے جھنڈے گاڑ سکتا ہے۔ باری کی شخصیت کا منٹو پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ اور منٹو کا لگاؤ ادب سے بڑھتا چلا گیا۔ سعادت حسن منٹو نے اپنی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز وکٹر ہیوگو کی کتاب (of a condemmed Prisoner Thelast days) کے ترجمے سے کیا۔ اور ان کا یہ ترجمہ کتابی صورت میں ۱۹۳۳ء میں "سرگزشت اسیر کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب کو دوسری مرتبہ ہندوستانی لٹریچر کمپنی نے "پھانسی" کے عنوان سے شائع کیا۔

"سرگزشت اسیر" کی اشاعت کے بعد منٹو نے باقاعدگی سے روسی افسانوں کے تراجم کا سلسلہ شروع کیا جو "ہمایوں جیسے اہم رسالے میں شائع ہوتے رہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا ترجمہ "جادوگر" تھا جو دسمبر ۱۹۳۳ء کے "ہمایوں" میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ٹالسٹائی کے افسانے کا ترجمہ " شیطان اور یژب" افانیف کی کہانی کا ترجمہ "سپاہی اور موت" گورکی کے افسانے کا ترجمہ "چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ" کے نام سے شائع ہوئے۔ باری علیگ کی رہنمائی اور منٹو کی رفاقت کے سبب منٹو کے دوستوں حسن عباس اور ابوسعید قریشی نے بھی لکھنے کی طرف توجہ دی چنانچہ ان تینوں نے مل کر آسکروائلڈ کے ایک ڈرامہ "ویرا" کا اردو میں ترجمہ کیا جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ انقلاب روس کے موضوع پر لکھے جانے والے آسکروائلڈ کے اس ڈرامے کی اشاعت نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ برطانوی سامراج کے محلات میں ہل چل مچ گئی اور سعادت حسن منٹو کی ادبی اور عوامی سطح پر شناخت ہوئی۔

اسی دوران باری علیگ کے ساتھ مل کر انہوں نے ہفتہ وار اخبار

"خلق" جاری کیا۔ یہ اخباریوں تو صرف دو پرچوں کے بعد بند ہو گیا لیکن منٹو کی ادبی زندگی میں اس رسالے کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ منٹو کا پہلا طبع زاد افسانہ "تماشا" اس اخبار میں شائع ہوا۔ یہ افسانہ ۱۹۱۹ء میں وقوع پذیر ہونے والے جلیانوالہ باغ کے مشہور تاریخی حادثے کے پس منظر میں لکھا گیا تھا اور یہ کہانی موضوع اور پس منظر کے اعتبار سے حکومت کے لیے قابل قبول نہیں تھی لہٰذا اسے منٹو کے اصل نام کے بجائے فرضی نام سے شائع کیا گیا۔ "تماشا" کو تاریخ ادب میں اہم مقام حاصل ہے اور اسی سے منٹو کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔ اس افسانے کے بعد آپ کے روسی افسانوں کے تراجم کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا تو منٹو کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی۔ ان کی اسی شہرت کے پیش نظر "عالمگیر" اور "ہمایوں" جیسے موقر جرائد کے مدیران نے انہیں اپنے رسالوں کے روسی اور فرانسیسی ادب نمبر ترتیب دینے کا موقع دیا۔

۱۹۳۶ء میں منٹو بمبئی چلے گئے اور نذیر لدھیانوی کے فلمی رسالے "مصور" میں ملازم ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ "امپریل فلم کمپنی" میں بھی کام کرتے تھے۔ "مصور" کے بعد وہ ہفت روزہ "سماج" بمبئی میں چلے گئے۔ یہاں پر ان کا میلان فلمی کہانیاں لکھنے کی طرف ہوا اور انہوں نے فلم کمپنی "سروج مووی ٹون" کے لیے فلمی کہانی "کیچڑ" کے نام سے لکھی جسے "اپنی نگریا" کے نام سے فلما کر پیش کیا گیا۔ یہ فلم کافی کامیاب رہی۔ ۱۹۳۹ء میں منٹو کی شادی ہو گئی۔ "مصور اور سماج" کے بعد ہفت روزہ "کاروان" بمبئی میں بھی ملازم رہے۔ ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو (دلی) میں فیچر نگار اور ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ ریڈیو کی اس باقاعدہ ملازمت سے قبل بھی وہ ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھ چکے تھے۔ اس لیے اس شعبہ میں انہیں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی اور انہوں نے بڑی باقاعدگی اور تیزی سے ریڈیو کے لیے ڈرامے اور فیچر لکھنے شروع کر دیئے ان دنوں منٹو کی زود نویسی کا یہ عالم تھا کہ پروڈیو سر ڈرامے کا عنوان دیتے اور منٹو کی انگلیاں ٹائپ رائٹر پر انتہائی مختصر وقت میں ڈرامہ مکمل کر دیتیں۔

جنگ عظیم دوم کے دوران ریڈیو پر جنگ کے موضوعات پر سب سے پہلے منٹو نے ڈرامے اور فیچر لکھے۔ دلی میں قیام کا زمانہ ان کی زندگی کا پر مسرت دور تھا۔ یہاں پر ان کے رفقاء میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک ن۔ م راشد، رفیع پیر اور بنراد لکھنوی شامل تھے۔ منٹو نے اپنی زندگی کے بہترین افسانے اور ڈرامے اس دور میں لکھے۔ اسی دور میں ۱۹۴۲ء میں ان کا افسانہ "کالی شلوار" ادب لطیف لاہور میں شائع ہوا تو اس افسانے کو فحش قرار دیتے ہوئے پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کے خلاف تعزیرات ہند کی دفعہ ۲۹۲ کے تحت مقدمہ درج ہوا۔ اور ان کو جرمانے کی سزا سنائی گئی جسے بعد ازاں معاف کر دیا گیا اور اس افسانے کو فحاشی سے مبرا قرار دے دیا گیا۔

۱۹۴۴ء میں ان کی کتاب "دھواں" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اسے فحش قرار دے کر منٹو پر مقدمہ درج ہو گیا۔ اسی زمانے میں عصمت چغتائی کی کتاب "چوٹیں" شائع ہوئی تو اسے بھی فحش قرار دیدیا گیا اور عصمت کے خلاف بھی مقدمہ درج ہوا۔ منٹو کو جنوری ۱۹۴۵ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان دنوں منٹو شدید بیمار تھے لیکن پھر بھی لاہور عدالت میں پیش کیا گیا۔ عصمت اور منٹو ایک ہی عدالت میں پیش ہوئے تھے۔ یکم جون ۱۹۴۶ء کو سعادت حسن منٹو اور عصمت کو اس مقدمہ سے بری کر دیا گیا۔

بیماری اور مقدمے کے باوجود انہوں نے لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھا اور فلمستان لمیٹڈ کے لیے فلمی کہانی "آٹھ دن" لکھی جو بڑی کامیاب ہوئی اس فلم میں منٹو نے زخمی فوجی کا کردار ادا کیا تھا۔ اگست ۱۹۴۷ء تک منٹو فلمستان لمیٹڈ سے وابستہ رہے۔ یہاں پر مشہور فلمی ہیرو اشوک کمار کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے اور منٹو انہیں بڑا بھائی کہتے تھے۔

اگست میں فلمستان لمیٹڈ کو چھوڑ کر بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ میں ملازم ہو گئے۔ اس کمپنی سے منٹو کے علاوہ عصمت چغتائی، شاہد لطیف مشہور میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر وابستہ تھے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ کے مالکان کے ساتھ ناراضگی کے سبب منٹو لاہور آ گئے اور لکشمی مینشن مال روڈ میں مقیم ہوئے۔

لاہور آکر جب ان کی جمع پونجی ختم ہو گئی تو منٹو تنگ دستی کا شکار ہو گئے۔ اس عرصے میں فیض احمد فیض اور چراغ حسن حسرت نے روزنامہ "امروز" جاری کیا تو منٹو کو لکھنے کی دعوت دی۔ اس طرح پاکستان آکر انہوں نے از سر نو ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ انہی دنوں احمد ندیم قاسمی نے ادارہ فروغ اردو کے تعاون سے ادبی رسالہ "نقوش" شروع کیا۔ قاسمی نے منٹو کو اس رسالے کے لیے افسانے لکھنے کی دعوت دی۔ اس طرح منٹو نے پاکستان میں اپنا پہلا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" کے عنوان سے لکھا۔ احمد ندیم قاسمی اس کو پسند کرنے کے باوجود نقوش کی پالیسی سے ہم آہنگ تصور نہیں کرتے تھے' اس لیے شائع نہ کیا گیا۔

تاہم منٹو نے اگلے ہی روز دوسرا افسانہ "کھول دو" کے نام سے لکھ کر احمد ندیم قاسمی کے حوالے کر دیا۔ یہ افسانہ "نقوش" کے تیسرے شمارے اگست ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ حکومت کو یہ افسانہ امن عامہ کے مفاد کے منافی نظر آیا۔ چنانچہ ۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حکومت مغربی پنجاب نے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نقوش کی اشاعت چھ ماہ کے لیے بند کر دی۔ اس پر ادبی حلقوں میں شدید احتجاج کیا گیا۔ جس پر حکومت نے چھ ماہ کی مدت گزرنے سے پہلے ہی اس پرچے پر سے پابندی اٹھالی۔ منٹو نے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ مل کر "بلی" کے نام سے فلم بنائی لیکن وہ بری طرح ناکام رہی۔

ان کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" رسالہ جاوید (جس کے مدیر عارف عبدالمتین تھے) میں مارچ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا جس پر مقدمہ درج ہوا اور منٹو کو ۳ ماہ قید بامشقت اور ۳۰۰ روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ۲۱ دن کی قید کا حکم سنایا گیا۔ اور دیگر ملزمان پرنٹر' پبلشر' ایڈیٹر کو ۳۰۰ روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی۔ اپیل کرنے پر منٹو کی سزا صرف جرمانہ کر دی گئی۔

۱۹۵۰ء میں منٹو نے ہفت روزہ "نگارش" کی ادارت سنبھالی۔ یہ

رسالہ ایک ہلکا پھلکا نیم ادبی اور نیم سیاسی پرچہ تھا۔ یہ دور منٹو کی معاشی، پریشانیوں، ذہنی پریشانیوں اور ناشرین کی سرد مہری کا دور تھا۔ منٹو نے اپنی زندگی کے آخری پانچ سال ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء کشمکش میں گزارے۔ اس عرصہ میں شراب نوشی کثرت سے کرنے لگے۔ شراب کی حاجت نے انہیں قرض مانگنے پر مجبور کر دیا اور ان کے جاننے والے انہیں دیکھ کر قرض کے تقاضے کے خوف سے چھپنے لگے۔ ان کی ذہنی حالت بھی بدستور متاثر ہوتی چلی گئی۔ اسی سبب سے انہیں مینٹل ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ اس ہسپتال میں وہ تیرہ روز تک زیر علاج رہے۔ اس دوران انہیں کچھ افاقہ ہوا تھا کہ ان پر ایک اور افتاد آن پڑی کہ ان کا افسانہ "اوپر نیچے اور درمیان" کو کراچی کے ایک پرچے "پیام مشرق" نے منٹو کی اجازت کے بغیر شائع کر دیا۔ اس کی اشاعت پر کراچی سے منٹو کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے۔ کراچی عدالت میں پیش ہو کر منٹو نے اقبال جرم کر لیا اور انہیں اگلے روز ہی ۵۰ روپے جرمانہ کی سزا سنائی گئی جسے فوراً ادا کر دیا گیا۔

اس دوران ان کی بیماری میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان پر ہزیان کا حملہ ہو گیا۔ اور انہیں میو ہسپتال میں اسی بیڈ پر جگہ ملی۔ جس پر کچھ عرصہ قبل اختر شیرانی نے آنکھیں بند کی تھیں یہاں پر دو ماہ سترہ دن زیر علاج رہے اور نسبتاً بہتر ہو کر گھر آ گئے۔ اس کے بعد کا عرصہ زندگی کی تگ و دو میں گزارا۔

منٹو نے اردو ادب کی مختلف نثری اصناف، افسانہ، ڈرامہ، مضمون اور خاکہ میں طبع آزمائی کی ان کی تخلیقات درج ذیل ہیں۔

افسانوی مجموعے

آتش پارے (پہلا افسانوی مجموعہ)
منٹو کے افسانے
دھواں

لذت سنگ

چغد

افسانے اور ڈرامے

سیاہ حاشیے (پاکستان میں چھپنے والا پہلا افسانوی مجموعہ)

خالی بوتلیں' خالی ڈبے

ٹھنڈا گوشت

نمرود کی خدائی

بادشاہت کا خاتمہ

یزید

سڑک کے کنارے

سڑکنڈوں کے پیچھے

پھندنے (یہ مجموعہ اس ماہ شائع ہوا جس ماہ منٹو کی وفات ہوئی) وفات کے بعد چھپنے والے افسانوی مجموعے

شیطان' رتی' تولہ' ماشہ' طاہرہ سے طاہر' برقعے' شکاری عورتیں

ریڈیو ڈراموں کے مجموعے

آؤ' منٹو کے ڈرامے' جنازے' کروٹ' تین عورتیں

تراجم

روسی افسانے' گورکی کے افسانے' سرگزشت اسیر (ڈرامہ) ویرا (ڈرامہ) دو ڈرامے (ڈرامہ)

مجموعہ مضامین

تلخ ترش اور شیریں' اوپر نیچے اور درمیان

خاکوں کے مجموعے

گنجے فرشتے' لاؤڈ سپیکر

سعادت حسن منٹو نے بطور افسانہ نویس، ڈرامہ نگار، خاکہ نگار، مضمون نگار ایک بلند درجہ مقام حاصل کیا۔ ہندوستانی نثری ڈرامے کی تاریخ میں منٹو کو پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔ جنگ کے بارے میں ریڈیائی فیچر لکھنے میں انہیں اولیت حاصل ہے۔ نئے نئے تجربات سے منٹو نے نثری ڈرامے کے گرانقدر اضافے کیے اور آئندہ لکھنے والوں کے لیے راہ ہموار کی۔ ریڈیائی ڈرامہ کے شناسوں نے ان کی برتری تسلیم کی ہے۔ جو منٹو کے فن ڈرامہ نویسی کی عظمت کی دلیل ہے۔ اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں منٹو کا فن منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ منٹو نے خاکہ نویسی کا آغاز شخصی اور ذاتی تعلق کے حوالے سے کیا تھا لیکن انہوں نے شخصی ربط کو فن پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اعتدال اور توازن سے ہلکے پھلکے انداز میں انہوں نے اپنے موضوع کی شخصیت کے تمام گوشوں کو بے نقاب کیا۔ حقیقت بیان منٹو کے فن خاکہ نویسی کی بنیادی خوبی ہے۔ منٹو کے بعد میں لکھنے والوں کے خاکوں پر منٹو کے انداز کا واضح اثر ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین ان کے گہرے مطالعے اور فنی بصیرت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

سعادت حسن منٹو کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے۔ افسانے کی تاریخ کو جہاں سے بھی شروع کیا جائے منٹو کی عظمت تسلیم کیے بغیر یہ ادھوری رہے گی۔ منٹو کی افسانہ نگاری کے ۲۱ سال دراصل اردو افسانے کے ارتقاء و انتہا کی مکمل کہانی ہیں۔ منٹو کے پہلے دور کے افسانوں پر روسی افسانوں کا اثر غالب ہے دوسرے دور کے شروع میں ان پر موپساں کا اثر نظر آتا ہے۔

منٹو کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی حقیقت نگاری ہے اور ان کا بنیادی موضوع انسانیت ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں کے ذریعے اعلیٰ انسانی اقدار کی عظمت کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اور انسان اور انسانیت کی توہین کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ ان کے افسانے جہاں ایک طرف فنی تکمیل کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں وہاں ادب کی اس عالمی روایت کا تسلسل بھی ہیں جو معاشرے کے خلاف جدوجہد کی داعی ہے۔

منٹو کے ایسے افسانے جن میں جنس اور خصوصاً طوائف کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہمیشہ زیر بحث رہے۔ منٹو کے ان افسانوں کو اگر زمانی ترتیب اور سماجی پس منظر کے حوالے سے پڑھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ منٹو کی یہ کہانیاں بھی ان کے دوسرے افسانوں کی طرح یا تو مخصوص اور مختلف سماجی مسائل پیش کرتی ہیں یا انسانی احساسات کا خوبصورت نفسیاتی مطالعہ ہیں۔

منٹو سے قبل اردو افسانے کی روایت میں بغاوت کا عنصر موجود تھا مگر جس جرات، بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ منٹو نے جبر و استبداد کی قوتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ منٹو کو کسی کے ہاتھوں کسی کا بھی استحصال منظور نہیں۔ وہ ہر طرح کی بدحالی کے خلاف نبرد آزما رہے۔ ہر طرح کی برائیوں سے نفرت کرتے رہے۔ اور ان کے انہی احساسات کی تصویریں ان کے افسانوں میں مضمر ہیں۔ ان کے ہاں حقائق سے فرار نہیں وہ نیکی اور بدی کو جوں کا توں پیش کرتے ہیں۔ منٹو کے ہاں نہ مفاہمت ہے۔ نہ منافقت۔ اس لیے وہ منافقت و ریا کے پردے چاک کرتے رہے۔

سعادت حسن منٹو نے افسانے کی روایت کو نئے موضوعات ہی نہیں دیئے، اسالیب کا تنوع بھی دیا ہے۔ موضوع کی عظمت اور زبان و بیان کی انفرادیت کے امتزاج سے ان کی اکثر کہانیاں اردو ادب میں کلاسیک ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر بھی مقبولیت و شہرت رکھتی ہیں اور کئی غیر ملکی زبانوں میں ان کے تراجم ہو چکے ہیں۔

یہ عظیم افسانہ نگار ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو عالم آب و گل سے عالم ارواح کی جانب روانہ ہوا۔ منٹو کی آخری آرام گاہ علاقہ بڑا مکان، حضرت طاہر بندگی روڈ ملحق بہاول پور روڈ قبرستان میانی صاحب میں واقع ہے۔

منٹو اردو افسانے کا وہ روشن مینارہ ہیں جس کی شعاعیں صدیوں تک نثری کہانی کو منور کرتی رہیں گی۔ سعادت حسن منٹو آج دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن منٹو آج بھی زندہ ہے اور کل بھی زندہ رہے گا۔

سید وقار عظیم

سید وقار عظیم دسمبر ۱۹۰۹ء کو آلہ آباد میں پیدا ہوئے آپ کے والد سید مقبول عظیم آلہ آباد میں پولیس میں ملازم تھے۔ جب یہاں سے ان کا تبادلہ کانپور ہو گیا تو اس وقت وقار عظیم کی عمر پانچ چھ سال تھی۔ آپ کی سکول کی تعلیم کا آغاز کانپور سے ہی ہوا۔ سکول کی تعلیم سے پہلے انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنی والدہ سے حاصل کی۔ آپ نے گھر پر اپنی والدہ سے اردو' دینیات اور قرآن شریف پڑھا۔ ایک فارسی کی کتاب بھی والدہ صاحبہ سے پڑھی۔ آپ نے چھٹی جماعت تک تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول کانپور سے حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے والد کا تبادلہ کانپور سے اناؤ ہو گیا۔ اناؤ میں ان دنوں کئی شاعر مشہور تھے ان میں نواب جعفر علی خان اثر' جگت موھن' رضی بدایونی اور فرخ بنارسی وغیرہ ان کے والد کے پاس اکثر آیا کرتے تھے۔ اور شعرو سخن کی طویل محفلیں گرم ہوتیں۔ وقار عظیم کو ان شاعروں کے اکثر اشعار زبانی یاد تھے۔

گورنمنٹ ہائی سکول اناؤ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے ۱۹۳۴ء میں آلہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا ان کی پہلی دو کتابیں "افسانہ نگاری" اور "ہمارے افسانے" اس زمانے میں طبع ہوئیں۔ جب آپ ایم اے کے طالب علم تھے۔ آپ نے ایم اے میں پوری یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ انہی دنوں یونیورسٹی کے ایک استاد ڈاکٹر حفیظ سید کچھ عرصہ کے لیے یورپ گئے ہوئے تھے چنانچہ ان کی جگہ آپ عارضی طور اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے تعینات ہو گئے۔ یہ ملازمت تقریباً" چھ ماہ تک جاری رہی اس کے بعد آپ واپس کانپور تشریف لے آئے۔ یونیورسٹی میں پہلی

پوزیشن حاصل کرنے پر آپ کو دو سال کے لیے وظیفہ مل گیا۔ آپ نے گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کام تلاش کرنا شروع کیا۔ اس دوران ترجمہ کا کام کیا اور کچھ درسی کتابیں لکھیں بعض درسی کتابیں منظور بھی ہوئیں اور یہ انڈین پریس اور (الہ آباد) کے نرائن لعل نے شائع کیں۔ الہ آباد کے قیام کے دوران میں رسالہ "بچوں کی دنیا" اور اسکاوٹ کی ادارت بھی کرتے رہے۔

آپ نے جامعہ ملیہ میں ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۲ء تقریباً" پانچ سال تدریسی فرائض انجام دیئے۔ آپ کی زندگی کا یہ عرصہ خاص اہمیت رکھتا ہے یہاں آپ نے گاندھی جی کی سوانح عمری "تلاش حق" اور جواہر لال نہرو کی آٹو بائیو گرافی اور ورلڈ ہسٹری کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا۔ ۱۹۴۲ء میں جامعہ کی مالی حالت دگرگوں ہونے کی وجہ سے آپ نے جامعہ کو خیرباد کہا اور "پولی ٹیکنیک" کے نام سے تعلیم و دستکاری کے ادارہ سے بحیثیت اردو کے پروفیسر وابستہ ہو گئے۔ یہاں آپ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک رہے اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں حکومت کے پرچہ "آجکل" (دہلی) کے مدیر ہو کر دہلی چلے آئے ابھی آپ آج کل میں ہی تھے کہ پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور آپ اور "آج کل" کا سارا عملہ اپنی خواہش پر پاکستان آ گیا۔ آپ یہاں کراچی میں رہائش پذیر ہو گئے یہاں آپ نے ماہ نو کے اجراء کی تجویز قبول کی اور اس کی ادارت آپ کے سپرد ہوئی۔ جنوری ۱۹۵۰ء تک اس کے ایڈیٹر رہے۔

سید وقار عظیم فروری ۱۹۵۰ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے تعینات ہوئے اور ستمبر ۱۹۷۰ء میں پہلے غالب پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ اس طرح پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں آپ نے تقریباً" ۲۰ برس تک معلمی کے فرائض انجام دیئے۔

وقار صاحب نے مختلف علمی اور تنقیدی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ہمارے افسانے

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے کو "ہمارے افسانہ نگار" کے

زیر عنوان رکھا گیا ہے۔
پہلے حصے میں نظری تنقید بیان کی گئی ہے دوسرے حصے میں عملی تنقید ہے۔

۲۔ فن افسانہ نگاری

یہ کتاب وقار عظیم کی پہلی کاوش ہے جو انہوں نے زمانہ طالب علم میں تحریر کی۔ اس وقت وہ ایم اے کے طالب علم تھے۔

۳۔ انشاء کی تعلیم

وقار صاحب کا بی ٹی کا مقالہ ہے جو بعد میں جامعہ ملیہ دہلی نے کتابی شکل میں ۱۹۴۳ء میں شائع کیا۔ یہ طالب علموں کو انشاء پرداز سکھانے کے لیے ہے۔ یہ انشاء کے موضوع پر ایک بہترین کتاب ہے۔

۴۔ نیا افسانہ

یہ کتاب دو عنوانات کے تحت لکھی گئی ہے پہلا عنوان "نیا افسانہ" اور دوسرا "نئے افسانہ نگار" ہے۔

۵۔ بچوں کی چہار درویش

باغ و بہار کے چاروں درویشوں کی کہانی کو سادہ زبان میں لکھا ہے۔

۶۔ ہماری داستانیں

ہماری داستانیں وقار صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن کا تعلق داستانوں سے ہے ہماری داستانیں ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے ہماری داستانیں وقار صاحب کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے۔

۷۔ داستان سے افسانے تک

مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔

اس کے علاوہ درج ذیل دیگر کتب آپ کے زور قلم کی یادگار ہیں۔

- فن اور فنکار
- علامہ راشد الخیری
- باغ و بہار (مقدمہ)
- آغا حشر اور ان کے ڈرامے
- مثنوی گلزار نسیم کا مقدمہ
- اندر سبھا (شرح)
- فردوس برین (مقدمہ)
- اقبال شاعر اور فلسفی
- اقبالیات کا مطالعہ
- اقبال معاصرین کی نظر میں

سید وقار عظیم نے ۱۷ نومبر ۱۹۷۶ء کو لاہور میں وفات پائی اور میانی صاحب لاہور کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔

maablib.org

پروفیسر سجاد باقر رضوی

سجاد باقر رضوی ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ضلع اعظم گڑھ (یو۔ پی) کی تحصیل پھول پور کے گاؤں چمانواں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید علی سجاد تھا۔

سجاد باقر رضوی نے باقاعدہ تعلیم الہ آباد سے شروع کی۔ یو۔ پی بورڈ انڈیا سے ۱۹۴۲ء میں میٹرک کا امتحان بطور پرائیویٹ امیدوار پاس کیا۔ اسی بورڈ سے ۱۹۴۴ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی بطور پرائیویٹ امیدوار پاس کیا۔ ۱۹۴۶ء میں بی اے پاس کیا اور قیام پاکستان کے بعد مسلم لاء کالج سندھ یونیورسٹی کراچی سے ۱۹۵۱ء میں ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں بی اے آنرز کیا اور اسی یونیورسٹی سے ۱۹۵۶ء میں ایم۔ اے انگریزی کا امتحان پاس کیا اور یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔ اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۸۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے مقالے کا عنوان "طنز و مزاح کے نظریاتی مباحث اور کلاسیکی اردو شاعری ۱۸۵۷ء تک" تھا۔ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۳ء تک گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز میں میں انگریزی کے لیکچرار رہے۔ یکم جون ۱۹۷۰ء کو انہیں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ انگریزی مقرر کیا گیا اور بعد ازاں یہیں پر شعبہ اردو میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں پروفیسر کے عہدہ پر ترقی دی گئی اور ۱۹۹۰ء تک وقتاً فوقتاً وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اورینٹل کالج لاہور میں تشنگان علم کی پیاس بجھاتے

رہے۔ آپ کم و بیش ۲۳ برس تک شعبہ تدریس سے وابستہ رہے۔ سجاد باقر رضوی جدید اردو ادب کی ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ آپ جیسے جامع الصفات افراد بہت کم ہوتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعے "تیشہ لفظ" کے دیباچے میں انہیں ناصر کاظمی نے "شہری فریاد" قرار دیا تھا۔

آپ نے نثری و شعری ادب کی لازوال خدمت کی۔ انگریزی شاہکاروں کے خوبصورت اردو تراجم کئے اور تنقید ادب جیسے مشکل موضوع پر مبسوط اور جامع تصانیف رقم کیں۔ بطور استاد اورینٹل کالج ان کے بے شمار شاگرد آج اردو ادب میں بڑا معتبر نام رکھتے ہیں۔

آپ کی مندرجہ ذیل تصانیف قابل ذکر ہیں:

نثر

تہذیب و تخلیق، مغرب کے تنقیدی اصول، وضاحتیں، معروضات۔

شاعری

تیشہ لفظ، جوئے معانی

تراجم

جدید امریکی ناول نگار، داستان مغلیہ، افتادگان خاک، حضرت بلالؓ بدلتی دنیا کے تقاضے۔

متفرق کتب

غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں، قائداعظم محمد علی جناح معمار پاکستان۔

سجاد باقر رضوی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی علمیت، قابلیت اور ادبی خدمات کا اعتراف کیمبرج یونیورسٹی سے شائع ہونے والے گزٹ ہواز ہو ان پوئٹری (Who is Who in Poetry) میں آپ کا سوانحی خاکہ اور

تصانیف کی فہرست شامل کر کے کیا گیا۔ اسی طرح شکاگو (امریکہ) سے شائع ہونے والے گزٹ ہواز ہو ان دی ورلڈ (Who is Who in the World) میں آپ کو شامل کیا گیا۔ جو بلاشبہ آپ کی عظمت کی انمٹ دلیل ہے۔

دنیائے تدریس و ادب کا یہ درخشندہ باب ۱۳ اگست ۱۹۹۲ء کو اتفاق ہسپتال لاہور میں بند ہو گیا۔ آپ کی آخری آرام گاہ قبرستان ماڈل ٹاؤن جی بلاک میں واقع ہے۔

سجاد حیدر

سجاد حیدر ۲۴ دسمبر ۱۹۱۹ء کو "موہلہ" ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام نور حسین آذری تھا اور وہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ محکمہ تعلیم میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر سکولز کے عہدے پر فائز تھے۔ سجاد حیدر نے قرآنی تعلیم گھر سے حاصل کرنے کے بعد ابتدائی تین جماعتیں اپنے گاؤں میں واقع سکول سے پاس کیں اور بقیہ تعلیم مردان، بنوں، کوہاٹ اور پشاور میں مکمل کی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے بی۔ اے آنرز کیا اور ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔

سجاد حیدر نے ملازمت کا آغاز آل انڈیا ریڈیو سے کیا۔ آپ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو کے لاہور اسٹیشن پر سینئر پروگرام اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ اسی دوران پنجابی ڈرامہ "ہوا دے ہوکے" لکھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ ۱۹۵۴ء میں اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان لاہور مقرر ہوئے آپ بطور ڈائریکٹر آزاد کشمیر، پشاور اور حیدر آباد ریڈیو پر بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

دوران ملازمت انہوں نے پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کی طرف بھی بھرپور توجہ دی اور ۱۹۶۱ء میں (SYRACUSE UNIVERSITY) نیویارک امریکہ سے براڈ کاسٹنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے صحافت میں بھی ڈپلومہ حاصل کیا۔

سجاد حیدر کو ۱۹۷۲ء میں اسلام آباد ریڈیو پر کنٹرولر براڈ کاسٹنگ مقرر کیا گیا اور ۱۹۷۹ء میں ریڈیو کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ریڈیو پر آپ کی خدمات کا سلسلہ ۳۵ برس پر محیط ہے۔ اس دوران آپ نے ریڈیو پاکستان کی

طرف سے ایران، روس اور سنگاپور میں ہونے والے بین الاقوامی سیمیناروں میں شرکت کی اور پاکستان کی فنی ترقی کو دوسرے ممالک میں متعارف کروایا۔ مندرجہ بالا ملازمتی سرگرمیوں کے علاوہ مختلف ادبی تنظیموں اور انجمنوں کیلئے بھرپور خدمات سرانجام دیں۔ آپ "پنجاب آرٹس کونسل" کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۹ء آپ پنجاب آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر رہے۔ "پنجابی ادبی بورڈ" کے ڈائریکٹر رہے۔ اس حیثیت میں انہوں نے پنجابی لوک ادب اور جدید ادب کے حوالے سے متعدد کتب اپنی نگرانی میں چھپوا کر پنجابی زبان و ادب کی گرانقدر خدمت سرانجام دی۔ پنجاب آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر کے طور پر انہوں نے پنجابی زبان کے مشاعروں کے انعقاد اور پنجابی ثقافت کے فروغ کیلئے بہت کام کیا اور خصوصی طور پر "ہیر وارث شاہ" کو خوبصورت انداز میں از سرنو شائع کروایا۔

سجاد حیدر مختلف ادبی تنظیموں کے روح رواں ہونے کے ساتھ ساتھ اردو اور پنجابی کے بہت اچھے لکھاری بھی تھے۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ ہوا دے ہوکے (پنجابی ڈرامے)
۲۔ سورج مکھی (پنجابی ڈرامے)
۳۔ کالا تین (پنجابی ڈرامے)
۴۔ بول مٹی دیا باویا
۵۔ واریں (اردو) (پنجابی شاعری پر تنقید کی کتاب ہے)
۶۔ ریڈیائی صحافت
۷۔ چونویں کہانی
۸۔ چیتر باغ (پنجابی ناول)
۹۔ میرے ہمراہ دریا (اردو افسانے)
۱۰۔ Tile work in Pakistan

ان تصانیف کے علاوہ آپ کے مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین اور افسانے پنجابی رسائل لہراں "ماں بولی" "پنجابی ادب" اور اردو رسائل "

فنون" اور "ماہ نو" میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ امرتا پریتم کے رسالے "پنکاری" میں بھی کہانیاں لکھتے رہے۔

سجاد حیدر کی تحریر پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ ان کے مکالموں میں لوک گیتوں جیسی شیرینی اور کشش موجود ہے۔ان کے انداز میں شگفتگی اور روانی کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وہ پنجابی زبان و ادب کے فروغ کیلئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ ان کی یہ خدمات پنجاب میں پنجابی کی تاریخ کا اہم باب ہیں۔ انہوں نے خود کو صرف پنجابی زبان تک ہی محدود نہیں کیا بلکہ اردو اور انگریزی زبان میں اپنی بھرپور مہارت کا ثبوت دیا۔ انہوں ے پاکستان ٹیلی ویژن کیلئے پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو ڈرامے بھی لکھے اور اسی طرح اردو افسانے اور کہانیاں ان کی اردو ادب سے گہری شناسائی اور وسعت مطالعہ کی دلیل ہیں۔

سجاد حیدر کی تصنیف کردہ پنجابی کتابیں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے علاوہ مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں جو بلاشبہ ان کی ادبی عظمت کا برملا اعتراف ہے۔ ان کی اردو' پنجابی زبان اور ادب کیلئے خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

سجاد حیدر کا انتقال ۶ دسمبر ۱۹۹۶ء کو لاہور میں ہوا۔ آپ کی آخری آرام گاہ قبرستان جی بلاک ماڈل ٹاؤن کی مغربی دیوار بطرف ایڈن گارڈنز کے ساتھ واقع ہے۔

جہاں بھی زبان اور ادب کا ذکر کیا جائے گا' ریڈیو پاکستان کی کامیابیوں کی تفصیل رقم ہوگی سجاد حیدر کی خدمات کو ہمیشہ زریں الفاظ میں لکھا جائے گا۔

سید امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاج ۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو سید ممتاز علی کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کا تعلق حضرت امام رضا کی اولاد سے ہے۔ آپ کے والد سید ممتاز علی کا شمار مشہور بزرگوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے عورتوں اور بچوں کی اصلاح و تربیت کی خاطر دو اہم رسالوں "تہذیب نسواں" اور "پھول" کا اجراء کیا۔ ان کے مذہبی کارناموں میں ان کی کتاب "تفصیل البیان فی مقاصد القرآن" ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ مقبول و معروف یہ کتاب سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ سید ممتاز علی نے ۱۵ جون ۱۹۲۵ء کو وفات پائی۔

امتیاز علی تاج کی والدہ محمدی بیگم بھی گہرا علمی و ادبی ذوق رکھتی تھیں وہ سید ممتاز علی کی دوسری بیوی تھیں۔ سید ممتاز علی کی پہلی بیوی کا نام حمیدہ بیگم تھا جو دق کی بیماری کی وجہ سے ۱۸۹۵ء میں انتقال فرما گئی تھیں۔ سید ممتاز علی کی محمدی بیگم سے ۱۸۹۷ء میں شادی ہوئی۔ محمدی بیگم نہایت نیک دل، ہمدرد، غم خوار اور پاک نفس خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ سید ممتاز علی کے ساتھ ادبی میدان میں بھی ان کا بھرپور ساتھ دیتی تھیں اور خواتین کے رسالے "تہذیب نسواں" کی تدوین و ترتیب میں بڑی دل جمعی اور باقاعدگی سے حصہ لیتی تھیں۔ اس کے علاوہ محمدی بیگم نے خواتین کیلئے متعدد کتب تصنیف کیں۔ ان کا انتقال ۱۹۰۸ء میں ہوا۔

سید امتیاز علی تاج کی نشوونما علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ آپ کی والدہ تاج کو سلانے کیلئے بھی ادب کا سہارا لیتی تھیں اور مختلف کتابوں سے

لوریاں اخذ کر کے سنایا کرتی تھیں جنہیں بعدازاں تاج کے نام معنون کر کے شائع بھی کیا گیا۔ اور اس مجموعے کا نام "خواب راحت" رکھا گیا۔ گھر سے علمی و ادبی تربیت کا ابتدائی دور مکمل کرنے کے بعد تاج کنسیرڈ سکول میں داخل ہوئے۔ چوتھی جماعت کا امتحان اسی سکول سے پاس کیا اور سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں پانچویں کلاس میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اس ابتدائی دور ہی میں سکول سے جاری ہونے والے رسالے "رہنمائے تعلیم" میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ سکول کا یہ رسالہ ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موجب بنا۔ جس نے آگے چل کر امتیاز علی تاج کو ایک بہت بڑا ادیب اور ڈرامہ نگار بنایا۔ سنٹرل ماڈل سکول سے میٹرک کا امتحان ۱۹۱۵ء میں پاس کرنے کے بعد والدین کی خواہش کے مطابق گورنمنٹ کالج لاہور میں پری میڈیکل گروپ میں داخل ہو گئے۔ تاج کو فطری طور پر سائنس سے دلچسپی نہ تھی جس کے سبب ایف ایس سی کے امتحان میں فیل ہو گئے اور آرٹس مضامین کے ساتھ ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں آپ کی زیر ادارت رسالہ "کہکشاں" جاری ہوا۔ اس رسالے کی ترتیب میں آپ کے ساتھ عبدالمجید سالک شامل تھے اور دوسرے لکھنے والوں میں مولانا راشد الخیری، سر شیخ عبدالقادر، پطرس بخاری، عبدالحلیم شرر، علامہ نیاز فتح پوری اور قاضی عبدالغفار جیسے معروف ادیب شامل تھے۔ ان قلمی معاونین کی وجہ سے رسالہ شبانہ روز ترقی کرتا رہا اور جلد ہی یہ رسالہ ہندوستان کا مقبول رسالہ بن گیا۔ عبدالمجید سالک کے اخبار "زمیندار" میں چلے جانے کے بعد یہ رسالہ اپنی آب و تاب برقرار نہ رکھ سکا۔ امتیاز علی تاج اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے سبب اس پر بھرپور توجہ نہ دے سکے اور یہ رسالہ مستقل طور پر بند ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء میں تاج نے بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔ یہ امتحان تاج کی ادبی زندگی میں اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک دن وہ جب کمرہ امتحان میں بیٹھے اپنا پرچہ حل کر رہے تھے تو اچانک ان کے ذہن میں ڈرامہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اسی وقت انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈرامے کا خاکہ تیار کیا اور امتحان سے فارغ ہونے کے بعد اس کو باقاعدہ الفاظ کا جامہ پہنانا

شروع کر دیا۔ دوسری مصروفیات کے ساتھ ساتھ اس ڈرامے کی تصنیف کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ایک سال بعد ۱۹۲۳ء میں یہ لازوال شاہکار ڈرامہ "انار کلی" مکمل ہوا۔ اس وقت آغا حشر ڈرامے کی صنف میں سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ تاج نے یہ ڈرامہ انہیں سنایا۔ حشر نے اسے خوب پسند کیا اور کہا کہ میں سمجھا کہ حشر کے بعد ڈرامہ ختم ہو جائے گا لیکن اردو ڈرامے کی بہار کے دن تو ابھی آ رہے ہیں۔ یہ الفاظ بلاشبہ تاج کی قابلیت و علمیت کا برملا اعتراف ہیں۔

امتیاز علی تاج نے متعدد مرتبہ اس ڈرامے کو سٹیج کرنے اور چھاپنے کی سعی کی لیکن بوجوہ کامیاب نہ ہو سکے بالآخر یہ شاہکار دس برس بعد ۱۹۳۲ء میں ادارہ دارالاشاعت پنجاب کے زیر اہتمام شائع ہوا' اس ڈرامے کے منظر عام پر آتے ہی آغا حشر کے بعد ڈرامے کی دنیا میں تاج کا طوطی بولنے لگا۔ امتیاز علی تاج نے اگرچہ اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن یہ ڈرامہ تاج کی پہچان ہے۔

گریجوایشن کی تکمیل کے بعد تاج اپنے والد کے اشاعتی ادارے دارالاشاعت کی تمام تر ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے اور پوری محنت اور لگن سے ادبی خدمت میں مصروف تھے۔ رسالہ "تہذیب نسواں" اور "پھول" کی ادارت بھی آپ ہی کے ذمہ تھی اور تصنیف تالیف کا سلسلہ الگ تھا۔ "پھول" کی ادارت کے زمانے میں انہوں نے اس رسالے کیلئے مزاحیہ مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جس کا نام "چچا چھکن" رکھا گیا۔ اس سلسلے کی بنیاد ایک انگریزی کتاب کے ترجمے پر رکھی گئی تھی۔ یہ مزاحیہ سلسلہ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول ہوا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۴ء کو ان کی شادی معروف ادیبہ حجاب امتیاز علی سے انجام پائی۔

سید امتیاز علی نے تمام زندگی رسالوں اور کتابوں کے درمیان گزاری۔ اس کے ساتھ ساتھ اسٹیج' ریڈیو اور فلم کیلئے بھی کام کرتے رہے۔ فلمی دنیا میں پنچولی فلم آرٹ کمپنی کیلئے اپنے دور کی کامیاب ترین فلم

"خاندان" لکھی جس نے کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ یہ فلم لاہور کے پیلس سینما اور دہلی کے موتی ٹاکیز میں عرصے تک دکھائی جاتی رہی۔ یہ فلم دہلی اور لکھنؤ کی قدیم روایات کا ایک مرقع تھا اس فلم کے مرکزی کرداروں میں نورجہاں اور شوکت حسین رضوی شامل تھے۔ اس کے موسیقار غلام حیدر خان تھے۔ اسی فلم کی بدولت ان فنکارون کی شہرت برصغیر پاک و ہند میں دور دور تک پھیلی۔ پنچولی فلم آرٹ کمپنی کیلئے آپ کی لکھی جانے والی دوسری کامیاب فلموں میں "زمیندار" "شہر سے دور" اور "پت جھڑ" شامل ہیں۔ پنچولی فلم آرٹ کمپنی کے علاوہ دوسری فلم کمپنیوں کیلئے بھی کامیاب فلمیں لکھیں جن میں "پگڈنڈی" "جھمکے" اور قیام پاکستان کے بعد "چن دے" "گلنار" "انتظار" اور زہر عشق شامل ہیں۔ ریڈیو کے لیے بھی بے شمار ڈرامے لکھے اور ان میں کام بھی کیا ان کے مشہور ریڈیو ڈراموں میں "قرطبہ کا قاضی" "کمرہ نمبر ۵" اور "خوشی" اہم ہیں۔

سید امتیاز علی تاج مجلس ترقی ادب کے ناظم بھی رہے۔ تاج کی نگرانی میں اس ادارے نے تقریباً ۲۰۰ کتب شائع کیں جو ان کی نمایاں علمی و ادبی خدمت ہے۔ حکومت پاکستان نے ان کی ادبی اور قومی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں "ستارہ امتیاز" کے گرانقدر اعزاز سے نوازا۔ ڈرامے پر تحقیق کرنے کے ضمن میں آپ کو صدارتی ایوارڈ عطا کیا گیا۔

آپ کی چند اہم تصانیف اور ان کے موضوعات درج ذیل ہیں:

۱۔ انار کلی

یہ ان کا لازوال شاہکار ہے۔ ڈرامہ انار کلی محض ایک فرضی کہانی پر مبنی ہے لیکن تاج کی تخلیقی قوت اور پرشکوہ الفاظ نے اس کو عظیم شاہکار بنا دیا ہے۔ اس کی مختصر کہانی یہ ہے کہ شہزادہ سلیم، اکبری دربار کی کنیز نادرہ سے محبت کرتا ہے۔ نادرہ اکبر کی منظور نظر ہے جس کو اس نے انار کلی کے خطاب سے نوازا ہوا تھا۔ انار کلی بھی شہزادے سے محبت کرتی ہے لیکن ایک اور کنیز

جس کا نام دلا رام ہے اور خود شہزادے سے محبت کرتی ہے' اس چیز کو برداشت نہ کرتے ہوئے ان کی محبت کا راز کھول کر انار کلی کی سزائے موت کا باعث بنتی ہے۔

۲۔ چچا چھکن

یہ تاج کی ایک ایسی تصنیف ہے کہ جس کو تالیف' تصنیف اور ترجمہ کا درجہ حاصل ہے۔ یہ ایک کردار کے بارے میں ان کے لکھے جانے والے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔

اس کتاب میں کل دس مضامین شامل ہیں۔ پہلے دو مضامین اخذ و ترجمہ ہیں ان دو مضامین کے عنوانات "چچا چھکن نے تصویر ٹانگی" اور "چچا چھکن نوچندی دیکھنے چلے" ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام مضامین تاج کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ جن میں چچا چھکن نے ایک بات سنی' چچا چھکن نے تیمارداری کی' چچا چھکن نے سب کیلئے کیلے خریدے وغیرہ شامل ہیں۔

امتیاز علی تاج نے چچا چھکن کے روپ میں اردو ادب کو ایک ایسا زندہ کردار عطا کیا ہے جو ہر عمر کے پڑھنے والوں کیلئے یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ چچا چھکن بزرگ قسم کے آدمی ہیں' جو ہر کام احتیاط کے ساتھ کرتے ہیں اور اسے پیچیدہ تر بنا دیتے ہیں۔ ان کی بوکھلاہٹ اور مضحکہ خیز حرکات دوسروں کو ہنسنے کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

۳۔ قرطبہ کا قاضی

یہ کتاب پانچ یک بابی ڈراموں پر مشتمل ہے۔ یہ پانچوں ڈرامے ترجمہ ہیں اور شوقیہ اداکاروں کیلئے سود مند ہیں۔

۴۔ شاہکار تصاویر

یہ کتاب ایسی تاریخی قدیم و جدید اعلیٰ تصاویر کا بیش قیمت مجموعہ ہے جو اپنی فنی خوبیوں کی وجہ سے محفوظ ہیں اور ہر زمانے میں بہترین تصاویر قرار

پاچکی ہیں۔ اس کتاب میں مشرق و مغرب کے باکمال استادوں کے منتخب شاہکاروں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

۵۔ بچوں کیلئے کتب

امتیاز علی تاج کی بچوں کیلئے لکھی جانے والی کتاب کی فہرست بہت طویل ہے ان میں سندر مرلی' ننھی کتاب' منی کتاب' ہماری کتاب' پرستان' چڑیا خانہ' پھولوں کی کلیاں' شہزادوں کی کہانیاں' جادو کی کہانیاں' بہادری کی کہانیاں' ٹھگوں کی کہانیاں' سمندری شہزادی' موت کا راگ وغیرہ شامل ہیں۔

ان کتب کے علاوہ ان کے مختلف انگریزی افسانوں' ناولوں اور ڈراموں کے اردو تراجم بھی موجود ہیں۔

امتیاز علی تاج کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو تمام عمر اردو ادب کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے جو نثری ادب تخلیق کیا وہ اردو ادب کا لازوال سرمایہ ہے۔

امتیاز علی تاج نے اردو ڈرامے کی روایت اور مغربی فن ڈرامہ نگاری سے استفادہ کر کے ڈرامے کو زندگی کا ترجمان بنا دیا۔ انہوں نے ڈرامے میں فنی وحدتوں کو پورے طور پر برقرار رکھتے ہوئے اسے عام انسانی سطح پر پیش کیا ہے۔ تاج ڈرامہ نویس اور ڈرامے کے نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے کہانی نویس بھی تھے۔ انہوں نے جو ادب بچوں کیلئے تخلیق کیا اور ان کیلئے جو کہانیاں لکھیں وہ بہت خوبصورت ہیں۔ ان کہانیوں کی بدولت انہوں نے بچوں کی دماغی اور روحانی تربیت کی ہے۔

بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول یہ عظیم ادیب ہر دور کے عوام میں ہمیشہ مقبول رہے گا اور اس کی تحریریں اسے ہمیشہ زندہ و جاوید رکھیں گی۔

اردو ادب کا یہ لافانی کردار ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو دو نامعلوم حملہ آوروں کے ہاتھوں زخمی ہو کر عدم کے سفر پر روانہ ہوا۔ آپ کی آخری آرامگاہ قبرستان مومن پورہ نزد چوک لاہور ہوٹل میکلوڈ روڈ میں واقع ہے۔

سید عابد علی عابد

جناب عابد علی عابد ۲۱ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ علمی اور ادبی ذوق دوہال اور ننھیال سے ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے پردادا مولوی رجب علی شاہ حکومت پنجاب میں میر منشی (چیف سیکرٹری) تھے۔ میرانیس ان کے پاس مرثیہ خوانی کے لئے آتے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے بھی مولوی رجب علی سے قریبی مراسم تھے۔ مولانا آزاد جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد لاہور آئے تو موچی دروازہ میں ان کا مکان عابد صاحب کے نانا سید احمد شاہ کے مکان کے بالکل ساتھ تھا۔ عابد صاحب کے دادا کا نام سید حسن علی شاہ تھا جو سپرنٹنڈنٹ پولیس ہو کر ریٹائر ہوئے۔ عابد صاحب کے والد سید غلام عباس فوج میں ملازم تھے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ڈیرہ اسماعیل خاں میں بسر ہوا۔ فوجی ملازمت کے سلسلے مین اکثر بیرونی ممالک کی سیاحت کے مواقع میسر آتے رہے۔ عابد صاحب کی والدہ بڑی نیک اور صابر خاتون تھیں۔ خاندان رنجشوں اور سختیوں کو شفقت سے رفع کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ عابد صاحب نے چھٹی جماعت تک تعلیم ڈیرہ اسماعیل خاں میں حاصل کی۔ اس کے بعد قلعہ گجر سنگھ لاہور میں دادا اور دادی کے پاس آ گئے۔ ان کے چچا سید نثار علی شاہ برطانیہ کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے بمبئی میں رہتے تھے۔ ان دنوں لاہور میں مقیم تھے۔ عابد صاحب نے ان سے انگریزی پڑھی اور اردو میں شعری ذوق بھی انہیں کی صحبت میں پیدا ہوا۔ جب آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے تو علم سے اتنا لگاؤ تھا کہ بازار میں جو نئی کتاب دیکھتے خود خرید لاتے۔ ان کی چھوٹی سی لائبریری میں تقریباً ۷۰ کتابیں موجود تھیں اور سارا دن کتب بینی ہی مشغلہ تھا۔

مولوی محمد حیات ایک پختہ کار مدرس تھے۔ ان سے عربی، فارسی اور حساب کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ عابد صاحب مشن ہائی سکول رنگ محل میں داخل ہوئے اور وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ اور اسکے بعد ہی رسالہ "ہزار داستان" میں لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد "ہزار داستان" اور بچوں کے رسالہ "نونہال" کی ادارت بھی ان کے ذمہ ہو گئی۔ زمانہ طالب علمی میں مولانا مجددی سے متاثر تھے۔ حکیم احمد شجاع سے بھی عابد صاحب کے قریبی تعلقات تھے اور حکیم صاحب کی ذہانت، شگفتہ کلامی اور خوش وضعی سے بہت متاثر تھے۔ حکیم صاحب نے انہیں انگریزی زبان کے پیچ و خم سے آگاہ کیا۔ زمانہ طالب علمی میں مولانا شاداں بلگرامی پروفیسر عربی و فارسی سے بھی فیض حاصل کیا۔ مولانا روحی اور حافظ محمود شیرانی ان کے استاد تھے جن سے عابد صاحب نے تحقیق و تنقید کے معاملے میں رہنمائی حاصل کی۔ اگرچہ قانون سے قدرتی لگاؤ نہ تھا لیکن والد کے کہنے پر لاء کالج میں داخلہ لیا اور امتیاز کے ساتھ قانون کی ڈگری لی۔ قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد گجرات میں بحیثیت وکیل ملازم ہو گئے۔ لیکن وکالت راس نہ آئی اور دو سال بعد لاہور واپس آ گئے۔ اس زمانے میں ایک وکیل بدیع الزماں کیکاؤس سے بڑی دوستی تھی جو بعد میں سپریم کورٹ کے جج ہو کر ریٹائر ہوئے۔ ایک اور دوست تصدق حسین خالد جو آزاد نظم کے بانی کہے جاتے ہیں درجہ اول کے مجسٹریٹ تھے ان سے ذاتی مراسم پیدا ہوئے۔ ان کی صحبت میں عابد صاحب نے موسیقی اور مصوری کا گہرا مطالعہ کیا۔

گجرات سے واپس لاہور آ کر عابد صاحب ادبی دنیا کے نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ انہی دنوں پطرس بخاری، تاثیر اور سید امتیاز علی تاج سے ملاقات ہوئی اور اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے فارسی میں داخلہ لے لیا۔

ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں ایف سی کالج لاہور میں دو سال کام کیا۔ اس زمانے میں فلم "پوترگنگا" کے مکالمے لکھنے کے سلسلے میں بمبئی

جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ سفر ان کے ذہنی تغیر کا باعث ہوا۔ بمبئی سے واپسی کے بعد عابد صاحب نے کھیل سٹیج اور سکرین کے متعلق معلومات سے بہت فائدہ اٹھایا اور اپنا وقت انہیں تخلیقی کاموں میں صرف کیا۔ بمبئی سے واپسی کے بعد دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ اورینٹل کالج لاہور میں اردو کی تدریس شروع کی۔ عابد صاحب ۱۹۴۷ء تک دیال سنگھ کالج میں پروفیسر رہے۔ اس کے بعد وہاں کے پرنسپل بن گئے۔ ان کے دور میں کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو فروغ ہوا اور طلبہ میں ڈرامہ لکھنے اور سٹیج کرنے کا جنون انہیں کی بدولت پیدا ہوا۔ دیال سنگھ کالج کے سالانہ رسالہ میں عابد صاحب نے افسانے اور ڈرامہ کی تکنیک کے متعلق بے شمار مضامین لکھے۔ ۱۹۵۳ء میں پرنسپل کے عہدے سے استعفیٰ دیا اور اسی سال مجلس ترقی ادب سے منسلک ہو گئے۔ یہ ادارہ اب بھی کلاسیکی کتابوں کو مرتب کر کے شائع کرتا ہے اور ان کے تنقیدی دیباچے لکھے جاتے ہیں۔ تین سال میں عابد صاحب نے کئی کتابوں پر مقدمے لکھے اور انہیں مرتب کر کے شائع کرایا۔ جون ۱۹۵۷ء میں رسالہ "صحیفہ" کی ادارت کا کام بھی سنبھال لیا اور دس سال تک بڑی محنت سے اس مجلّہ کا ادبی و تحقیقی معیار بلند قائم رکھا۔ مجلس ترقی ادب نے انہیں اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ گھر بیٹھ کر مجلس کے لیے کام کرتے رہا کریں کیونکہ ہر روز مجلس میں آنا جانا ان کی صحت پر بار گزرتا تھا۔

عابد صاحب کی پہلی بیوی سے سات بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ ان سب کی شادیوں کے فرائض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ ان کی دوسری بیگم بھی لاہور کے ایک زنانہ کالج میں فارسی کی پروفیسر تھیں اور عابد صاحب کی ادبی مصروفیتوں میں مدد و معاون ثابت ہوتی رہیں عابد صاب شکل و صورت کے اعتبار سے بڑے خوبصورت اور وجیہ انسان تھے۔ قد تقریباً" چھ فٹ' جسم چوڑا اور بارعب' سفید رنگ' کشادہ' پیشانی ان کی فضیلت اور علمیت کا اظہار کرتی تھیں۔ یار باش' زندہ دل انسان تھے۔ بڑے صاف ذہن کے مالک' صاف گو اور منہ پھٹ تھے۔ آناً" فاناً" ناراض ہو جاتے اور چشم زدن میں راضی ہو

جاتے۔ اس جذباتی طبیعت سے عابد صاحب کو بہت نقصان پہنچا۔ ادبی حلقے کے علاوہ عام لوگوں کے خیال میں بدمزاج اور منہ پھٹ انسان سمجھے جاتے تھے۔ اگر یہ خامی ان میں نہ ہوتی تو شاید اس سے دوگنی شہرت کے مالک ہوتے۔ حساس اس قدر تھے کہ اچھے بھلے دوستوں سے بھی نقصان اور برائی کی توقع رکھتے تھے۔ بے نیازی اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ اپنا ذاتی مکان نہ بنوایا اور ہمیشہ کرائے کے مکان میں گزر بسر کی۔

عابد صاحب کی غزلوں کے مجموعے "شب نگار بنداں" اور "بریشم عود" ہیں۔ غزلوں میں سادگی اور روانی ہے۔ مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو عابد صاحب کے یہاں روایت اور جدیدیت کا بہترین امتزاج ہے۔ حسن و عشق کے مضامین بیان کرتے ہوئے خوبصورت الفاظ جن میں موسیقی اور حسن کا امتزاج ہوتا ہے بکثرت استعمال کئے ہیں۔ اس لحاظ سے بعض غزلیں رنگینی و رعنائی کا مرقع ہیں۔

عابد صاحب کی تنقیدی تالیفات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اصول انتقادیات (۲) انتقاد (۳) شعر اقبال (۴) تنقیدی مضامین۔ متعدد کتب پر تنقیدی مقدمے ان کے علاوہ ہیں۔

عابد صاحب نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ ان میں سے معروف و مشہور تراجم درج ذیل ہیں۔

۱۔ بشر کیا ہے؟ یہ سنکلیر لوئیس کی کتاب Dodswarth کا ترجمہ ہے۔ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔

۲۔ داستان فلسفہ Will Durant کی کتاب The Story Philosoply کا ترجمہ جو دو جلدوں میں ہے۔ یہ ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

قیامت کی رات: ANight to Remember کا ترجمہ ہے۔

۴۔ میراث ایران: اے جے آر بری کی کتاب

ALegacy of Persia کا ترجمہ ہے۔

۵۔ ایران قدیم: History of Persia کی تلخیص ہے۔

۶۔ فنون لطیفہ اور انسان: Irwin Edman کی کتاب Art and the man کا ترجمہ ہے۔ ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔

۷۔ یہ ہے شمالی افریقہ جان گنتھر (John Gunther) کی کتاب This is North Africa کا ترجمہ ہے۔

۸۔ انا۔ ایک بنگالی ڈرامے کا ترجمہ ہے۔

ناول "شمع" عورتوں کے لیے ریڈیو پروگرام کے لئے لکھا گیا۔ بیشمار ڈراموں میں سے مشہور ڈرامے یہ ہیں: یدبیضا' آتش نمرود' عمر خیام' شام غریباں' جنگ آزادی' گلگشت مصلے۔

عابد علی عابد نے جنوری ۱۹۷۱ء کو وفات پائی۔ ان کا مدفن قبرستان مومن پورہ میکلوڈ روڈ میں واقع ہے۔

ساغر صدیقی

میکدے کی حدود میں ہوں گے
کیا بتائیں پتہ فقیروں کا

ساغر صدیقی ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن سہارنپور اور انبالہ کی آغوش میں گزرا۔ نام محمد اختر شاہ تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور علاقے کے بزرگ حبیب حسن خاں سے اردو میں مہارت حاصل کی اور یہیں سے ان کے اندر شاعری کا جذبہ پیدا ہوا۔ بچپن غربت میں گزرا مگر اس دور نے انہیں قناعت کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ جس کی جھلک ان کی آئندہ زندگی میں جا بجا نظر آتی ہے۔ ابتدائی طور پر ناصر حجازی کے تخلص کے ساتھ لکھنا شروع کیا مگر چند ماہ بعد اسے ناموزوں تصور کرتے ہوئے تبدیل کر کے ساغر صدیقی ہو گئے۔ سولہ سال کی عمر میں جامعہ السنہ الشرقیہ ہال امرتسر جو کہ علوم شرقیہ کی بہترین درسگاہ تھی کے ماہانہ طرحی مشاعروں میں شرکت شروع کر دی۔ ۱۹۴۴ء میں اردو مجلس کے نام سے ایک بزم ڈاکٹر تاثیر اور مولانا تاجور نجیب آبادی کے زیر سایہ قائم ہوئی تو اس کے مشاعروں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے۔ اس بزم کا مقصد اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی تھا۔ بہت کم مدت میں ساغر نے اپنے عہد کے بزرگ شاعروں سے اپنی صلاحیتوں کو منوا لیا اور تمام احباب ان کے فن سے متاثر ہوئے۔ اس دوران وہ جالندھر، لدھیانہ اور گورداسپور میں ہونے والے مختلف مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔

۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کے ساتھ ہی ساغر صدیقی امرتسر سے لاہور

آگئے اور دیو سماج روڈ پر واقع ایک ہوسٹل کے کمرے میں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد اس ہاسٹل کو خیرباد کر دیا اور دوستوں کے ہاں یا ہوٹلوں میں قیام کرنے لگے۔ انہی دنوں ساغر کے ذہن میں ایک خیال سا ابھرا کہ کیوں نہ پاکستان کا قومی ترانہ لکھ کر اسے فلمایا جائے کیونکہ اب تک پاکستان کا کوئی قومی ترانہ نہ تھا۔ چنانچہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ساغر صدیقی نے فدا شاہ جہاں اور نعیم ہاشمی کے ساتھ مل کر ایک ترانہ لکھا اور اسے اپنی آواز میں فلمایا۔ یہ ترانہ پہلی مرتبہ ریجنٹ سینما لاہور میں دکھایا گیا لوگوں نے اس ترانے کی خوب تعریف کی۔ اس طرح وہ پاکستان کے پہلے غیر سرکاری قومی ترانہ کے خالق بھی ہیں۔ قومی ترانے کی کامیاب فلم بندی کے بعد انہوں نے کشمیری حریت پسندوں کی جدوجہد آزادی پر انقلاب کشمیر کے نام سے فلم بھی بنائی۔ اس کے فلمی و ادبی رسالے "تصویر" کے ایڈیٹر ہو گئے اور ان کی دن رات محنت کے سبب اس رسالے نے بہت جلد عوامی مقبولیت حاصل کر لی۔ مختلف وجوہات کی بناء پر یہ رسالہ بند ہو گیا اور انہوں نے ایک فلمی اخبار جاری کیا مگر اقتصادی بحران کے سبب یہ اخبار غلام جیلانی نیازی کے ہاتھ پانچ روپے کے عوض فروخت کر دیا۔ جس لاہور میں انہوں نے اپنے بہتر مستقبل کے خواب دیکھے تھے اسی لاہور میں وہ عمر بھر روٹی کے محتاج رہے۔

۱۹۵۲ء میں ساغر کی دوستی فوٹو گرافر حفیظ قندھاری سے ہو گئی جو افیون اور چرس کا استعمال کثرت سے کرتے تھے۔ زمانے کی بے رخی اور قندھاری کی محبت نے ساغر کو بھی ان نشوں کا دلدادہ کر دیا اور یہ عالم مدہوشی مرتے دم تک اس پر طاری رہا۔

۱۹۵۸ء میں ساغر نے مارفیا کا استعمال شروع کر دیا جس سے ان کی حالت دن بدن بگڑتی چلی گئی ساغر صدیقی کہتے تھے کہ مارفیا اور چرس حلال اشیاء ہیں اور یہ نشہ بادشاہی ہے۔ اس نشے اور مدہوشی کی کیفیات کے باوجود ساغر کی شاعری عروج پر تھی۔ وہ جس مشاعرے میں بھی جاتے اپنے فن کی دھاک بٹھا دیتے۔ لائل پور کاٹن مل میں ملک گیر طرحی مشاعرہ ہوتا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں

جگر مراد آبادی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ مصرع طرح تھا:

"سجدہ گاہ عاشقاں پر نقش پا ہوتا نہیں"

مختلف شعراء کے بعد ساغر صدیقی نے اپنی یہ غزل سنائی:

ایک وعدہ ہے کسی کا جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
ہر شناور کو نہیں ملتا تلاطم سے خراج
ہر سفینے کا محافظ ناخدا ہوتا ہیں
ہر بھکاری پا نہیں سکتا مقام خواجگی
ہر کس و ناکس کو تیرا غم عطا ہوتا نہیں

غزل سنی تو جگر جھوم اٹھے مشاعرہ گاہ میں ہلچل مچ گئی۔ جگر نے اپنی باری آنے پر کہا کہ میری غزل کی ضرورت نہیں حاصل مشاعرہ غزل ہو چکی اور اپنی غزل کو اسٹیج پر ہی پھاڑ دیا۔

ساغر رات کو جب کسی فٹ پاتھ پر سوتے تھے تو دن کو ان کے سرہانے سے شعروں کے گلدستے نکلتے تھے۔ جب ساغر صدیقی نے صدر ایوب کا قصیدہ لکھا:

"کیا ہے صبر ہم نے ہمیں ایوب ملا"

تو صدر ایوب نے آپ کے ساتھ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب سیکورٹی آفیسر ساغر کو ساتھ لانے کیلئے ان کے ہاں پہنچے تو انہوں نے ساتھ چلنے سے صاف انکار کر دیا اور بے نیازی سے سگریٹ کی خالی ڈبیا پر ایک شعر لکھ کر صدر ایوب کو بھیج دیا۔ شعر یہ تھا:

ہم سمجھتے ہیں ذوق سلطانی
یہ کھلونوں سے بہل جاتا ہے

تنگدستی اور افلاس کے باوجود ساغر کے ہاں شان درویشی، خودداری اور بے نیازی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اسے دولت سے محبت نہ تھی وہ اپنی درویشی کی دنیا میں سرمست اور خوش تھا۔ اور ہر حال میں اسی کیفیت میں زندگی

بسر کرنا چاہتا تھا۔ ساغر کو اگر کچھ رقم کہیں سے مل جاتی تو وہ اسے دوسروں میں تقسیم کر دیتا اور خوش ہوتا۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے اسے سردیوں میں اوڑھنے کے لیے رضائی لا کر دی مگر وہ اس نے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے فقیر کو دیدی۔ ساغر کو عیش و آرام کی زندگی' نرم و نازک گدوں اور گرم چادروں سے محبت نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ فٹ پاتھوں پر بے سروسامانی کے عالم میں گزارا۔ اگر کوئی انہیں فٹ پاتھ پر لیٹے دیکھ کر بھکاری سمجھتا اور ان کی مدد کرتا تو وہ اسے بلا کر رقم لوٹا دیتے اور کہتے کہ میں فقیر ہوں' بھکاری نہیں ہوں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ساغر صدیقی نے قلم کی مدد سے وطن عزیز کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی۔ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے واقعہ نے ان پر گہرا اثر کیا اور انہوں نے چپ سادھ لی۔ ۱۹۷۳ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا جس میں ان کا دایاں بازو بیکار ہو گیا۔ زندگی کے آخری ایام انہوں نے انتہائی کسمپرسی کی حالت میں گزارے۔

ساغر ان فنکاروں میں سے تھے جو اپنے احساسات کے تند و تیز بہاؤ میں بہہ جاتے اور اپنے ہی تخلیقی جذبے کی آگ میں جل جاتے ہیں۔ زمانے نے پہلے اسے خوش پوش نوجوان شاعر کے طور پر دیکھا جس نے اپنے بے پناہ ترنم اور غزل کے شگفتہ لہجے کی بدولت بڑے بڑے مشاعرے لوٹ لیے اور آخر اس کا رنگ یہ تھا کہ میلے کپڑے' بکھرے بال' خاک آلودہ چہرہ کبھی کسی مزار کے سایے میں سستاتا اور کبھی دھرتی کا بستر بنا کر آسمان کا شامیانہ تان کر آرام کرتا۔ ساغر کی شاعری اس کے قلب کی آواز ہے۔ اس نے اپنے سچے جذبات کا اظہار کیا ہے اور اپنی درویشانہ کیفیت' مستی' جذب و بے خودی کی کیفیات کا خوبصورت اظہار کیا ہے۔ اس نے اپنی داخلی کیفیات کو خارجی ماحول سے ہم آہنگ کر کے اپنی غزل کا دائرہ وسیع کر دیا ہے اور یوں ساغر کا غم اور زمانے کی پر آشوبی باہم گلے ملتے نظر آتے ہیں۔

غم پسندی اور درد مندی اس کی غزل کا دل پسند موضوع ہے۔ یہ غم

پسندی جہاں ایک طرف حسرت، بے چارگی، یاسیت اور شکستگی کی صورت اختیار کر لیتی ہے وہاں غم کے مثبت پہلو بھی رکھتی ہے اور غم کو زندگی کی اصل معراج قرار دے کر پایہ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ ساغر کی غزل کے دوسرے موضوعات میں آوارگی، خمریات، داخلیت پسندی، عشق مجازی، عشق حقیقی، جدوجہد، لگن، عمل پیہم، ترقی پسندی، مادیت کی مخالفت، اپنے دور کی پر آشوبی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی پنجابی شاعری کا بنیادی موضوع رسول خدا کی ثناء ہے۔

ساغر صدیقی کہا کرتے تھے کہ لاہور میں بہت قیمتی خزانے دفن ہیں مگر انہیں آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو شاعری کا یہ عظیم شاعر بھی انہی خزانوں میں ۱۹ جولائی ۱۹۷۴ء کو شامل ہو کر قبرستان میانی صاحب میں آسودہ خاک ہوا۔ آپ کی قبر المشہور احاطہ شیخاں نزد ثریا عظیم وقف ہسپتال بہاولپور روڈ قبرستان میانی صاحب میں واقع ہے۔

maablib.org

ڈاکٹر سید عبداللہ

سید عبداللہ تحصیل مانسہرہ ضلع ہزارہ کے ایک گاؤں "منگور" میں ۵ اپریل ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ سید مشہدی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد سید نوراحمد شاہ صاحب علم اور صاحب طریقت بزرگ تھے۔ وہ شعبہ تدریس سے وابستہ تھے اور انشاء پردازی میں مہارت رکھتے تھے۔

سید عبداللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ قرآن مجید کی تعلیم، اردو کی درسی کتابیں، حساب، خوش خطی، فارسی اور ابتدائی خط نویسی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ گھر پر ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے گاؤں منگور کے پرائمری سکول میں براہ راست جماعت چہارم میں داخل ہو گئے۔ چوتھی جماعت کا امتحان اس سکول سے پاس کرنے کے بعد ۱۹۱۴ء میں مانسہرہ کے ڈسٹرکٹ بورڈ سکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ پھر گورنمنٹ ہائی سکول ایبٹ آباد اور انجمن حمایت اسلام سکول نمبر ۲ میں زیر تعلیم رہے لیکن قوانین کے مطابق پندرہ سال سے کم عمر ہونے کی وجہ سے میٹرک کا امتحان دینے کے لئے نااہل قرار پائے۔

۱۹۲۲ء میں لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور بمطابق قوانین منشی فاضل کے بعد ۱۹۲۲ء میں میٹرک، اسی سال ایف۔ اے اور ۱۹۲۴ء میں بی اے کا امتحان صرف انگریزی کے ساتھ پاس کر کے گریجوایٹ ہو گئے۔ (اس وقت یہ قانون تھا کہ منشی فاضل کا امتحان پاس کرنے والا صرف انگریزی کا اضافی امتحان پاس کر کے گریجوایشن تک ڈگری حاصل کر سکتا تھا)۔ ۱۹۲۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں ایم اے فارسی کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ ایم اے کی

کلاسیں چونکہ یونیورسٹی میں ہوتی تھیں اس لئے یونیورسٹی کے نامور اساتذہ حافظ محمود شیرانی اور پروفیسر اسمٰعیل سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ ایم اے فارسی کا امتحان ایک سال بعد ۱۹۲۵ء میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی قلمی کتابوں کے فہرست ساز بن گئے۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ریسرچ سکالر فارسی مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں ایم اے عربی میں داخل ہوئے اور یہ امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۲۴ء میں لائبریری سرٹیفکیٹ اور ۱۹۳۴ء میں جرمن زبان کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اور اسی سال پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں شعبہ عربی' فارسی کے مہتمم مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر آف لٹریچر (ڈی۔ لٹ) کی ڈگری حاصل کی۔ ڈی لٹ میں مقالے کا موضوع ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ تھا۔ یہ مقالہ انگریزی میں تھا بعد ازاں اس کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۱۹۳۵ء ہی میں اسلامیہ کالج پشاور میں استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں اورینٹل کالج لاہور آ گئے اور منشی فاضل کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے سبکدوش ہونے پر اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں صدر شعبہ اردو' ۱۹۵۴ء میں پرنسپل اورینٹل کالج اور ۱۹۵۹ء میں شعبہ عربی اورینٹل کالج کے اعزازی صدر مقرر ہوئے۔ سید عبداللہ ۲۵ فروری ۱۹۶۵ء کو چالیس سال تک تدریسی خدمات سرانجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں انہیں تاحیات پروفیسر اورینٹل کالج مقرر کیا گیا۔ ان تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف ادبی بورڈوں اور اکیڈمیوں کیلئے بھی گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ وہ چھ سال تک پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کے ممبر رہے۔

ان کی تصنیفی خدمات اردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:

(۱) اردو ادب جنگ عظیم کے بعد (۲) ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ (۳) نوادرالالفاظ خان آرزو (۴) شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ

نگاری کا فن (۵) بحث و نظر (۶) ارمغان علمی (۷) ولی سے اقبال تک (۸) نقد میر (۹) مقامات اقبال (۱۰) تعلیم کے مقاصد (۱۱) سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ (۱۲) ٹیف غزل (۱۳) منتخبات نثر اردو نصابی کتاب بی اے (۱۴) ٹیف نثر (۱۵) چند نئے اور پرانے شاعر (۱۶) مباحث (۱۷) میرامن سے عبدالحق تک (۱۸) نذر رحمن (۱۹) اشارات تنقید (۲۰) تعلیمی خطبات اور دوسرے مضامین (۲۱) اردو ادب ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۶ء (۲۲) درخت اور دریچے (۲۳) ٹیف اقبال (۲۴) سہل اقبال (۲۵) اطراف غالب (۲۶) سائل اقبال (۲۷) سخن ور نئے اور پرانے (۲۸) پاکستان میں اردو کا مسئلہ (۲۹) پاکستان تعبیر و تعمیر (۳۰) وجہی سے عبدالحق تک (۳۱) فارسی زبان و ادب (۳۲) متعلقات خطبات اقبال (۳۳) کلچر کا مسئلہ (۳۴) مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ (۳۵) مقاصد اقبال

ان تصانیف کے علاوہ متعدد تصانیف کی ترتیب و تصحیح کے ساتھ ان کے مقدمے اور حواشی لکھے۔ مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان کے تنقیدی، علمی مقالات ، مضامین جو اس وقت کے مشہور علمی و ادبی رسائل قومی زبان، اوراق، ماہ نو، چٹان، سویرا، ساقی، فروزاں، محور، المعارف، ہمایوں، ہم قلم، ضیابار، اردو نامہ، لیل و نہار، برگ گل، البلاغ وغیرہ میں شائع ہوئے ان کی تعداد (۶۰۰) چھ سو کے قریب ہے۔

سید عبداللہ کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہر شخص اور ہر دور پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہ وسعت مقدار کے ساتھ ساتھ معیار کو بھی حاصل ہے ان کی تنقید میں الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہے اور نہ ہی وہ سادگی ہے جو سپاٹ پن پیدا کر دے بلکہ ان کے ہاں فطری سادگی اور خوبصورتی دکھائی دیتی ہے۔

سید عبداللہ کو جو چیز دوسرے نقادوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا انداز اور موضوع کا تنوع ہے۔ وہ کسی بھی موضوع سے وابستہ ہو کر تعصب کا شکار نہیں ہوئے۔ ان کی تنقید میں بہتے ہوئے دریاؤں کی روانی پائی جاتی ہے۔

جو وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہو کر اپنے بہاؤ میں شامل کرتے ہوئے بہتا چلا جاتا ہے۔

سید عبداللہ کی تصانیف اور مضامین ان کے گہرے مطالعے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے گہرے مطالعے کے ساتھ ساتھ اپنے گہرے تنقیدی شعور کی بدولت اردو اور فارسی ادب کی مختلف جہات کو ہمارے سامنے پیش کر کے ادب کی بے مثال اور گرانقدر خدمت کی ہے۔

اس عظیم علمی و ادبی شخصیت کا انتقال ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو لاہور میں ہوا۔ آپ کی آخری آرامگاہ قبرستان جی بلاک گلشن راوی میں واقع ہے۔

سید عبداللہ اپنے علمی تبحر اور ادبی خدمت کی بدولت سدا زندہ و تابندہ رہیں گے۔

شیخ سر عبدالقادر

عبدالقادر نسباً قانون گو شیخ تھے۔ ان کے والد بزرگوار شیخ فتح الدین پنجاب کے ایک قدیم علمی مرکز اور مردم خیز شہر قصور کے رہنے والے تھے۔ شیخ عبدالقادر کی صحیح تاریخ پیدائش کا سراغ نہیں ملتا۔ سنہ پیدائش ۱۸۷۴ء ہے۔ شیخ صاحب کی ولادت کے زمانے میں ان کے والد شیخ فتح الدین بہ سلسلہ ملازمت لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں مقیم تھے۔

شیخ عبدالقادر نے ابتدائی تعلیم قصور میں حاصل کی پھر وہ لدھیانہ اپنے والد کے پاس چلے گئے اور اسکول میں داخل ہوکر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ یہاں ان کی ملاقات مولانا گرامی سے ہوئی جو اسی اسکول میں فارسی پڑھاتے تھے۔ شیخ عبدالقادر نے اپنے والد سے بھی فارسی پڑھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ لاہور چلے آئے اور ایف۔ سی کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے فرسٹ ڈویژن میں بی اے پاس کیا۔ اس وقت ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی اس لیے ملازمت کی تلاش ہوئی اپریل ۱۹۰۱ء میں انہوں نے اپنا شہرۂ آفاق مجلّہ "مخزن" جاری کیا جس نے دنیائے ادب میں ایک انقلاب برپا کیا اور اردو زبان کے ادبی ماہ ناموں میں بے مثال شہرت و مقبولیت حاصل کی۔

مخزن میں اس زمانے کے تمام بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر حالی، شبلی، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ مخزن کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ اس نے حکیم الامت شاعر مشرق علامہ اقبال اور موجودہ صدی کے کئی نامور ادیبوں اور شاعروں کو دنیائے ادب میں روشناس کرایا۔ ۱۹۰۴ء میں شیخ صاحب انگلستان تشریف لے

گئے اور وہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۷ء میں آپ نے تعلیم مکمل کی اور وطن واپس تشریف لے آئے یہاں آکر آپ نے ملازمت کی کوشش کی جس کے نتیجے میں آپ لائل پور میں سرکاری وکیل ہو گئے اور تقریباً" تیرہ برس تک اس منصب پر متمکن رہے۔ ۱۹۲۰ء میں لاہور آئے ۱۹۲۲ء میں چھ ماہ کے لیے لاہور ہائی کورٹ کے جج بنا دیئے گئے۔

۱۹۲۵ء میں آپ نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ میں آپ لیگ آف نیشنز کے ساتویں اجلاس میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ وہاں سے آنے کے بعد شیخ صاحب کو حکومت پنجاب نے قائم مقام و زیر مال بنایا۔ اس کے تین سال بعد یعنی ۱۹۲۹ء میں انہیں پبلک سروس کمیشن کا رکن نامزد کیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اس کے ایک برس بعد ۱۹۳۵ء کا نیا آئین نافذ ہوا تو وہ سیکرٹری آف سٹیٹ کے ممبر ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں دو ماہ کے لیے حکومت ہند کے قائم مقام وزیر قانون بنائے گئے۔ اس منصب سے فراغت پانے کے بعد شیخ عبدالقادر نے کچھ عرصہ وکالت کا سلسلہ جاری رکھا اور پھر بہاول پور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مقرر ہو گئے۔

۱۹۴۵ء میں کہن سالی کے باعث ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اب ضعف و نقاہت کی وجہ سے انہوں نے مزید کسی اہم سرکاری ذمہ داری قبول نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن انہیں اپنی قومی زبان اردو سے جو دلی لگاؤ اور جذباتی شیفتگی تھی اس نے انہیں اپنے فیصلے پر قائم نہ رہنے دیا۔ ۱۹۴۹ء میں جب پنجاب یونیورسٹی نے اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے اردو کی کلاس شروع کی تو شیخ عبدالقادر نے اعزازی طور پڑھانا شروع کیا اور زندگی کے آخری ایام تک اس سے وابستہ رہے۔

شیخ عبدالقادر جہاں ایک بہت بڑے ادیب، صحافی اور نقاد تھے وہاں وہ ایک بہت بڑے محب وطن اور خادم قوم بھی تھے۔ اگرچہ وہ عملی سیاست کے مرد میدان نہ تھے مگر انہیں اپنے وطن اور اہل وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ

ان کی اصلاح و فلاح کو دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور اس کے لیے جہاں تک ہو سکا انہوں نے عملی کوشش بھی کی تاکہ ان کا وطن اور اہل وطن غیروں کی غلامی کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکیں اور انہیں بھی آزاد اقوام میں ان کا جائز مقام مل سکے۔ وہ جانتے تھے کہ غلامی ایک ایسی لعنت ہے جس کے نتیجے میں فرد اور جماعت کی تمام فطری صلاحتیں نہ صرف زنگ آلود ہو کر رہ جاتی ہیں بلکہ مفقود ہو جاتی ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنے مضامین' مقالات' خطبات و مکاتیب میں اہل ہند کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص ملکی آزادی' ملت اسلامیہ کی سربلندی اور معاشرتی اصلاح کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔ آپ نے اپنے دلچسپ و بصیرت افروز مقالات و مضامین کے ذریعے قوم و ملک کی قابل قدر تہذیبی و اصلاحی خدمات انجام دیں۔

ان کے علاوہ آپ مختلف قومی انجمنوں میں سے انجمن حمایت اسلام لاہور سے مدت تک وابستہ رہے۔ اور مختلف حیثیتوں سے اس کی تعلیمی و رفاہی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ سرعبدالقادر جہاں ایک بہت بڑے محسن زبان اردو' ایک شگفتہ نگار انشاء پرداز' محقق' نقاد اور آسمان صحافت کے درخشندہ ستارے تھے وہاں وہ ایک مخلص حامی ملت اور بہی خواہ قوم بھی تھے۔ وہ بیسیوں رفاہی اداروں اور ثقافتی انجمنوں کے سرگرم رکن اور ایک پرجوش و فعال رکن بھی تھے۔ اس ضمن میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے ساتھ ان کے جو تعلقات تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

انہون نے پہلی بار ۱۸۹۳ء میں انجمن حمایت اسلام کے آٹھویں سالانہ جلسے میں شرکت کی اور کلمہ طیبہ کے موضوع پر ایک بصیرت افروز لیکچر دیا اس کے بعد اپنی وفات تک تن من دھن سے انجمن کی توسیع و ترقی کے لیے کوشاں رہے۔

مختلف اصناف ادب مثلاً" تنقید' تاریخ' ادب' سیاحت نامہ وغیرہ میں آپ کی کئی تصانیف یادگار ہیں۔ مستقل تصانیف و تراجم کے علاوہ آپ کے مضامین و مقالات کے بھی متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تصانیف کی فہرست

درج ذیل ہے۔

۱۔ دی نیو سکول آف اردو لٹریچر

The New School of Urdu Literature (انگریزی)

اردو کے جلیل القدر شاعروں اور نثر نگاروں کے بارے میں تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

۲۔ مقام خلافت

سفر استنبول کے حالات یعنی استنبول کے تفریحی، علمی، ادبی، ثقافتی اور معاشرتی حالات کا حسین مرقع ہے۔

یورپ و سوئٹزرلینڈ

یہ کتاب آپ کے دورۂ یورپ اور سوئٹزرلینڈ کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ رباعیات اکبر

اکبر آلہ آبادی کی اخلاقی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے لاجواب ہے۔

۵۔ دیوان غالب

غالب کے اردو دیوان کا پاکٹ ایڈیشن ہے کتاب کے شروع میں ۱۶ صفحات پر مشتمل دیباچہ اور ۱۰ صفحات پر مشتمل غالب کا سوانحی خاکہ ہے۔

۶۔ فیس اردو پوئٹس اینڈ رائٹرز

Face Urdu Poets and Writers (انگریزی)

اردو کے مشہور شعراء پر تنقیدی مضامین کا مرقع ہے۔

۷۔ اردو زبان و ادب

شیخ عبدالقادر کے ان لیکچروں کا مجموعہ ہے جو الہ آباد یونیورسٹی میں دیئے گئے۔

۸۔ انتخاب مخزن

بعنوان "کلام اردو" سرعبدالقادر و دیگر ادباء و شعراء کے مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔

۹۔ انتخاب مخزن

مختلف وقتوں میں شائع ہونے والے رسالوں (مخزن) کو مختلف جلدوں میں یکجا کر دیا ہے۔

۱۰۔ نذر اقبال

علامہ اقبال پر لکھی گئی شیخ عبدالقادر کی مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ اقبال کی کتاب "بانگ درا" کا دیباچہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

شیخ عبدالقادر ممتاز ادبی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی خوبیوں سے بھی مالا مال تھے۔ ان کی زبان کی تاثیر اور مٹھاس نے انہیں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔

شیخ عبدالقادر کا تعلق تابندہ ستاروں کے اس جھرمٹ سے ہے جس میں اقبال، مولانا ظفر علی خان، مولانا چراغ حسن حسرت، سجاد حیدر یلدرم، نادر کاکوروی اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق جیسی ہستیاں شامل ہیں۔

آسمان ادب کا یہ روشن ستارہ ۹ فروری ۱۹۵۰ء کو عدم کی تیرہ و تاروادیوں میں گم ہو گیا۔ آپ کا مدفن علاقہ بڑا مکان نزد مسجد قادری بٹالہ شریف والی طاہر بندگی روڈ قبرستان میانی صاحب میں ہے۔ ان کی قبر کے ساتھ ان کے معروف بیٹے منظور قادر اور زوجہ انوری بیگم کی بھی قبریں ہیں۔ ادب کی دنیا میں ان کا نام ہمیشہ جاوداں رہے گا۔

شیخ محمد اکرام

شیخ محمد اکرام چک جھمرہ ضلع لائل پور (فیصل آباد) میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا نام فضل کریم تھا۔ وہ بچوں کی تعلیم میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ شیخ محمد اکرام کا ابتدائی زمانہ چک جھمرہ میں بسر ہوا۔ اس کے بعد تعلیم کی غرض سے اپنے چچا محمد ناظر کے پاس وزیر آباد چلے آئے۔ مشن ہائی سکول وزیر آباد سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان لائل پور (فیصل آباد) سے کیا۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ پھر انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری لی۔ دوران تعلیم گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور کے رسالہ "بیکن" کے مدیر معاون بھی رہے۔ مباحثوں میں شرکت کر کے انعام بھی حاصل کئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ راوی کے ایڈیٹر بھی رہے۔

۱۹۳۰ء میں ایم اے کرنے کے بعد انڈین سول سروس کے مقابلے میں بیٹھے اور کامیاب ہوئے۔ ٹریننگ کے دوران انہوں نے انگلستان میں جیزس کالج آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ جرمن زبان میں بھی مہارت حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز ۱۹۳۳ء میں صوبہ بمبئی میں تقرری سے ہوا۔ یہاں مراٹھی زبان میں بھی مکمل مہارت حاصل کی۔ مرکزی حکومت ہند کی وزارت اطلاعات و نشریات میں ڈپٹی سیکرٹری مقرر ہو کر دہلی آ گئے اور ۱۹۴۷ء تک وہیں رہے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے اور زیادہ تر اطلاعات و نشریات کے محکمے سے منسلک رہے۔

۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۷ء تک مشرقی پاکستان میں کمشنر ڈھاکہ اور اس کے بعد ممبر بورڈ آف ریونیو کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں ایڈیشنل

چیف سیکرٹری مغربی پاکستان بنائے گئے۔ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء تک محکمہ اوقاف میں ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۶۵ء میں چیف سٹلمنٹ کمشنر، کسٹوڈین اور ممبر بورڈ آف ریونیو مقرر ہوئے۔ سرکاری ملازمت سے الگ ہونے کے بعد اپنی وفات تک ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے مدیر اعلیٰ رہے بہت سی کمیٹیوں کے اعزازی رکن رہے۔ ان میں ادارہ تحقیقات اسلامیہ پاکستان ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان "مجلس ترقی ادب لاہور" پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ اور تاریخ مسلمانان ہندو پاکستان کی مجلس انتظامیہ خاص طور پر قابل ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی نے انہیں ڈی لٹ کی اعزازی سند عطا کی۔

شروع ہی سے تحقیق و تالیف کا شوق تھا۔ ان کی تصانیف میں "آب کوثر" "رود کوثر" اور "موج کوثر" بہت مشہور و معروف کتابیں ہیں۔ یہ ہندی مسلمانوں کی ثقافتی، مذہبی اور فکری تحریکیں اور ان کے زعماء و قائدین کے حالات و کوائف پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ غالب اور شبلی کے سوانح بھی مرتب کئے۔

شیخ محمد اکرام نے تاریخی تسلسل سے قوم کی روحانی تاریخ مرتب کی اور خصوصاً" بزرگان کرام کے علمی و مذہبی کارناموں کو بڑی تفصیل و تحقیق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ غالب نامہ

شیخ اکرام کی مشہور ترین کتاب ہے۔ ۴۲۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دسمبر ۱۹۳۶ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے غالب کی زندگی کے حالات نہایت محنت سے رقم کئے ہیں۔ اس کے علاوہ "غم روزگار" کے تحت غالب کے مختلف سفروں کا حال، لال قلعہ اور عذر کے بارے میں عمدہ معلومات قارئین تک پہنچا دی ہیں۔ غالب شناسی کے متعلق ان کی دوسری تصنیف "ارمغان غالب" بھی ہے۔

۲۔ آب کوثر

اس کتاب میں شیخ محمد اکرام نے سرزمین پاک و ہند میں اسلام کی آمد فتح سندھ، محمد بن قاسم تا خاندان لودھی کے عہد بہ عہد حالات علماء صوفیا اور اولیائے کرام کے بارے میں سیر حاصل معلوم فراہم کی ہیں۔

۳۔ موج کوثر

اس کتاب میں ۱۸۰۰ء کے آغاز سے لے کر قیام پاکستان تک کی اہم مذہبی، فکری، قومی تحریکوں اور ان کے قائدین کے حالات درج ہیں۔

۴۔ رود کوثر

اس کتاب میں مغلیہ دور کی شخصیات اور مختلف تحریکوں سے متعلق معلومات درج ہیں۔ علاوہ ازیں برصغیر پر انگریزوں کے قابض ہونے تک واقعات دیئے گئے ہیں۔

۵۔ شبلی نامہ

شبلی نعمانی کی سوانح حیات ہے۔ اسے بعد میں اضافہ و تفاصیل کے ساتھ "یادگار شبلی" کے نام سے شائع کیا گیا۔

ارمغان پاک

اس کتاب میں برصغیر پاک و ہند کے فارسی شعراء کا کلام منتخب کر کے شائع کیا گیا ہے۔

۷۔ دربار ملی

یہ فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس میں غزنوی عہد سے لے کر مغلیہ دور تک کا نثری انتخاب شامل ہے۔ اس میں تصوف، تاریخ، علم، ادب مکاتیب، انشاء اور سوانح وغیرہ جیسے مختلف موضوعات ہیں۔

شیخ محمد اکرام کی تحریروں میں سادگی اور روانی کا عنصر غالب ہے۔ وہ

اپنے خیالات کو سادہ عام فہم الفاظ میں بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریریں طبیعت پر گراں نہیں گزرتیں اور قاری مکمل یکسوئی اور دلچسپی سے ان کے مطالعہ میں مگن رہتا ہے۔ وہ شکوہ الفاظ اور قافیہ پیمائی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں توازن اور اعتدال بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا قلم واقعات کی متحرک تصویریں کھینچتا چلا جاتا ہے۔ جس سے قاری کے ذہن میں واقعات کا پس منظر اور نتائج ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ انہیں بیک وقت ایجاز و اختصار اور تفصیل نگاری پر ملکہ حاصل تھا۔ ان کی تحریروں میں موجود جزئیات نگاری کے نمونے اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ شیخ محمد اکرام نے تحقیق و تنقید میں مولانا شبلی نعمانی کے انداز کو پیش نظر رکھتے ہوئے گہرے ذوق تحقیق کے ساتھ تاریخی کتابیں تصنیف کیں اور اردو ادب و تاریخ کے لئے گرانقدر سرمایہ فراہم کیا۔ سوانح نگار تبصرہ نگار، نقاد اور محقق کے طور پر ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ اپنی تصانیف کی بدولت شیخ محمد اکرام ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے۔

شیخ محمد اکرام ۸ جنوری ۱۹۷۳ء کو البرٹ وکٹر ہسپتال لاہور میں اختلاج قلب کے سبب داخل ہوئے اور ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء کو ان کا انتقال ہوا اور قبرستان میانی صاحب میں آسودۂ خاک ہوئے۔

maablib.org

شوکت تھانوی

شوکت تھانوی مارچ ۱۹۰۵ء میں بندرابن ضلع متھرا (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن تھانہ بھون مظفر نگر (یو پی) تھا۔ ان کے والد منشی محمد صدیق احمد لکھنؤ میں آباد ہو گئے تھے لیکن بسلسلہ ملازمت یوپی کے مختلف اضلاع میں رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ بھوپال میں محکمہ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔ شوکت تھانوی کا اصل نام محمد عمر تھا۔ بچپن کا کچھ عرصہ بھوپال میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم بھوپال اور پھر لکھنؤ میں ہوئی۔

چونکہ بچپن لاڈ پیار اور ناز و نعم میں گزرا اس لیے بجائے سکول بھیجے جانے کے گھر پر استاد اور ٹیوٹر صاحبان کے ذریعہ اردو، فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چرچ مشن ہائی سکول لکھنؤ میں داخل کیے گئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول حسین آباد لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ لیکن میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی سکول چھوڑ دیا۔

۱۹۲۰ء میں جب شوکت تھانوی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے تو اپنے دوستوں کے لیے ایک قلمی رسالہ نکالا جس سے ان کی ادبی اور صحافیانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے تایا زاد بھائی ارشد تھانوی سے بہت متاثر تھے اور ادب اور شاعری کی طرف رجحان انہی کی تربیت اور توجہ کا نتیجہ تھا۔

۱۹۲۵ء میں ان کا تعارف رسالہ "حسن ادب" کے مدیر منشی واحد علی لطف لکھنوی سے ہوا اور ان کی وساطت سے شوکت تھانوی رسالہ "حسن ادب" کے مدیر بن گئے۔ ۱۹۲۸ء میں ہفتہ وار اخبار "تحریک" میں فکاہیہ کالم "لالہ زار" کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد شوکت تھانوی روزنامہ "

ہمدم" کے ایڈیٹوریل سٹاف میں شامل ہو گئے اور سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم کی زیر نگرانی باقاعدہ صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ جالب دہلوی اور رحم علی ہاشمی صاحب کی زیر نگرانی شوکت تھانوی نے شذرات اور فکاہیہ کالم لکھنے میں مہارت پیدا کر لی اور صحافت کی باریکیوں سے واقف ہوئے۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں لکھنؤ سے رسالہ "سرپنچ" نکالا اور "اودھ اخبار" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے لیے اخبار ہند اور ادبی ماہنامہ "شباب" کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا اور رسالہ "حق" کے کالم نگار رسالہ "کائنات" اور رسالہ "طوفان" کے ایڈیٹر کے طور پر کام کرتے رہے۔

۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو شوکت تھانوی نے ریڈیو کے لیے تقریریں اور ڈرامے لکھنے شروع کر دیئے۔ ڈراموں میں خود بھی کردار ادا کرتے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں بطور مصنف و صدا کار ریڈیو میں ملازمت مل گئی اور یہیں سے شوکت تھانوی کی باقاعدہ ملازمت کا آغاز ہوا اور مکمل طور پر اخبار نویسی ترک کرنا پڑی۔ لکھنؤ ریڈیو سٹیشن جلد ہی اہل ادب کا مرکز بن گیا۔ شوکت تھانوی اپنی ذہانت' تخلیقی ذہن اور زود نویسی کی وجہ سے بڑے کامیاب رہے ان کے بچوں کے پروگرام "ایک تھا راجہ" اور ہفتہ وار خاکوں کا پروگرام "منشی جی" کو بڑی شہرت ملی۔

۱۹۴۳ء میں سید امتیاز علی تاج کی دعوت پر پنچولی آرٹ پکچرز لاہور میں بطور سٹوری رائٹر ملازمت اختیار کی اور ایک سال میں فلم "شیریں فرہاد" کی کہانی مکالمے اور فلم "پونجی" کے گانے لکھے۔ تقریباً ایک سال قیام کے بعد ۱۹۴۴ء میں سانگ پبلسٹی آرگنائزیشن سے وابستہ ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ یہ محکمہ حکومت ہند نے جنگی پروپیگنڈے کے لیے قائم کیا تھا۔ اس کے ڈائریکٹر جنرل حفیظ جالندھری تھے۔ انہوں نے یوپی میں بطور آرگنائزر شوکت تھانوی کا تقرر کر دیا اور لکھنؤ کو ہیڈ کوارٹر بنایا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۶ء میں شوکت تھانوی پھر پنچولی آرٹ پکچرز لاہور میں آ گئے اور امتیاز علی تاج کے ساتھ فلموں کے گانے اور مکالمے لکھنے کے کام میں مشغول ہو گئے۔ تقسیم کے بعد پنچولی

آرٹ پکچرز کا کاروبار بند ہو گیا تو شوکت تھانوی ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ ریڈیو پر "پاکستان ہمارا" کے نام سے پروگرام امتیاز علی تاج کے ساتھ مل کر نشر کرتے رہے اور بڑے کامیاب رہے۔ اس پروگرام میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ایک کردار "قاضی جی" کے نام سے تخلیق کیا۔ یہ پروگرام اتنا مقبول ہوا کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۳ء تک مسلسل نشر ہوتا رہا۔ ریڈیو سٹیشن بدلتے رہے لیکن پروگرام نہیں بدلا۔ شوکت تھانوی کراچی گئے تو کراچی سے نشر ہونے لگا۔ راولپنڈی گئے تو راولپنڈی ریڈیو سٹیشن سے نشر ہونے لگا۔ قاضی جی کا آخری پروگرام ۱۶ مارچ ۱۹۶۳ء کو ریکارڈ کیا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں پی آئی اے نے انہیں ایک پروپیگنڈہ مہم پر لندن بھیجا جہاں انہوں نے چند دن قیام کیا۔ واپس آئے تو "جنگ" کراچی میں ملازمت اختیار کر لی اور "وغیرہ وغیرہ" کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا۔ دو سال کے بعد جب دارالخلافہ اسلام آباد منتقل ہوا تو انہیں "جنگ" کے ایڈیٹوریل سٹاف کا انچارج بنا کر راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ شوکت تھانوی نے دن رات بڑی محنت سے کام کیا اور بہت کامیاب منتظم ثابت ہوئے۔

شوکت تھانوی کی پہلی شادی ۱۹۲۶ء میں سعیدہ بیگم سے ہوئی اور دوسری ۱۹۴۹ء میں لاہور میں زہرہ بیگم سے ہوئی۔ پہلی بیگم سے تین بیٹے اور دوسری سے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں شوکت تھانوی کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے زندگی چہک اٹھتی۔ طبیعت میں بہت نفاست پسندی تھی۔ شروع میں شیروانی پہنتے لیکن بعد میں سوٹ پہننے لگے تھے۔ کپڑوں کے رنگ اور وضع سے ان کی خوش مذاقی کا ثبوت ملتا تھا۔ انتہا درجے کے حاضر جواب تھے اور اپنی حاضر جوابی سے لوگوں کو مات دیا کرتے تھے۔ فقرے بازی کے ساتھ ساتھ شوکت تھانوی میں نقل اتارنے کا ملکہ بھی موجود تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اپنے استادوں کی نقلیں اتارا کرتے۔ شاعروں کی طرف متوجہ ہوئے تو ہر شاعر کے طرز ادا کی ہو بہو نقل اتارتے۔ جگر، حفیظ، جوش کے طرز کی اس طرح نقل اتارتے کہ دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا شخص

پہچان نہ سکتا تھا۔ ان کے کردار کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ تقسیم کے فوراً" بعد کئی ماہ تک ٹنڈن صاحب (ریڈیو ڈائریکٹر) کی کوٹھی میں قیام پذیر رہے لیکن متروکہ ساز و سامان میں سے کوئی چیز اپنے استعمال میں نہ لائے اور کوٹھی بھی کسی اور نے اپنے نام الاٹ کرالی۔

۱۹۳۸ء سے ۱۹۶۳ء تک ریڈیو سے وابستہ رہے۔ اس دوران بچوں اور عورتوں کے لیے پروگرام لکھے۔ بے شمار تقاریر اور ڈرامے تحریر کئے۔ صدا کاری اور اداکاری بھی کی اور ہر میدان میں اپنا لوہا منوایا۔ ایک فلم "گلنار" میں نواب دلشاد کا کردار بھی بہت خوبصورتی سے ادا کیا۔ شوکت تھانوی بہت زود نویس اور بسیار نویس تھے۔ ان کی تصانیف میں ۲۷ ناول، ۲۳ مضامین اور افسانوں کے مجموعے، ۷ ڈراموں کے مجموعے، دو کتابیں آپ بیتی پر مشتمل ۲ کتابیں خاکوں کی اور تین متفرق کتابیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شعری مجموعہ "گھرستان" کے نام سے بھی ہے بنیادی طور پر شوکت تھانوی مزاح نگار تھے۔ ان کے مزاحیہ مضامین اور افسانوں کے مجموعوں میں سب سے پہلے "موج تبسم" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد بحر تبسم، سیلاب تبسم، طوفان تبسم، دنیائے تبسم، گرگٹ، مجھے خریدلو، لاہوریات، "وغیرہ وغیرہ" "برے بھلے" مضامین شوکت، مونڈی کاٹے (۱۹۳۴ء رسالہ تحریم میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ)، برق تبسم، مسکراہٹیں، کائنات تبسم، جی ہاں پٹے ہیں، نمک مرچ، شوکتیات، سودیشی ریل اور دوسرے افسانے، خبطی (دیگر مجموعوں کے چیدہ چیدہ مضامین) الٹ پھیر، ہم زلف (سیلاب تبسم کے مضامین)، خواہ مخواہ (طوفان تبسم کے مضامین)، راجہ صاحب (اصل کتاب ہندی میں لکھوائی گئی اس کا اردو ترجمہ)، ہنس مکھ اور چٹخارے ان کے مضامین اور افسانوں کے مجموعے ہیں۔ موخر الذکر دو کتب انتقال کے بعد شائع ہوئیں۔

ناولوں میں سب سے پہلے بڑ بھس ۱۹۳۳ء میں رسالہ سرپنچ لکھنؤ میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کے بعد کی طویل فہرست میں دل پھینک، سوتیا جاہ، خانم خان، معمہ خاتون، ڈھونگ، بکواس (اسلام اور سوشلزم کی بحث ہے جو بہت

. مقبول ہوا) بیوی (ایک رات میں لکھا گیا)' کتیا' انشا اللہ' جوڑ توڑ' غزالہ' سسرال چار سو بیس' بقراط' سپنے' سانچ کو آنچ' بیگم صاحبہ" داماد' پگلی (شوکت صاحب کے اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے) نیلو فر' مولانا' خدانخواستہ اور بھابھی شامل ہیں۔ ڈراموں کے مجموعوں میں منشی جی' سنی سنائی' غالب کے ڈرامے' قاضی جی (چار جلدوں میں) اور "کھی کھی" شامل ہیں۔ آپ بیتی کے طور پر " مابدولت" اور "کچھ یادیں کچھ باتیں" لکھی ہیں۔

شیش محل اور قاعدہ بے قاعدہ کے نام سے دو کتابیں ہم عصر ادیبوں اور شاعروں اور صحافیوں کے خاکوں پر مشتمل ہیں۔ متفرقات میں "بار خاطر" جو مولانا آزاد کی تصنیف "غبار خاطر" کی پیروڈی کے طور پر ۴۸ شخصیتوں کے نام خطوط پر مشتمل ہے۔ "گوبھی کا پھول" بچوں کے لیے کہانیوں کی کتاب ہے۔ " شیطان کی ڈائری" میں سولہ قصوں میں شیطان کے کئی روپ دکھائے ہیں۔ "پہاڑ تلے" روزنامہ جنگ راولپنڈی میں شائع ہونے والے مزاحیہ کالموں مجموعہ ہے۔

شوکت تھانوی کے مضامین افسانوں اور ناولوں میں بیشتر معاشرتی مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ زیادہ تر موضوعات گھریلو مسائل' ازدواجی زندگی اور رشتہ داروں کے مسائل سے متعلق ہیں۔ شوکت تھانوی عورتوں کی نفسیات کے ماہر تھے۔ بیشتر ناولوں میں اصلاحی پہلو نمایاں ہیں۔ مردوں اور عورتوں پر طنز بہت پر اثر ہیں۔

شوکت تھانوی کا شعری مجموعہ "گہرستان" کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا جس میں ۹۳ غزلیں' دو نظمیں اور دو نعتیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار غزلیں اور نظمیں غیر مطبوعہ مختلف رسالوں کی زینت بنتی رہی ہیں۔ بحیثیت شاعر بھی شوکت تھانوی بہت کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلیں بہت معیاری ہیں۔ نمایاں خصوصیات آسان' سادہ سہل الفاظ اور دلنشین ترکیبوں کا استعمال ہے۔ کلام میں سلاست اور بیساختگی ہے۔ نظموں میں معاشرے پر طنز ہے اور وہ روح عصر کا آئینہ ہیں۔ پیروڈی اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔

۱۹۶۳ء کے آغاز سے شوکت تھانوی کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ بخار اور کھانسی کی شکایت رہنے لگی۔ ۲۲ مارچ ۱۹۶۳ء کو تمغہ امتیاز وصول کرنے کی غرض سے لاہور تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں۔ لاہور میں کئی ڈاکٹروں نے تفصیلی معائنہ کے بعد جگر پر کینسر تشخیص کیا۔ علاج کی غرض سے میو ہسپتال کے البرٹ وکٹر وارڈ میں داخل ہوئے۔ لیکن چند دنوں کے بعد گھر چلے گئے۔ بالآخر ۴ مئی ۱۹۶۳ء کی صبح کو یہ بلبل ہزار داستان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ لیکن دلچسپ تصانیف کا ایک بڑا مجموعہ چھوڑ گیا۔ آپ کا مدفن قبرستان میاں میر لاہور میں واقع ہے۔ شوکت تھانوی اپنی منفرد شخصیت اور تصانیف کی بدولت ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۴ اگست ۱۸۹۹ء کو امرت سر میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام صوفی غلام رسول تھا۔ پیشہ شال بافی تھا لیکن نابنائی کا کام شروع کیا اور جائداد کی خرید و فروخت کا کام بھی کرنے لگے جس سے خاصی دولت کمائی اور امرت سر میں متعدد دوکانوں اور مکانات کے مالک ہو گئے۔ صوفی تبسم کے بچپن کا زیادہ عرصہ اپنے دادا کے پاس گزرا اور اس گھر کی دینی اور علمی فضا میں پرورش ہوئی۔ ابتدائی عمر سے ہی علم و ادب کا شغف ان کے مزاج میں راسخ ہو تا گیا۔ ابتدائی تعلیم چرچ مشن ہائی سکول امرتسر میں حاصل کی۔ مارچ ۱۹۱۱ء میں پرائمری کلاس میں وظیفے کے امتحان میں ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد خالصہ کالج امرتسر سے ایف اے کیا۔ پھر ایف سی کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ بی اے آنرز کرنے کے بعد اسلامیہ کالج میں ایم اے فارسی میں داخلہ لیا اور ایک ہی سال میں ایم اے فارسی کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۹۲۹ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور BT کا امتحان پاس کر کے تعلیم کا سلسلہ مکمل کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں بطور انگلش ٹیچر ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصہ اے ڈی آئی بھی رہے۔ اس کے بعد سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں السنہ شرقیہ کے لیکچرار بن کر لاہور آ گئے۔ ستمبر ۱۹۳۱ء میں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گیا۔ ۱۹۴۳ء میں صدر شعبہ فارسی ہو گئے اور کالج ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ بھی مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ڈرامیٹک کلب کے لیے یورپی ڈراموں کا سلسلہ شروع کیا۔ کالج میگزین راوی کے لیے اردو اور پنجابی

زبانوں میں متعدد مضامین' ڈرامے' غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ اٹھائیس سال ملازمت کرنے کے بعد ۳ اگست ۱۹۵۰ء کو ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد خانہ فرہنگ ایران سے منسلک ہوئے اور ۱۹۶۱ء تک فارسی کی تدریس کے سلسلے میں اس ادارے سے منسلک رہے۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں ہفت روزہ رسالہ لیل و نہار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور دو سال تک اس کے مدیر رہے۔ اس رسالے میں "حرف و سخن" کے نام سے باقاعدہ کالم لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ بے شمار تحقیقی و تنقیدی مضامین اور بچوں کے لئے بہت سی کہانیاں اور نظمیں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔

لاہور میں ریڈیو اسٹیشن کا قیام ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ صوفی صاحب شروع ہی سے اس سے منسلک ہوئے اور متعدد فیچر' ڈرامے' تقاریر' مکالمے غرضیکہ نظم و نثر دونوں میں بہت کچھ لکھا۔ اور فارسی' انگریزی' اردو اور پنجابی زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ ریڈیو پر پنجابی مشاعرے کی داغ بیل بھی صوفی صاحب نے ڈالی۔ ریڈیو کے لیے طویل خدمات کے پیش نظر آپ نے ۱۴ جولائی ۱۹۶۴ء کو ریڈیو پاکستان میں بحیثیت سٹاف آرٹسٹ پیش کش قبول کرلی اور ۳۰ جون ۱۹۶۶ء تک اس عہدہ پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد بطور سکرپٹ رائٹر ۳۰ جون ۱۹۷۰ء تک کام کرتے ہیں۔

بچوں اور بڑوں کے لیے بے شمار فیچر' ڈرامے' کہانیاں اور تقاریر لکھیں اور مختلف موضوعات پر بات چیت کے پروگرام پیش کئے۔

صوفی صاحب کی ریڈیو کی ملازمت کے دوران ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ کے دوران صوفی صاحب کا قابل قدر اور ناقابل فراموش کا زمانہ ان کے پراثر اور ولولہ انگیز پنجابی گیت ہیں جنہوں نے عوام اور خواص کے دلوں کو گرما کے رکھ دیا۔ ان نغمات کو ملکہ ترنم نور جہاں نے روپ بخشا۔ چنانچہ "میرا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں" "میرا ماہی چھیل چھبیلا' "کرنیل نی جرنیل نی" اور "اے پتر ہٹاں دے نئیں وکدے۔" "کی لبھ دی پھریں ہزار کڑے" جیسے لازوال نغموں کی تخلیق کی۔

۱۹۷۰ء میں ریڈیو پاکستان لاہور کی ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد صوفی صاحب دو سال یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے پنجابی کی سب سے پہلی کلاس کو پڑھاتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں فیملی پلاننگ کے ماہنامہ سکھی گھر کے اعزازی مدیر بنا دیئے گئے۔ اس سال کچھ مدت کے لیے امریکہ چلے گئے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد تقریباً" دو سال تک پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے ماہنامہ اطفال کے نگران کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۵ء میں پاکستان آرٹس کونسل لاہور کے پریذیڈنٹ بنا دیئے گئے اور تادم آخر اس عہدے پر فائز رہے۔ اس ادارے میں اقبال لیکچر کا اجراء صوفی صاحب کا انقلاب آفریں اقدام تھا۔

اقبال اکیڈمی پاکستان کے وائس پریذیڈنٹ کے عہدے پر آپ کا تقرر ۱۹۷۶ء میں ہوا اور مرتے دم تک اس عہدے پر کام کرتے رہے تھے۔ اس دوران متعدد کتابوں کی اشاعت اور نگرانی میں بڑی محنت سے کام کیا۔ اپنی تین کتب انتخاب کلام اقبال، نقش اقبال اور سراپردۂ افلاک بھی انہی دنوں شائع کیں۔

صوفی صاحب اپنی طویل ادبی زندگی کے دوران مختلف رسائل کے مدیر و نگران رہے۔ ان کی مدیرانہ خصوصیات کا آغاز ۱۹۳۰ء سے ہوا اور آخری دم تک جاری رہا۔ ۱۹۳۰ء میں آپ نے مشہور ادبی میگزین رسالہ مخزن کے دور جدید میں حفیظ جالندھری کے ساتھ مل کر بطور مدیر اعزازی کام شروع کیا۔ اس کے علاوہ رسالہ نیرنگ خیال، مخزن، دینی رسالہ "بلاغ" اور رسالہ دوست (تعلیم بالغاں)، ماہنامہ "پنجابی ادب"، "پھول" اور "سکھی گھر" میں خدمات انجام دیتے رہے۔

بطور استاد صوفی صاحب ہزارہا تشنگان علم و دانش کو فیض یاب کرتے رہے۔ آپ کے معروف شاگردوں میں اشفاق احمد، ن م راشد، شہرت بخاری، بانو قدسیہ، حفیظ ہوشیارپوری اور ڈاکٹر آفتاب احمد، جگن ناتھ آزاد اور کنہیالال کپور وغیرہ شامل ہیں۔ جو لوگ باقاعدہ شاگرد نہ تھے مگر شعرو

سخن میں ان سے مشورہ لیتے رہے ان میں فیض احمد فیض، شہزاد احمد، کشور ناہید اور ایوب رومانی کے علاوہ متعدد شعراء شامل ہیں۔ صوفی صاحب مشہور ادبی شاہکار ٹوٹ بٹوٹ کے خالق ہیں۔ صوفی صاحب کی قابل ذکر تخلیقات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ "انجمن" ان کا واحد مجموعہ کلام ہے۔ اس میں اردو، فارسی اور پنجابی کلام ہے۔ اردو غزل کے روایتی مضامین، عشق و محبت، ہجر و فراق، بادہ و مینا وغیرہ جیسے مضامین عام ہیں۔

۲۔ جاہ و جلال مشہور ڈرامہ نگار کرول چپیک کے ڈرامہ پاور اینڈ گلوری کا اردو ترجمہ ہے۔

۳۔ حکمت قران۔ مشہور ترکی جرنیل محمود مختار کی تالیف کے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ ہے۔

۴۔ سرا پردہ افلاک (فارسی، اردو)، یہ کتاب بسلسلہ صد سالہ تقریبات ولادت علامہ اقبال ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی اور جاوید نامہ کا اردو ترجمہ ہے۔

۵۔ مسلمانوں کا علم جغرافیہ اور شوق سیاحت (اردو)

۶۔ فرانسیسی مستشرق کارا داوو کی کتاب مفکرین اسلام کی دوسری جلد کے پہلے تین ابواب کا فرانسیسی سے اردو ترجمہ۔

۷۔ شرح صد شعر اقبال (اردو) علامہ اقبال کے سو اشعار کی تشریح۔

۸۔ روح غالب (فارسی، اردو) مرزا غالب کے ۷۰ اردو اور ۳۰ فارسی اشعار کی شرح کے ساتھ ساتھ غالب کی عظمت اور غالب کا تصور حسن و عشق پر صوفی صاحب کے دو تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔

۹۔ حرف و صوت (فارسی و اردو)۔ یہ علامہ اقبال کے فارسی اور اردو کلام کا ایسا انتخاب ہے جو نغمہ خوانی کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۰۔ کلیات طغرائی (فارسی، اردو) یہ کتاب صوفی تبسم کے استاد گرامی حکیم فیروزالدین احمد طغرائی کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے جسے

صوفی صاحب نے ترتیب دیا ہے۔

۱۱۔ یک ہزار و یک سخن۔ (فارسی و اردو) فارسی اور اردو اشعار کا انتخاب جس میں قدیم اور جدید دونوں طرز کے شعراء شامل ہیں۔ اس کتاب میں شامل اشعار بہت خوبصورت ہیں۔ اس کی کتابت صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے خود کی تھی۔

۱۲۔ "جھولنے" اور ٹوٹ بٹوٹ اور دوسری نظمیں بچوں کے لیے لکھی گئی دونوں کتابیں انعام یافتہ ہیں۔

۱۳۔ اس کے علاوہ محکمہ تعلیم پنجاب کے زیر اہتمام چھپنے والی متعدد نصابی کتب کی تصنیف و ترتیب میں شامل رہے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے ۷ فروری ۱۹۷۸ء کو انتقال فرمایا۔ آپ کی آخری آرام گاہ قبرستان میانی صاحب میں علاقہ ڈھایا ہامو شاہ' نیا مزنگ فتح شیر روڈ پر واقع ہے۔ آپ کی قبر کے ساتھ ان کے بیٹے ڈرامہ نگار صوفی نثار احمد بھی دفن ہیں۔

maablib.org

ظہیر کاشمیری

ظہیر کاشمیری کا اصل نام دستگیر ظہیر ہے اور ان کے والد بزرگوار کا نام ایم شاہ دین تھا۔ ظہیر کاشمیری ۲۱ اگست ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے میٹرک تک ایم۔ اے۔ او ہائی سکول امرتسر میں تعلیم حاصل کی اور پھر ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر ہی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ خالصہ کالج امرتسر میں ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔ ظہیر کاشمیری زمانہ طالب علمی میں طلباء سیاست میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ اور ۱۹۴۰ء میں پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی مباحثوں میں بھی حصہ لیتے رہے اور متعدد انعامات حاصل کئے۔ انہوں نے علمی و ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز صحافت سے کیا۔ آپ روزنامہ "مساوات" (لاہور، کراچی) اور رسالہ "سویرا" کے ایڈیٹر رہے اور کالم نگار کی حیثیت سے روزنامہ "احسان" "حالات" "نوائے وقت" اور "پکار" میں کالم لکھتے رہے۔ مختلف فلموں کیلئے ہدایت کاری بھی کی۔

آپ کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ عظمت آدم (مجموعہ کلام) ۲۔ تغزل ۲۔ چراغ آخر شب ۴۔ رقص جنوں ۵۔ اوراق تصور (مجموعہ کلام) ۶۔ آدمی نامہ اور دوسری نظمیں (مجموعہ منظومات) ۷۔ عکس نیاز (قومی اور ملی نظمیں) ۸۔ جہان آگہی (مجموعہ مضامین) ۹۔ ادب کے مادی نظریئے (مجموعہ مضامین) ۱۰۔ عشق و انقلاب (کلیات)

ظہیر کاشمیری ترقی پسند شاعر تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے اس سے وابستہ ہو گئے اور اس تحریک کے سرکردہ رہنماؤں کے ساتھ مل کر

اپنے ترقی پسندانہ خیالات میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کا مطالعہ بہت عمیق اور مشاہدہ وسیع تھا۔ انہیں مختلف علوم و فنون مثلاً" تاریخ' فلسفہ' ادبیات' معاشیات اور سیاسیات پر دسترس حاصل تھی۔ عالم شباب میں وہ کئی ٹریڈ یونین تحریکوں سے بھی وابستہ رہے جس کے سبب قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ شاعر کے طور پر ان کا اسلوب اتنا ہمہ گیر' متنوع' شستہ اور اعلیٰ ہے کہ وہ ان کے خیالات و افکار سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں قدیم و جدید اسالیب باہم شیر و شکر ہیں۔ وہ ایک حقیقت پسند شاعر تھے۔ ان کی زبان قابل فہم ہے۔ ان کا انداز شعر گوئی ایسا بے ساختہ' موزوں اور برجستہ ہے کہ اس پر تصنع اور بناوٹ کا گماں نہیں ہوتا۔

ظہیر کاشمیری ہمارے ان قد آور شعراء میں شامل ہیں جنہوں نے اپنے الفاظ' نظریات اور خیالات سے نظم اور غزل کو برابر استحکام عطا کیا ہے۔ وہ ترقی پسند شعراء کے اس قبیل سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے اردو شاعری خصوصاً" غزل گوئی کی روایت کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ظہیر کاشمیری کا نام اردو شاعری میں دیر تک تابندہ و پائندہ رہے گا۔

ظہیر کاشمیری ۱۲ دسمبر ۱۹۹۶ء کو اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ آپ کا مدفن قبرستان میانی صاحب میں مزار غازی علم دین شہید کے قریب واقع ہے۔

maablib.org

عبدالحمید عدم

عبدالحمید عدم ۱۰ اپریل ۱۹۱۰ء کو گوجرانوالہ کے ایک گاؤں تلونڈی موسیٰ میں پیدا ہوئے۔ عدم کے بزرگ فوج سے منسلک رہے تھے۔ ان کے دادا سید مہتاب شہاب فوج میں صوبیدار تھے۔ والد صاحب بسلسلہ کاروبار فیصل آباد میں مقیم تھے۔ ۱۹۲۶ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور گھر کی ذمہ داری عدم کے کاندھوں پر آن پڑی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے میٹرک پاس کیا۔ ایف اے کرنے کے بعد ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۲۹ء میں ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم ہو گئے۔

۱۹۳۹ء میں جنگ کے دوران عراق گئے تو وہاں ایک عراقی لڑکی سے شادی کر لی۔ ۱۹۴۱ء میں ایس اے ایس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ تقسیم ہند سے قبل ہندوستان میں تعینات تھے۔ تقسیم کے بعد راولپنڈی تبادلہ ہو گیا۔ ۱۹۵۱ء میں کوئٹہ تشریف لے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں اپنے محکمہ ملٹری اکاؤنٹس میں ڈپٹی اسسٹنٹ کنٹرولر مقرر ہوئے اور اپریل ۱۹۶۶ء میں اس عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اگرچہ اپنے محکمہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لیکن افسرانہ رعونت نام کو نہ تھی۔ نہ کسی سے دب کر رہتے اور نہ نچلے طبقے سے افسرانہ برتاؤ کرتے۔

شروع میں رسالہ "خمستان" راولپنڈی میں آفتاب احمد کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد اختر تخلص اختیار کیا۔ لاہور میں قیام کے بعد عدم

صاحب کا زیادہ وقت حکیم یوسف حسن کے بھائی یعسوب الحسن کے رسالہ "خضرراہ" کے دفتر میں گزرتا تھا۔ وہیں شراب اور شاعری کا دور چلتا۔

وفات سے پہلے عدم بیمار رہنے لگے تھے۔ عمر بھر کی شراب نوشی نے ان کے قویٰ مضمحل کر دیئے تھے۔ انتقال سے چند ماہ قبل اپنی بیوی کی وفات کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ اپنی زندگی اور موت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچ گئے تھے۔

موت کتنی ہی سنگدل ہو مگر زندگی سے تو مہرباں ہو گی

وفات سے دو تین سال پہلے ہی دوستوں کی محفلیں ختم ہو گئیں اور گھر میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔

جن دنوں اردو شاعری کی فضا پر اختر شیرانی، جوش اور حفیظ جالندھری چھائے ہوئے تھے انہی دنوں عدم کی شاعری کا آغاز ہوا۔ پہلا مجموعہ کلام "نقش دام" ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ عدم بنیادی طور پر رومانوی شاعر ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک کا اثر بھی زیادہ قبول نہیں کیا۔ ان کی شاعری میں سیاسی، سماجی یا معاشی حالات کا ذکر کم ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں زیادہ تر زمانہ حال اور اس کے ماحول سے بے اطمینانی اور روزمرہ زندگی کے حقائق سے فرار کا عنصر موجود ہے۔ وہ شاعری میں کسی پیغام کے برعکس جذبے اور تخیل کی فروانی پر زور دیتے ہیں۔

عدم کے شعری مجموعوں کی تعداد ۴۸ ہے۔ اتنے مجموعے ترتیب دینا ان کی قادرالکلامی کی دلیل ہے۔ وہ بسیار گو اور زود نویس شاعر تھے۔ پہلا مجموعہ کلام ۱۹۳۴ء میں اور دوسرا ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد عموماً ایک ایک سال کے وقفے سے اور بعض مرتبہ تو ایک سال میں دو دو تین تین مجموعے ترتیب دے ڈالے۔ ۱۹۵۹ء میں چھ مجموعے "آب زمزم"، "نوک زبان"، "خم ابرو"، "خرابات"، "داستان ہیر" اور "عکس جام" ترتیب دیئے۔

تین مجموعے ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے عدم کے شعری مجموعے بمعہ سن اشاعت حسب ذیل ہیں:

۱۔ نقش دوام	۱۹۳۴ء	۲۴۔ نصاب دل	۱۹۶۴ء
۲۔ زلف پریشاں	۱۹۵۰	۲۵۔ بال ہما	۱۹۶۴
۳۔ قول و قرار	۱۹۵۲	۲۶۔ رم آہو	۱۹۶۶
۴۔ گردش جام	۱۹۵۲ء	۲۷۔ نشان راہ	۱۹۷۰
۵۔ مکتب عشق	۱۹۵۵	۲۸۔ آب زر	۱۹۷۱
۶۔ ساز و صدف	۱۹۵۵	۲۹۔ آب رواں	۱۹۷۴
۷۔ شہر فرہاد	۱۹۵۶	۳۰۔ سرد سمن	۱۹۷۲
۸۔ قصر شیریں	۱۹۵۶	۳۱۔ ذکر یار	۱۹۷۲
۹۔ گلنار	۱۹۵۷	۳۲۔ جھوٹ سچ	۱۹۷۲
۱۰۔ بط مے	۱۹۵۷	۳۳۔ جنس گراں	۱۹۷۴
۱۱۔ شہر خوباں	۱۹۵۷	۳۴۔ سندر بن	۱۹۷۴
۱۲۔ آب زمزم	۱۹۵۹	۳۵۔ رسوائی نقاب	۱۹۷۴
۱۳۔ نوک زبان	۱۹۵۹	۳۶۔ دستور وفا	۱۹۷۵ء
۱۴۔ خم ابرو	۱۹۵۹	۳۷۔ خم کدہ	۱۹۷۵
۱۵۔ خرابات	۱۹۵۹	۳۸۔ جادہ درد	۱۹۷۵
۱۶۔ داستان ہیر	۱۹۵۹	۳۹۔ بہتے موتی	۱۹۷۵
۱۷۔ عکس جام	۱۹۵۹	۴۰۔ دولت بیدار	۱۹۷۶
۱۸۔ باغ و بہار	۱۹۶۰	۴۱۔ جوئے شیر	۱۹۷۶
۱۹۔ درجام	۱۹۶۰	۴۲۔ چاک پیراہن	۱۹۷۷
۲۰۔ درد و درماں	۱۹۶۰	۴۳۔ نگار خانہ	۱۹۷۸
۲۱۔ رنگ و آہنگ	۱۹۶۰	۴۴۔ درد محبت	۱۹۸۰
۲۲۔ بربط و جام	۱۹۶۲	۴۵۔ دہان زخم	۱۹۸۲
۲۳۔ پیچ و خم	۱۹۶۲	۴۶۔ مورتین	۱۹۸۴
		۴۷۔ نادانیاں	۱۹۸۵ء

عدم کے ان تمام شعری مجموعوں میں سے ان کے مجموعے "خرابات"

نے انہیں شہرت دوام بخشی۔ یہ ان کا مقبول ترین مجموعہ کلام ہے اور مشہور شاعر اختر شیرانی کے نام انتساب کیا گیا ہے۔ ۱۹۲ صفحات کی کتاب میں ۱۶۰ غزلیں شامل ہیں۔ کتاب کا آغاز ان کے اس خوبصورت شعر سے ہوتا ہے۔

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

"خرابات" میں عدم کی شاعری کا رنگ خوب نکھرا ہے۔ گویا عدم نے اپنی شاعری کی خصوصیات کو اس میں سمو دیا ہے۔ یہی مجموعہ ان کی شہرت کا باعث بنا اور اسی سے انہوں نے نام و مقام کمایا۔ اس مجموعہ کا آغاز اس غزل سے ہوتا ہے۔

وہ باتیں تری وہ فسانے تیرے
شگفتہ شگفتہ بہانے ترے
بس ایک داغ سجدہ مری کائنات
جبینیں تری آستانے ترے

اس عظیم شاعر نے ۱۹۸۱ء میں وفات پائی۔ آپ کی آخری آرامگاہ قبرستان ڈرائی پورٹ مغل پورہ کے صدر دروازے کے بائیں ہاتھ واقع وسیع دالان کی مغربی دیوار کے ساتھ پکی چار دیواری کے اندر واقع ہے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بیٹی کی قبریں ہیں۔

عدم راہی ملک عدم ہو گئے لیکن اس آباد دنیا میں وہ اپنے خوبصورت شعروں کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

maablib.org

عبدالمجید سالک

مولانا عبدالمجید سالک ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو پٹھانکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام غلام قادر تھا جو میونسپل کمیٹی پٹھانکوٹ کے سیکرٹری تھے۔ انہیں شعرگوئی کا بھی شوق تھا اور عاصی تخلص کرتے تھے۔

عبدالمجید سالک فطری طور پر شاعر اور ادیب کی خصوصیات لے کر دنیا میں آتے تھے۔ ان کی صلاحیتیں اپنے ہی گھر کے ادبی ماحول میں پروان چڑھیں۔ ۱۲ سال کی عمر میں آپ نے مڈل پاس کر لیا۔ انٹرنس کی تعلیم کیلئے ایم۔ بی ہائی سکول بٹالہ میں داخل ہوئے لیکن چونکہ عمر چھوٹی تھی اور ان دنوں پندرہ سال سے کم عمر کے لڑکے کو میٹرک کے امتحان میں شامل ہونے کی اجازت نہ تھی اس لیے کچھ عرصہ کیلئے سکول چھوڑ دیا۔ ۱۹۱۰ء میں دوبارہ سکول میں داخل ہوئے اور اس سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ عرص بعد ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے اور یہاں ریلوے اکاؤنٹس آفس میں کلرک ہو گئے۔ ریلوے کی نوکری صرف سات ماہ کی اور پھر واپس پٹھانکوٹ چلے گئے اور وہاں ایک سکول میں مدرس مقرر ہو گئے۔ ۱۹۱۴ء میں رسالہ "فانوس خیال" جاری کیا۔ دو ہی اشاعتوں کے بعد اس رسالے کو خوب پذیرائی ملی۔ علامہ اقبال، شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، مولانا راشد الخیری، سیماب اکبر آبادی اور ملک کے دوسرے بڑے بڑے ادیبوں نے قلمی معاونت کی۔ دس ماہ تک یہ پرچہ بخوبی نکلتا رہا لیکن پھر مالی پریشانیوں کی وجہ سے سالک اس کو مزید شائع نہ کر سکے۔ اس رسالے کی بندش کے بعد سالک مدرس سے استعفیٰ دے کر لاہور آ گئے۔ لاہور آ کر وہ سید امتیاز علی تاج کے والد سید ممتاز علی کے لٹریری اسسٹنٹ ہو گئے اور ان کے رسائل "پھول" و تہذیب نسواں کے معاون مدیر مقرر ہوئے۔ سید امتیاز علی تاج نے جب علمی و

ادبی مجلّہ کہکشاں شروع کیا تو سالک ان کے بھی دست راست تھے۔ مختلف رسائل میں ان کے افسانے 'مقالات اور نظمیں "گمنام" کے نام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ انہی دنوں میں آپ نے مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم رپورٹ' رولٹ کمیشن رپورٹ اور ٹیگور کے ناٹک "چترا" کا ترجمہ کیا۔ "چترا" کا ترجمہ دارالاشاعت نے شائع کیا۔ اسے خوب پسند کیا گیا اس کا دیباچہ خواجہ حسن نظامی نے خود خواہش کر کے لکھا تھا۔ اب پنجاب کے ادباء میں سالک کو وہ مقام حاصل ہو چکا تھا جو ستاروں کی محفل میں مہ کامل کو حاصل ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار "زمیندار" کی ادارت کیلئے سالک ہی کا انتخاب کیا۔ انہوں نے "زمیندار" کو جو چار چاند لگائے اس کی داستان اردو کی تاریخ میں ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے شہرہ آفاق مزاحیہ کالم "افکار و حوادث" کی بنیاد انہوں نے اسی اخبار میں رکھی۔ ۱۹۲۱ء میں اخبار "زمیندار" میں سامراج دشمن اداریہ لکھنے پر آپ کی گرفتاری عمل میں آئی اور آپ سنٹرل جیل لاہور اور ڈسٹرکٹ جیل میانوالی میں اسیر رہے۔ رہائی کے بعد سالک نے دوبارہ "زمیندار" میں کام شروع کر دیا۔ یہاں آ کر ان کی ملاقات مولانا غلام رسول مہر سے ہوئی اور یہ تعلق تاحیات قائم رہا۔ عبدالمجید سالک نے اپنے دوست چوہدری فخرالدین احمد کے ساتھ مل کر لاہور میں ایک یتیم خانہ "دارالفرقان" قائم کیا اور تادم مرگ اس ادارہ کے سرپرست و معاون رہے۔

۱۹۴۹ء عبدالمجید سالک مرکزی شعبہ اطلاعات کے میئر مقرر ہوئے۔ اس عرصہ میں ان کا قیام کراچی رہا۔ اس دور میں انہوں نے قومی مورال کو بحال رکھنے کیلئے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ مضامین "ابورشید وجدانی"، "جلال حیدر علوی" "محمد افضل" اور اس طرح کے دوسرے ناموں سے شائع ہوتے رہے۔ تین سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن محمد علی بوگرہ کے زمانے میں بعض وجوہ کی بناء پر انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور لاہور واپس آ گئے۔ یہاں آ کر بزم اقبال' ادارہ ثقافت اسلامیہ اور مجلس ترقی ادب کے لیے کتابیں لکھنے کا کام شروع کیا۔ متعدد انگریزی کتب کا ترجمہ کیا۔ انسائیکلوپیڈیا کیلئے مضامین کہے۔ اس عرصہ میں لکھی گئی آپ کی تصنیف "مسلم ثقافت ہندوستان میں" پر آپ کو یونیسکو نے انعام سے نوازا۔ موجودہ

حکومت نے بھی آپ کی قلمی خدمات کے اعتراف کے طور پر پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ کا اعلان کیا۔

آپ کا مصنفی سرمایہ درج ذیل ہے۔

سرگذشت، ذکر اقبال، یاران کہن، مسلم ثقافت ہندوستان میں، اسلام اور مسلمان، کاریگری، ایجادات، دانایان فرنگ، سیاحوں کی کہانیاں، قدیم تہذیبیں، آئین حکومت ہند، امداد باہمی، جمپا اور دیگر افسانے۔

ان کے علاوہ بے شمار کتب کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ عبدالمجید سالک خوش گو شاعر اور بڑے عمدہ مزاح نگار تھے۔ انہوں نے مولانا حالی کی طرح اصلاحی شاعری کی۔ اردو، فارسی غزلوں کے علاوہ قومی نظمیں ان کے شعری سرمائے میں شامل ہیں۔ اگرچہ آپ کا شعری ترکہ بہت زیادہ نہیں ہے لیکن جو کچھ ہے وہ اردو ادب کا لافانی گہر ہے۔

مزاح نگار کے طور پر ان کے کالم "افکار و حوادث" سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ ان کی مزاحیہ تحریروں میں آمد کی بلندی اور دلاویزی موجود ہے جو پڑھنے والے کو اپنے سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ ان کے مزاح کو صاحب علم بھی سمجھ سکتے ہیں اور ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ان کا کالم "افکار و حوادث" ۲۷ سال تک ہر روز چھپتا رہا اور اس کا مطلع ہمیشہ تاباں و درخشاں رہا اور یہ ان کا بہت بڑا کمال تھا۔ "افکار و حوادث" کے زیر عنوان لکھے گئے مضامین نہ صرف ہمارے صحافتی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں بلکہ لطف بیان کے اعتبار سے یہ مضامین اردو ادب میں بھی بلند مقام کے حق دار ہیں۔ اردو صحافت میں طنز و مزاح کے جو نئے اسالیب سالک نے پیدا کئے وہ ایک اجتہاد کی کیفیت رکھتے ہیں اور زمانہ مستقبل کا ادبی مورخ جب اردو ادب کی تاریخ لکھے گا تو ادب کی اس صنف میں سالک کے مقام کو ایک سنگ میل نہیں بلکہ ایک منزل کا رقبہ دے گا۔

ادب و صحافت کا یہ درخشندہ باب ۱۳ دسمبر ۱۹۵۷ء کو بند ہوا آپ کا مدفن قبرستان مسلم ٹاؤن میں واقع ہے۔

علامہ محمد اقبال

ترجمان حقیقت علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہ کشمیری برہمنوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ جو عابد و زاہد اور صاحب دل بزرگ تھے۔ آپ کی والدہ بھی دین دار خاتون تھیں۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم ایک مکتب میں ہوئی پھر آپ کو مشن ہائی سکول میں داخل کروایا گیا۔ یہاں انہیں مولوی میر حسن جیسا عربی فارسی اور ادب پر گہری نظر رکھنے والا استاد مل گیا جن کی شخصیت نے اقبال کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ پھر آپ جب مرے کالج میں داخل ہوئے تو اس دوران میں مولوی میر حسن کی خدمات کالج منتقل کر دی گئیں۔ اقبال نے یہاں بھی ان سے پورا استفادہ کیا۔

مرے کالج سیالکوٹ کے بعد اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد ۱۸۹۹ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا۔ کچھ دیر اورنٹنل کالج میں فلسفہ اور تاریخ پڑھاتے رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی کتاب "علم الاقتصاد" تصنیف کی۔ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کیلئے یورپ چلے گئے اور ٹرینٹی کالج کیمرج سے فلسفہ اور اخلاق میں ڈگری لی۔ پھر جرمنی چلے گئے اور میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالے کا عنوان "The Developement of Meataphysics in Literature of Persia" تھا۔ اسی دوران میں آپ نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال وطن

واپس آ گئے اور کچھ عرصے تک گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے اور پھر مستعفی ہو کر وکالت شروع کر دی۔

۱۹۲۲ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے آپ کو عملی اور ادبی خدمات کے صلے میں "سر" کا خطاب دیا گیا۔ ۱۹۲۶ء میں آپ پنجاب کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے اور لاہور کے حلقے کی نمائندگی کی۔

اقبال کا تمام کلام آمد کا نتیجہ ہے' آورد کو اس میں کہیں دخل نہیں۔ ان کی شاعری میں بغیر کوشش کے سخن نغز کے تمام تقاضے پورے ہو جاتے ہیں اقبال نے شاعری سے جو کام لیا ہے اس کی نظیر مسلمانوں کی شاعری کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ بعض مضامین اقبال کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں۔ مثلاً" عشق کا موضوع اگرچہ حکما اور صوفیا کے ہاں کثرت سے ملتا ہے لیکن اقبال نے اس میں جو نکات پیش کئے ہیں وہ کسی اور کے کلام میں نہیں ملتے۔ اسی طرح توقیر نفس اور عرفان نفس کا مضمون اگرچہ قدیم ہے لیکن اقبال نے خودی کا فلسفہ اس زور و شور سے پیش کیا ہے کہ وہ اس کا خاص مضمون بن گیا ہے۔ اسلام سے متعلق بھی اس کا جو زاویہ نگاہ ہے وہ صوفی و ملا و حکیم سب سے الگ ہے۔ قومی شاعری کی ابتدا اگرچہ حالی نے کی لیکن اقبال جس طرح قومی مسائل سے دست و گریبان ہوا ہے اس کی مثال بھی کہیں اور نہیں ملتی۔ اقبال نے اپنے ورثے کو صرف پیش ہی نہیں کیا بلکہ اس میں گراں بہا اور قابل قدر اضافہ بھی کیا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں آزادانہ اور محققانہ نظر رکھتا ہے۔ وہ اندھا دھند کسی کی تقلید نہیں کرتا' ہر چیز کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے۔

اقبال پر درجنوں کتابیں اور ہزاروں مضامین لکھے گئے ہیں' یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ تفہیم اقبال کے سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی کتاب "روح اقبال" اور مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب "اقبال کامل" بہت اہم ہیں۔

اقبال کا تصنیفی سرمایہ درج ذیل ہے۔

اردو شاعری

بانگ درا ۱۹۲۴ء۔
بال جبریل ۱۹۳۵ء۔
ضرب کلیم ۱۹۳۶ء۔
ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء اردو' فارسی کلام شامل ہے یہ مجموعہ وفات کے بعد شائع ہوا۔

فارسی شاعری

اسرار خودی (مثنوی ۱۹۱۵ء
رموز بے خودی (مثنوی دوسرا حصہ) ۱۹۱۸ء
پیام مشرق ۱۹۲۲ء۔
جاوید نامہ ۱۹۳۲ء۔

نثری تصانیف

علم الاقتصاد ۱۹۰۳ء
تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (انگریزی خطبات) ۱۹۳۰ء
فلسفہ عجم (ترجمہ) ۱۹۴۴ء

بانگ درا اقبال کے اردو کلام کا سب سے پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے فارسی کلام کے تین مجموعے اسرار خودی' رموز بے خودی اور پیام مشرق شائع ہو چکے تھے۔ بانگ درا ان کا سب سے زیادہ مشہور اور مقبول شعری مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ان کی اردو شاعری کی ابتدا سے لیکر ۱۹۰۵ء تک کا کلام شامل ہے۔

دوسرے حصے میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کے کلام کا انتخاب ہے اور تیسرے حصے میں ۱۹۰۸ء سے لیکر ۱۹۲۴ء تک کا کلام شامل ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۰ ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ اس مجموعے میں شامل کلام کے اہم محرکات مظاہر

فطرت، قومیت و ملیت، اسرار کائنات، فلسفہ خودی، حب وطن، عشق و عقل کا تصادم، مغربی تصورات سے بیزاری ہیں۔ اس مجموعہ کلام میں شامل مشہور نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، ہمالہ، شمع و شاعر، طلوع اسلام اور خضر راہ ہیں بال جبریل ان کا دوسرا اردو مجموعہ کلام ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ زبور عجم کا اردو ایڈیشن کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس حصے میں وہی خیال اردو زبان میں پیش کیا گیا ہے جو زبور عجم میں فارسی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

بال جبریل کے دوسرے حصے میں مختلف موضوعات پر لکھی گئی نظمیں شامل ہیں اس حصے کی مشہور نظموں میں ساقی نامہ، مسجد قرطبہ، ذوق و شوق، طارق کی دعا اور جاوید نامہ شامل ہیں۔

ضرب کلیم اقبال کا تیسرا اردو مجموعہ کلام ہے۔ ایک پاک جذبہ اس کی تصنیف کا محرک ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں فریضہ حج ادا کرنے کی اقبال نے تیاری شروع کی۔ اس سلسلے میں وفود شوق نے دل کے درد بھرے ساز کو چھیڑا۔ طبیعت میں آمد کا زور پیدا ہوا۔ رباعیوں پر رباعیاں موزوں ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ چند دنوں میں کتاب مکمل ہو گئی۔ اقبال اپنی بیماری کے سبب حج پر تو نہ جا سکے البتہ اپنے عقیدت مندانہ جذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھال گئے۔ اس مجموعے میں رباعیات و قطعات کے علاوہ چند اردو نظمیں کشمیر اور اہل کشمیر سے متعلق ہیں۔ اس مجموعے کی مشہور طویل نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمان قوم کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ ان کے مشہور شعری نظریات میں نظریہ خودی، بے خودی، نظریہ مطمئنت و قومیت، تصور شاہین، تصور ابلیس، تصور عقل و عشق، تصور جبر و قدر، تصور جمہوریت شامل ہیں۔

ان کی شاعری میں تغزل، رمزیت، شاعرانہ مصوری، ندر نادر تشبیہات، جدید تراکیب، تلمیحات، فلسفیانہ حقائق، سوز و گداز جیسی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں جو ان کی شاعری کو مقبول عام و خاص بناتی ہیں۔

علامہ اقبال ہمہ جہت شخصیت تھے۔ ایک راہنما کے طور پر انہوں نے مسلمانوں کو زوال اور پستی سے نکال کر کامیابی اور عروج کی طرف گامزن کرنے کی بھرپور سعی کی۔

۱۹۴۰ء کا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ملی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آلہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے جلسے کی صدارت کرتے اقبال نے ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کی تجویز پیش کی تھی مسلم لیگ کے اس سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے اقبال کا نام قائداعظم نے تجویز کیا تھا۔

علامہ اقبال کی وفات پر قائداعظم نے فرمایا۔

"علامہ اقبال کی موت مسلمانان ہند کے لیے ناقابل تلافی صدمہ ہے وہ میرے ذاتی احباب میں سے تھے۔ ان کا شمار دنیا کے بہترین شعراء میں ہوتا ہے۔ جب تک اسلام زندہ ہے ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔ ان کی شاعری مسلمانوں کی حقیقی امنگوں کی ترجمان ہے۔ ہم اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں ان سے وجدان حاصل کرتی رہیں گی۔"

جاوید منزل لاہور میں اقبال نے اپنی زندگی کے آخری تین سال گزارے اسے آج کل اقبال میوزیم کی شکل دیدی گئی ہے۔ اس رہائش گاہ پر قائداعظم، پنڈت جواہر لعل نہرو، سر تیج بہادر سپرو اور سجاد ظہیر وغیرہ اقبال سے ملنے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ اس جاوید منزل میں آپ نے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو وفات پائی اور بادشاہی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

maablib.org

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

عبدالسلام خورشید صاحب بٹالہ ضلع گورداسپور میں ۱۲ اگست ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ وہاں ان کے ننھیال کے لوگ رہائش پذیر تھے۔ آپ نامور صحافی، اہل قلم اور شاعر و ادیب عبدالمجید سالک کے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں عبدالسلام کو مسلم ہائی سکول کے پرائمری مدرسہ میں داخل کرا دیا گیا اور ۱۹۳۵ء میں اس سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور اس کالج سے ۱۹۳۹ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم اسلامیہ کالج کے میگزین کریسنٹ کی ادارت بھی کی۔ ۱۹۳۷ء میں حمید نظامی کے اشتراک سے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ بحیثیت جنرل سیکرٹری اسلامیہ کالج مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن انہوں نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ تحریک پاکستان کے کارکن کی حیثیت سے انہیں قائداعظم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور انہوں نے دیگر طلباء رہنماؤں کی طرح آزاد اسلامی مملکت کے قیام کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

۱۹۴۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے صحافت میں ڈپلومہ لیا۔ ۱۹۵۱ء میں ان کی ذہانت، قابلیت اور اسی ڈپلومہ کی بدولت شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی کی صدارت سونپی گئی۔ اسی دوران تاریخ کے مضمون میں ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ۱۹۵۶ء میں ہالینڈ کی یونیورسٹی آف ایمسٹرڈیم سے صحافت میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

عبدالسلام خورشید کو صحافت کا فن ورثہ میں ملا۔ ان کے والد گرامی جناب مولانا عبدالمجید سالک صاحب طرز ادیب، صحافی اور شاعر تھے۔ عبدالسلام

کی انشا پردازی کا آغاز چھٹی جماعت میں ہوا جب انہوں نے بچوں کے رسالہ پھول کے لئے ایک مضمون لکھا۔ اس کے بعد اس رسالے کے لئے متعدد مضامین لکھتے رہے۔ ان کے مضامین بنیادی طور پر معلوماتی ہوتے تھے۔ اس دوران انگریزی زبان و ادب کا شوق ابھرا۔ انگریزی کی کہانیوں کے ترجمے اور سوانح خاکے لکھ کر بطور مترجم اپنا لوہا منوایا۔ زمانہ طالب علمی مشہور ترقی پسند اور عظیم سوشلسٹ لیڈر ایم این رائے سے بے حد متاثر ہوئے۔

عبدالسلام خورشید نے اپنی ملازمت کی ابتداء محکمہ اطلاعات میں بطور اسسٹنٹ جرنلسٹ شروع کی۔ ساتھ ہی ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں چھ ماہ کی رپورٹر ٹریننگ بھی حاصل کی۔ اس کے بعد ہفت روزہ "سدا بہار" میں مدیر معاون کے طور پر کام کیا۔ "سٹار آف انڈیا" اور ہفت روزہ "دکن ٹائمز" کے اعزازی نامہ نگار بھی بن گئے۔ اسی دوران لاہور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام میں پانچ بجے شام کی جنگی خبریں اور مکالمے لکھنے سے باقاعدہ ملازمت کا آغاز ہوا۔ پھر "پنچائت" کے ایڈیٹر بنے لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد یہ مجلّہ بند ہو گیا اور عبدالسلام خورشید کو دوبارہ محکمہ تعلقات عامہ میں ٹرانسفر کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ "ہمارا پنجاب" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد عبدالسلام خورشید نے روزنامہ "انقلاب" میں باقاعدہ کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۹ء میں انقلاب کے بند ہونے کے بعد اخبارات و جرائد میں باقاعدہ معاوضہ پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مارکونی کے نام سے ریڈیو ریولو بھی لکھتے رہے۔ ان کے مضامین روزنامہ "امروز" اور ماہنامہ "ماہ نو" میں باقاعدہ شائع ہوتے رہے۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں روزنامہ "مشرق" کا آغاز ہوا۔ اس میں افکار و حوادث اور واقعات عالم کے عنوانات کے تحت مستقل کالم لکھتے رہے۔ "عالم اسلام" کا کالم بھی ان کے سپرد ہوا۔ مشرق کے زیر انتظام اخبار خواتین ہفت روزہ میں بھی مستقل "گرد و پیش" کا کالم ان کے سپرد ہوا۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۲ء تک قائم رہا۔

۱۹۵۱ء سے پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت سے وابستہ ہو گئے اور

۱۹۵۹ء میں ایم اے صحافت کے اجراء کے ساتھ ہی اس شعبہ کے صدر کے فرائض انجام دینے لگے۔ کئی نئے مضامین مثلاً" مطالعہ پاکستان' تعلقات عامہ' ریڈیائی صحافت اور ٹیلی ویژن صحافت کو لازمی مضمون کی حیثیت دی۔ شعبہ صحافت میں آتے ہی عالمی اخبارات کی نمائش اور اسلامی دنیا کے اخبارات کی نمائش کا انتظام کیا۔ بطور استاد عبدالسلام خورشید صاحب ہمیشہ پابندی وقت کو ملحوظ خاطر رکھتے اور پوری تیاری سے لیکچر دیتے۔ ان کی سوانح حیات "رد میں ہے رخش عمر" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ آخری دم تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی مندرجہ ذیل تصانیف قابل ذکر ہیں۔

۱۔ صحافت پاکستان و ہند میں۔ برصغیر میں انیسویں اور بیسویں صدی میں صحافت کے آغاز و ارتقا کا تفصیلی ذکر ہے اور تمام صحافیوں کا تذکرہ ہے۔

۲۔ داستان صحافت۔ عالمی صحافت کا جائزہ ہے۔

۳۔ کاروان صحافت۔ ادب اور صحافت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ فن صحافت۔ اس میں صحافت کے تکنیکی پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو ہے۔

۵۔ جرنلزم ان پاکستان۔ انگریزی زبان میں تحریر کی ہے۔ اس کتاب میں اردو' پنجابی' فارسی اور علاقائی زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔

۶۔ دنیائے اسلام کی صحافت۔ ترکی' ایران' انڈونیشیا' شام' لبنان' اردن' مصر اور خلیج کی صحافت کے علمبرداروں کے متعلق مفصل مواد شامل ہے۔ اس کتاب کو تمام اسلامی ممالک نے اپنی قومی زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔

۷۔ جرنلزم فار آل۔ انگریزی زبان میں مقابلے کے امتحانات میں شریک ہونے والے امیدواروں کے لیے فائدہ مند ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر مہدی

حسن کے اشتراک سے ترتیب دی گئی ہے۔

۸۔ تعلقات عامہ۔ ڈاکٹر مہدی حسن کے اشتراک سے اور تاریخی پس منظر کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

۹۔ قائداعظم اور پاکستان۔ قائداعظم کی سوانح عمری ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ تصور پاکستان کی ابتدا کیسے ہوئی۔

۱۰۔ تاریخ تحریک پاکستان۔ اس میں قیام پاکستان کے پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۱۔ ہسٹری آف دی آئیڈیا آف پاکستان۔ انگریزی زبان میں ہے۔

۱۲۔ سرگزشت اقبال۔ علامہ اقبال کی سوانح حیات اور علامہ کے نظریات اور سیاسی پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے لئے خدمات کا ذکر ہے۔ علامہ کے شب و روز پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۳۔ عربوں کا عروج و زوال۔ ایک مختصر تاریخ۔ فلپ کے حتی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

۱۴۔ پنجاب کے رومان۔

۱۵۔ اردو ڈراما

۱۶۔ پاکستان کے لوک ناچ۔

۱۷۔ رو میں ہے رخش عمر۔ منفرد آپ بیتی ہے۔

۱۸۔ وے صورتیں الٰہی۔ برصغیر کی ممتاز شخصیات کے بارے میں تفصیل ہے جنہوں نے کسی نہ کسی حوالے سے انفرادی کام سرانجام دے کر تاریخ میں اپنا مقام پیدا کیا۔

۱۹۔ پنجابی ادب اور سالک۔

۲۰۔ انسان اور امن۔

۲۱۔ ممالک اسلامیہ کی سیاست۔

۲۲۔ سالک نامہ۔ اپنے والد گرامی کی یادیں اور یادداشتیں دلچسپ انداز میں ذکر کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

۲۳۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے ۱۰۰ صفحات پر مشتمل کتابچے مندرجہ ذیل شخصیات پر لکھے: سراج الدولہ، حیدر علی، ٹیپو سلطان، سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید، شبلی نعمانی، سرسید احمد خاں، اقبال اور قائداعظم۔

۲۴۔ سوانحی خاکے بچوں کے لئے مندرجہ ذیل شخصیات پر لکھے: صلاح الدین ایوبی، ابوذر غفاری، ٹیپو سلطان، سعد زغلول پاشا، قائداعظم۔

۲۵۔ اردو کے ہندو شعراء: سترھویں صدی سے لیکر بیسویں صدی تک کے ۲۴۰ نامور شعراء کے حوالے سے ایک جامع کتاب ہے اور ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۶۔ نصابی کتب: اردو ریڈر جماعت اول تاہشتم بہ اشتراک صوفی تبسم تاریخ اسلام۔ تین کتابوں کا سیٹ برائے مڈل کلاسز۔ واقفیت عامہ برائے جماعت چہارم و پنجم۔

صحافت کا یہ روشن آفتاب ۱۱ فروری ۱۹۹۵ء کو غروب ہو گیا اور آپ مسلم ٹاؤن قبرستان میں والد عبدالمجید سالک کے پہلو میں دفن ہوئے۔

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض سیالکوٹ کے ایک جاٹ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء کو سلطان محمد کے گھر گاؤں "کالا قادر" نزد نارووال ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد سلطان محمد معروف وکیل تھے۔ فیض کی ذہنی تربیت میں ان کے والد کا گہرا اثر تھا۔ ان کے والد ایک شاندار شخصیت کے مالک تھے وہ صوم صلوۃ کے پابند تھے۔ انہیں علم و ادب سے بھی گہرا شغف تھا۔ اپنے عہد کی نامور ہستیاں شیخ عبدالقادر، علامہ سید سلیمان ندوی، صاحبزادہ آفتاب احمد خان وغیرہ سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ان کی دو انگریزی تصانیف "عبدالرحمٰن کی سوانح عمری" اور "افغانستان کے دستوری قوانین" مشہور ہیں۔ آپ کی والدہ کا نام غلام فاطمہ تھا جو دیندار خاتون تھیں۔

فیض کی ابتدائی تعلیم کا آغاز روایتی طریقے سے ہوا اور والدہ سے قران مجید کی تعلیم حاصل کی۔ فیض نے تین سپارے بچپن میں حفظ بھی کیے تھے مگر آنکھوں میں تکلیف ہونے لگی اور ڈاکٹروں نے منع کر دیا اور اس سعادت سے محروم رہے۔ ۱۹۱۶ء میں فیض کو مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں انہوں نے ابجد پڑھی، عربی، فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ قرآن و حدیث کا درس بھی ان سے لیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۲۱ء میں اسکاٹش مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں داخل ہوئے اور جماعت چہارم سے میٹرک تک یہاں پر تعلیم حاصل کی۔

فیض کو ابتداء ہی سے ادب سے لگاؤ تھا اور سکول کے زمانے میں ہی وہ عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول پڑھ چکے تھے۔ اور اس

کے ساتھ ساتھ داغ، میر اور غالب کا کلام پڑھنے سے ان میں شعری ذوق پیدا ہوا۔ میٹرک تک بہت سے انگریز ادیبوں کو بھی پڑھ چکے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور مرے کالج سیالکوٹ سے ۱۹۲۹ء میں ایف۔ اے کے امتحان میں بھی اول آئے۔ اس کالج میں اقبال کے استاد مولوی میر حسن سے فیض حاصل کیا۔ ایف۔ اے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے کی کلاس میں داخلہ لیا۔ دوران تعلیم ان کے والد کا اچانک انتقال ہوگیا اور وہ مالی مشکلات کا شکار ہو گئے۔ ان کے والد معروف وکیل تھے مگر انہوں نے کچھ ترکہ نہ چھوڑا تھا۔ جو کچھ گھر پر موجود تھا اس کو بیچ کر مختلف افراد کا وہ قرض جو فیض کے والد کے ذمہ تھا ادا کیا گیا اور گھر پر رکھے گئے ملازمین جن کی تعداد چالیس کے قریب تھی ان کو بھی فارغ کر دیا گیا۔ فیض نے ان حالات میں معاش کا سلسلہ چلانے کیلئے ایک کاروباری ادارے میں ملازمت اختیار کرلی اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم پر بھی بھرپور توجہ دیتے رہے۔ ۱۹۳۳ء گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج میں دوران تعلیم انہیں کامل اساتذہ پطرس بخاری اور لینگ ہارن کی تلمذی کا شرف حاصل ہوا۔ شاعری میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے اصلاح لیتے تھے۔

فیض گورنمنٹ کالج لاہور میں پطرس بخاری کی قائم کردہ ادبی مجلس "بزم احباب" کے روح رواں تھے۔ گورنمنٹ کالج کی دوسری ادبی تنظیم "بزم سخن" کے بھی سرگرم کارکن تھے۔ اس ادبی مجلس میں ان کے ساتھ ن۔م راشد، امتیاز علی تاج، چراغ حسن حسرت جیسی جلیل القدر ہستیاں بھی شامل تھیں۔ ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایم۔ اے عربی میں داخلہ لیا اور یہ امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

۱۹۳۵ء میں ایم۔ اے او کالج امرتسر سے تدریسی خدمات کا آغاز بطور استاد انگریزی کیا۔ اس کالج کے وائس پرنسپل معروف ترقی پسند ادیب محمود الظفر تھے۔ یہاں پر فیض کی ملاقات بیگم رشید جہاں، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر اور سجاد ظہیر سے ہوئی اور ان کے خیالات میں ایک واضح انقلاب رونما ہوا۔ ۱۹۳۶ء

میں سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تو فیض نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور لاہور میں اس کی بنیاد رکھی۔ لاہور آکر فیض کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا وہ "ادب لطیف" کے مدیر ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں ہیلی کالج آف کامرس لاہور میں استاد مقرر ہوئے۔ یہاں پر دو سال تک ملازمت کی۔ اسی دورانیے میں (۱۹۴۱ء) آپ کی شادی ڈاکٹر تاثیر کی سالی ایلس جارج کے ساتھ انجام پائی۔ یہ شادی اسلامی طریقے سے ہوئی۔ ان کا نکاح مشہور کشمیری سیاست دان اور وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ نے پڑھایا۔ فیض کی والدہ نے ایلس فیض کا نام کلثوم رکھا۔

ان کے ہاں دو بیٹیاں سلیمہ ہاشمی (پرنسپل نیشنل کالج آف آرٹس) اور منیزہ ہاشمی (انچارج ایجوکیشنل ٹیلی ویژن لاہور) پیدا ہوئیں۔ فیض ۱۹۴۲ء سے دسمبر ۱۹۴۶ء تک فوج کے شعبہ تعلقات عامہ سے وابستہ رہے۔ آپ نے کیپٹن کے عہدے پر ملازمت شروع کی اور ۱۹۴۳ء میں میجر کے عہدے پر ترقی پا گئے اس سال انہیں فوجی خدمات کے صلے میں ایم۔ بی۔ ای کا خطاب ملا اور ۱۹۴۴ء میں کرنل کا عہدہ تفویض ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں فوج سے استعفیٰ دے دیا اور دوبارہ صحافت کی طرف آ گئے اور میاں افتخار الدین کے انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز" اور اردو اخبار روزنامہ "امروز" کے مدیر ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد سیاست کے ساتھ ساتھ ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک اس تنظیم کیلئے کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں سان فرانسیسکو (امریکہ) میں ہونے والی مزدور تنظیم کے مندوبین میں شامل تھے۔ اس سال انہیں عالمی کونسل کا رکن منتخب کیا گیا اور یہ رکنیت ۱۹۷۱ء تک برقرار رہی۔ ۱۹۵۱ء میں آل پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر ہو گئے۔

اس سال ان کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ آیا جس نے ان کی خانگی و مجلسی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا اور انہیں سخت مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ان کی نام نہاد راولپنڈی سازش کیس کے تحت گرفتاری کا واقعہ تھا۔ آپ کو اس نام نہاد سازش کے تحت ۹ مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار کیا گیا۔ اس کیس کا

پس منظر کچھ یوں تھا کہ ۲۲ فروری ۱۹۵۱ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل اکبر خاں کے گھر میٹنگ ہوئی جس میں فیض بھی موجود تھے اس میں جنرل اکبر نے حکومت کا تختہ الٹنے کی سکیم دی جسے حاضرین نے کئی گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد مسترد کر دیا اور طے کیا گیا کہ حاضرین میں سے کوئی بھی شخص کوئی غیر آئینی اقدام نہیں کرے گا۔ یہی میٹنگ راولپنڈی سازش کیس کی بنیاد بنا دی اور دو ہفتے بعد فیض، جنرل اکبر خاں، بیگم جنرل اکبر خاں، سجاد ظہیر اور چند دوسرے افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ فیض احمد فیض ۴ سال ۲ ماہ تک مختلف جیلوں میں قید رہے۔ دوران قید پہلے تین ماہ قید تنہائی کی سزا ملی حتی کہ کاغذ قلم استعمال کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اس کی طرف فیض نے یوں اشارہ کیا ہے کہ

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

قید تنہائی کے خاتمے کے بعد مختلف جیلوں میں اسیری کے ۴ سال ۲ ماہ کاٹنے کے بعد ۱۹۵۵ء میں دیگر اسیروں کے ساتھ رہا ہوئے۔

اس زمانے میں فیض کے فن شعر نے ایک نیا اسلوب اختیار کیا۔ عہد اسیری میں فیض نے اپنے دو مجموعے "دست صبا" اور "زنداں نامہ" مرتب کئے اور تنقیدی مضامین کو "میزان" کے نام سے ترتیب دیا۔ اس عرصے میں فیض نے سائنس، فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، تاریخ اور مذہب کا گہرا مطالعہ کیا۔ رہائی کے بعد ایک بار پھر "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" سے وابستہ ہو گئے۔ اسی ادارے کے ہفت روزہ "لیل و نہار" کی ادارت کے بھی فرائض سرانجام دیئے۔ ۱۹۵۸ء تک یہاں پر خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۲ء پاکستان آرٹس کونسل کے سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۲ء سے لیکر ۱۹۶۴ء تک لندن میں قیام فرمایا ۱۹۶۴ء میں ان کی انسان دوستی، امن پسندی اور ترقی پسندانہ تحریروں کے باعث سوویت یونین کی طرف سے انہیں

لینن امن ایوارڈ ملا۔ فیض پہلے ایشیائی شاعر ہیں جنہیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں لندن سے واپس آ کر عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل اور عبداللہ ہارون ٹرسٹ کے نگران مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک نیشنل کونسل آف آرٹس کے صدر اور حکومت پاکستان کی وزارت امور ثقافت کے مشیر رہے۔ ۱۹۷۶ء میں ان کو ادبی خدمات کے صلے میں "افرو ایشیائی ادبی لوٹس ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں بیروت میں افرو ایشیائی رائٹرز فیڈریشن کے سہ ماہی مجلہ لوٹس کی ادارت سنبھالی ۱۹۸۲ء تک اس کے مدیر رہے۔ جب اسرائیل نے بیروت پر حملہ کیا تو فیض "لوٹس" کے دفتر میں موجود تھے۔ فیض کے ایک فلسطینی دوست نے ایک دن بعد انہیں عمارت سے نکالا۔ فیض کے عمارت سے باہر آنے کے چند گھنٹے بعد یہ عمارت بم کے دھماکہ سے تباہ ہو گئی۔ نومبر ۱۹۸۲ء میں فیض پاکستان آ گئے۔

فیض نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بذریعہ شاعری انتہائی خوبصورت انداز میں ترجمانی کی ہے۔ وہ عظمت انسان کے قائل ہیں۔ فیض نے آج کی دنیا کے سیاسی سماجی اور اقتصادی محرکات کے زیر اثر شعر کہے ہیں۔ ان کی شاعری انسان میں بلند خیالات اور احساس جمال پیدا کرتی ہے۔ فیض کی شاعری دو متضاد کیفیتوں سے آشنا ہے۔ بے پناہ محبت اور سرشاری' بے پناہ درد و کرب۔ ان دونوں کیفیتوں کی جڑیں انسانی نفسیات اور سیاست سے تعلق رکھتی ہیں۔ فیض کی شاعری میں یہ کیفیات ان کی انسان دوستی کے سبب پیدا ہوئی ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت اور اپنائیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ آزادی کے بعد برصغیر ہندو پاک میں غزل کو جو حیات نو ملی ہے اور اس کی مقبولیت میں جو اضافہ ہوا ہے اس میں فیض کی غزل کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ فیض کے پہلے مجموعے "نقش فریادی" کی غزلوں کے بجائے نظموں نے فیض کو ترقی پسند شعراء کی صف میں ایک ممتاز حیثیت اور ہر دل عزیزی بخشی تھی لیکن ان کے دوسرے مجموعے "دست صبا" کی بدولت فیض کی غزل گو شاعر کے طور پر پہچان بنی۔ اور پھر "زنداں نامہ" اور دوسرے شعری مجموعوں کی اشاعت نے ثابت

کر دیا کہ ترقی پسند شاعروں میں فیض تنہا فنکار ہیں جو نظم اور غزل دونوں میدانوں میں اعلیٰ تخلیقی اظہار کی یکساں قدرت رکھتے ہیں اور ان کے اسلوب فن کے اثرات جدید شاعری کی دونوں اصناف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ فیض کے مجموعوں میں جو غزلیں شامل ہیں ان کی مجموعی تعداد چوراسی ہے۔ ان میں مسلسل غزلیں اور غزل پیکر نظمیں بھی شامل ہیں جن کے عنوانات بھی درج ہیں مثلاً" طوق ودار کا موسم اور شہریاراں وغیرہ۔ اگر انہیں الگ کر دیا جائے تو غزلوں کی کل تعداد ستر کے قریب رہ جائے گی۔ یہ مختصر سرمایہ غزل فیض کی پچیس سال کی مشق سخن کا نتیجہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی کہ کسی شاعر نے تعداد میں اتنی کم غزلیں کہہ کر ایسی بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہو اور اپنے رنگ سخن سے ہم عصر شاعروں کو حد درجہ متاثر کیا ہو۔

فیض نت نئی تراکیب اور اظہار کے نئے پیرائے وضع کرتے ہیں وہ اپنی غزل میں ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جو سامع کے حواس کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وطن دوستی اور قومی حالات کے فیضان سے طلوع ہونے والی شاعری قوم پرستانہ شاعری کا درجہ حاصل کر لیتی ہے لیکن فیض کے یہاں یہی شاعری ان کی شخصیت کے ہمہ گیر تناظر کی وجہ سے آفاقی جہتوں سے ہم کنار ہو جاتی ہے اور یہ بڑی شاعری کی امتیازی شناخت ہے۔ فیض کی غزل کے ساتھ ساتھ ان کی نظمیں بھی بڑی دل کش اور متنوع ہیں۔ ان کی نظموں میں ہر جگہ زندگی کی ایک نئی امنگ، نئے جذبے اور امید کی کرن نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی متعدد نظمیں ایک نغمہ کربلائے بیروت کیلئے، سیر وادی سینا، سوچنے دو، دل من مسافر من، تم ہی کہو کیا کرنا ہے، لہو کا سراغ وغیرہ ناقابل فراموش ہیں۔ فیض اپنی سیاسی یا موضوعاتی نظموں میں بھی شعر کی جمالیاتی قدروں سے صرف نظر نہیں کرتے۔ ان کی مشہور نظم "یہ داغ داغ اجالا" سیاسی پس منظر میں لکھی گئی نظم ہے مگر یہ نظم فیض کی حسن کاری اور اظہار پر قدرت کی بہت اچھی مثال ہے جس میں ایک وقتی اور ہنگامی موضوع،

تاثر یا جذبے کو اس طرح کے الفاظ اور استعارات میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ وقت اور زمانے کی قید سے آزاد ہو کر لازوال ہو گیا ہے۔ اپنی شاعرانہ خوبیوں کی بناء پر فیض کو اقبال کے بعد بڑا شاعر کہا گیا۔ فیض کے شعری مجموعے درج ذیل ہیں۔

(۱) نقش فریادی (۲) دست صبا (۳) زنداں نامہ (۴) دست تہہ سنگ (۵) وادی سینا (۶) شہریاراں (۷) مرے دل مرے مسافر (۸) غبار ایام

شعری کلیات: نسخہ ہائے وفا

شاعری کی طرح ان کے افکار و خیالات اور نظریات و تصورات ان کی نثر میں بھی پوری طرح نمایاں ہیں۔ ان کی نثر ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور فیض کی عظیم شخصیت کا آئینہ ہے۔ فیض کی نثر میں موضوع کا تنوع، فکر کی گہرائی، خیال کی بلندی، اظہار کی جمال آفرینی، انسانیت کا دکھ اور فلسفیانہ اور عالمانہ پن موجود ہے۔ وہ اقبال ہی کے قبیل کے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ فیض نے نثر میں باقاعدہ مضامین و مقالات تحریر کئے ہیں۔ ان کے خطوط کا بھی بڑا سرمایہ موجود ہے۔ سفری روداویں، جلسوں کی تقریریں، ڈرامے، طنزیات، آراء اور انٹرویو اس پر مستزاد ہیں۔ فیض زیادہ سے زیادہ مفہوم کم سے کم الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ کفایت لفظی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ بوجھل الفاظ اور مشکل اصطلاحات سے ہر ممکن احتراز کرتے ہیں۔ چند جملوں میں اپنا مقصد بیان کر کے قارئین کو لمحہ فکریہ فراہم کرتے ہیں۔ فیض کی درج ذیل نثری تصانیف موجود ہیں۔

۱۔ میزان

مختلف عنوانات پر لکھے گئے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

۲۔ صلیبیں مرے دریچے میں

راولپنڈی سازش کیس میں گرفتاری کے دوران جیل سے لکھے گئے

خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط ایلس فیض کے نام ہیں۔ چند خطوط سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی کے نام بھی ہیں۔ یہ خطوط انگریزی میں تھے جنہیں بعد ازاں فیض نے مرزا ظفر الحسن کی خواہش پر اردو میں ترجمہ کیا۔ جسے مرزا ظفر الحسن نے ہی ترتیب دے کر شائع کیا۔

۳۔ متاع لوح و قلم

اس مجموعے میں فیض کی تقریریں، مضامین، انٹرویو، خطوط، آرائیں، نشریات، ڈرامے وغیرہ شامل ہیں اور آخر میں سید سبط حسن، سجاد ظہیر، مرزا ظفر الحسن اور سحر انصاری کی تحریریں شامل ہیں۔

۴۔ ہماری قومی ثقافت

یہ کتاب فیض کی ۶۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۳ فروری ۱۹۷۶ء کو شائع ہوئی اس میں فیض کی چار تقریریں "تہذیب کیا ہے؟" پاکستانی ثقافت کے اجزائے ترکیبی "پاکستان ثقافت کی مکمل صورتیں" "پاکستانی ثقافت اور اس کے مسائل" شامل ہیں۔

۵۔ مہ و سال آشنائی

یہ فیض کے مختلف برسوں میں کئے گئے سفر روس کی روداد ہے۔ اس میں فیض کی مختلف روسی ادیبوں سے ملاقات کا تذکرہ بھی شامل ہے۔

۶۔ سفرنامہ کیوبا

اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ۴۲ صفحات پر مشتمل فیض کے سفرنامہ کیوبا کی روداد اور دوسرے حصے میں ۸۲ صفحات پر مشتمل فیڈل کاسترو کی تقریر شامل ہے۔

۷۔ پاکستانی کلچر اور قومی تشخص

اس میں تہذیب اور کلچر کے موضوع پر لکھے گئے فیض کے چودہ

مضامین شامل ہیں۔

۸۔ اقبال

علامہ اقبال کے فلسفہ و نظریات پر لکھی گئی جامع کتاب ہے۔

یہ عظیم شاعر اور نثر نگار ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب خالق حقیقی سے جا ملا۔ آپ کی آخری آرام گاہ قبرستان جی بلاک ماڈل ٹاؤن میں ہے۔ آپ کی قبر قبرستان کے مشرقی کونے کی دیوار کے ساتھ ہے اور قبر پر سیاہ پتھر لگایا گیا ہے۔ قبر کا ڈیزائن بھی عمومی قبروں سے مختلف ہے۔ جو اس منفرد شاعر کو مرنے کے بعد بھی انفرادیت بخشتا ہے۔

اس عظیم المرتبت شاعر کی یادیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔

maablib.org

کنہیالال ہندی

کنہیالال نام اور ہندی تخلص تھا آپ جون ۱۸۳۰ء میں قصبہ جلیسر (سابق علی گڑھ حال ضلع ایٹہ یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ہر نرائن کایستھ برادری کے فرد تھے۔ کنہیالال چھ برس کی عمر میں مدرسے میں داخل ہوئے اور مڈل تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد انگریزی تعلیم کے حصول کیلئے آگرہ چلے گئے۔ ۱۸۴۶ء میں آگرہ سے میٹرک کا امتحان نمایاں نمبروں کے ساتھ پاس کیا میٹرک میں وظیفہ حاصل کر کے انجینئرنگ کالج رڑکی (دہرہ دون) سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۸۵۰ء میں لاہور میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں وہ نیک نامی سے ملازمت کر کے ترقی کرتے رہے اور سپرنٹنڈنٹ انجینئر درجہ اول ہو گئے۔ کنہیالال نے ۳۵ سال تک ملازمت کی اور وہ ۱۸۸۵ء میں گورنمنٹ کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ گورنمنٹ نے ان کی خدمات کے صلے میں انہیں "رائے بہادر" کے خطاب سے نوازا۔

کنہیال لال روشن خیال آدمی تھے۔ لاہور میں اپنا فارغ وقت انہوں نے ضائع نہیں کیا بلکہ خالی اوقات میں تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا۔ پہلے ریاضی اور انجینئرنگ پر اردو اور انگریزی میں کتابیں لکھیں جو مدارس کے نصاب میں داخل ہوئیں اور پھر اپنے بیٹے کی تربیت کیلئے نصائح کی منظوم کتاب لکھی۔ تاریخ کا ذوق انہیں لاہور کی عمارات کی مرمت کرنے کے دوران ہوا۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب کی تاریخ نثر میں لکھی اور پھر ایک منظوم تاریخ ظفرنامہ رنجیت سنگھ تحریر کی۔ قدرت نے انہیں ذوق لطیف سے نوازا تھا۔ انہوں نے لاہور میں اپنی مستقل سکونت کے دوران اپنے اس ذوق کی تسکین تصنیفی شغل کے ذریعے کی اور اس سرزمین سے محبت کا زندہ ثبوت ان کی کتاب "تاریخ لاہور" ہے۔ انہوں نے مثنوی ہیرو رانجھا لکھ کر سرزمین پنجاب سے اپنی حقیقی

محبت کا بھرپور انداز میں اظہار کیا ہے۔

کنہیالال مختلف الجہات شخصیت تھے۔ ان کا پیشہ انجینئرنگ تھا لیکن اردو، فارسی اور انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ رکھنے کے ساتھ ساتھ خود بھی اعلیٰ پائے کے مورخ، شاعر اور انشاء پرداز تھے۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ گلزار ہندی (منظوم فارسی)
۲۔ یادگار ہندی (فارسی)
۳۔ بندگی نامہ (فارسی)
۴۔ اخلاق ہندی (اردو)
۵۔ مناجات ہندی (اردو)
۶۔ رنجیت نامہ (فارسی)
۷۔ تاریخ پنجاب (اردو)
۸۔ نگاریں نامہ (فارسی)
۹۔ نصیحت نامہ (اردو)
۱۰۔ مخزن توحید (فارسی)
۱۱۔ تاریخ لاہور (فارسی)
۱۲۔ نمریٹر فن انجینئری (پیمائش کی قابل قدر کتاب ہے)

تصنیف و تالیف کے علاوہ کنہیالال نے لاہور میں بطور انجینئر تعیناتی کے دوران مختلف تاریخی عمارات اپنی نگرانی میں تعمیر کروائیں۔ ان عمارات میں سینٹ ہال (پنجاب یونیورسٹی لاہور) ضلع کچہری لاہور اور منٹگمری ہال (موجودہ جناح پبلک لائبریری باغ جناح) شامل ہیں۔

کنہیالال نے ۱۸۸۸ء میں لاہور میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد نواں کوٹ لاہور کے مقام پر ان کی سمادھ کے طور پر ایک یادگار بنوائی گئی اور اس سے متصل مندر رام چندر جی بھی تعمیر کروایا گیا۔

اپنی تعمیری، تصنیفی اور تاریخی خدمات کی بدولت سرزمین لاہور کے ساتھ ان کا نام ہمیشہ وابستہ رہے گا اور ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

مولوی فیروز الدین

مولوی فیروزالدین اگست ۱۸۶۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر سے شروع ہوئی۔ آٹھ سال کی عمر تھی کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے والد مولوی جان محمد صاحب ایک بزرگ حضرت عیدو شاہ کے مرید تھے۔ حضرت عیدو شاہ کو برٹش گورنمنٹ نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران ختم کر دیا تھا۔ مولوی جان محمد نہ صرف ایک عالم تھے بلکہ روحانی علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد مولوی فیروزالدین اپنے بڑے بھائی مولوی فتح الدین کی زیر سرپرستی آئے جو ڈاکخانہ کے محکمہ میں ملازم تھے۔ یہ ملازمت چھوڑ کر سردار محمد حیات (سر سکندر حیات کے والد) کے سررشتہ دار مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد سیشن جج مقرر کئے گئے۔ مولوی فتح الدین نے ملازمت چھوڑ کر ایک اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے بھائی فیروزالدین کو اورینٹل کالج کی منشی عالم کلاس میں داخل کرا دیا۔ لیکن ۱۸۷۹ء میں جب کہ مولوی فیروز الدین کی عمر صرف ۱۵ سال تھی کے بھائی مولوی فتح الدین کا انتقال ہو گیا۔ اپنی تعلیم چھوڑ کر انہوں نے اپنے بڑے بھائی کے اخبار کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی محنت اور لگن کی داد دینی پڑے گی کہ انہوں نے اس کم عمری میں نہ صرف اخبار کو کامیابی سے جاری رکھا بلکہ رفتہ رفتہ ایک کامیاب پبلشر بن گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ مسلمان بچوں کے لئے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ مولوی فیروزالدین نے محسوس کیا کہ کتابوں کی فراہمی کے سلسلہ میں وہ مسلمان قوم کی خدمت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس پر کمربستہ ہو گئے۔ ۱۸۸۴ء میں انجمن حمایت اسلام، ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی اور ۱۸۸۵ء میں پنجاب

پبلک لائبریری قائم ہوئی۔ مولوی فیروز الدین نے کتابوں کی سپلائی کا بیڑہ اٹھایا۔

مولوی فیروزالدین نے حضرت علی ہجویری کی تصنیف کشف المحجوب کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور مسودہ حافظ انور علی سب جج جو تصوف پر کئی کتب کے مصنف تھے کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے اس کتاب کی طباعت کا مشورہ دیا۔ اس کتاب کی طباعت مولوی کریم بخش مالک اسلامیہ سٹیم پریس نے کی۔ مولوی فیروزالدین نے ۱۸۹۴ء میں فیروز سنز لیمٹڈ کے نام سے کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی نے شروع میں بہت آہستہ ترقی کی کیونکہ غیر مسلم پبلشروں کو سرکاری حمایت حاصل تھی۔

۱۹۰۳ء میں مولوی فیروزالدین نے دربار دہلی کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی جو اس زمانے کی ائیر بک اور ہوز ہو (Year book and who,s who) کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے تصویری نقشے شائع کئے۔ اس میں ہندوستان برٹش ایمپائر اور دنیا کے نقشے شامل تھے۔ یہ نقشے بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے گلستان سعدی کا اردو ترجمہ کیا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ نثر کا نثر میں اور اشعار کا ترجمہ اشعار میں کیا گیا۔ مولوی فیروزالدین نے یادگار سعدی کے نام سے کتاب لکھ کر اسے نواب رامپور کے نام سے معنون کیا۔ اب انہوں نے نصابی کتب کی طرف توجہ کی۔ پرائمری جماعتوں کے لیے نصابی کتابیں لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دبستان اخلاق کے نام سے کتاب لکھی جس کا مقصد بچوں کی اخلاق کی تربیت تھی۔ اس کتاب کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ کتاب نصابی کتاب کا درجہ حاصل کر گئی۔ اس کے بعد تاریخ پنجاب کے نام سے ایک کتاب لکھی اور حکومت پنجاب کی جانب سے ۳۰۰ روپیہ انعام حاصل کیا۔ مولوی صاحبؒ بطور ماہر تعلیم اور نصابی کتب کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے۔ اسی دوران پنجاب کے ڈائریکٹر ایجوکیشن نے سکولوں کے لئے گلوب کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب کو اس کام کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ لیکن انہوں نے اس کا بیڑہ اٹھایا۔ کلکتہ کی میکملن کمپنی نے بھی گلوب کے نمونے بھیجے لیکن مولوی

فیروزالدین کا بنایا ہوا گلوب پسند کیا گیا اور انہوں نے مطلوبہ تعداد میں گلوب فراہم کر دیئے۔

اس زمانے میں مسٹر گاڈلے ڈائریکٹر ایجوکیشن مقرر ہوئے۔ وہ بیک وقت ایچیسن کالج لاہور کے پرنسپل بھی مقرر ہوئے۔ مسٹر گاڈلے نے مولوی فیروزالدین کو اس کالج میں السنۂ شرقیہ کے استاد کی جگہ کی پیش کش کی۔ لیکن مولوی صاحب نے یہ کہتے ہوئے کہ ان کے خاندان کے کسی شخص نے گورنمنٹ کی ملازمت نہیں کی ہے اور شاید وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکیں گے اس پیش کش کو قبول کرنے سے معذرت کا اظہار کر دیا۔ مسٹر گاڈلے ان کی اصول پسندی کے بہت معترف ہوئے اور ان کی بڑی حوصلہ افزائی کی جو ان کے کاروبار میں مزید مد و معاون ثابت ہوئی۔ مولوی صاحب کا کہنا تھا کہ انسان کو اپنے نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے وقتی مالی مفاد کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اگر کوئی انسان اپنی لائن میں ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کام میں خصوصی مہارت پیدا کرنی چاہیے۔ انسان کی عظمت اور بلندی صرف بڑی بڑی مہمات اور جنگوں میں کامیابی حاصل کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اپنی زندگی کی جدوجہد کو کامیابی اور تندہی سے جاری رکھنے سے بھی انسان عظیم لوگوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مولوی فیروزالدین مسلمانوں کی ایک عظیم شخصیت ثابت ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب نے ۱۸۹۴ء میں فیروز سنز کی بنیاد رکھی اور شروع میں درسی اور نصابی کتب کی تیاری اور طباعت میں نام پیدا کیا۔ انہوں نے جو کتابیں لکھیں اور طبع کرائیں ان کے صفحات کی تعداد پچاس ہزار صفحات سے کم نہیں ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مولوی صاحب نے شیرانوالہ دروازہ کے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت میں اپنا مطبع قائم کیا جو جدید ترین مشینوں پر مشتمل تھا۔ اس کا افتتاح سر فضل حسین وزیر اعلیٰ پنجاب نے کیا۔ ہندوؤں کے پاس اردو اور انگریزی کے پریس بھی تھے اور پیسہ بھی تھا۔ جبکہ مسلمان ان چیزوں سے محروم تھے۔ مسلمانوں کا کوئی اخبار تھا نہ کوئی آواز۔ مسلمانوں کے دو اخبار آبزور اور

مسلم آؤٹ لک نکلے مگر زیادہ دیر چل نہ سکے۔ اس زمانے میں مولوی صاحب نے ایسٹرن ٹائمز کے نام سے انگریزی کا اخبار جاری کیا۔ ایسٹرن ٹائمز نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں مسلمانوں کے نقطہ نظر کو واضح کرنے میں بڑا مثبت کردار ادا کیا۔

کتابوں کی طباعت کے علاوہ فیروز سنز نے قرآن مجید کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا اور بہت کم ہدیہ کے ساتھ طباعت شروع کی۔ مولوی صاحب نے بذات خود قران کریم کا ترجمہ بھی کیا اور غلطیوں سے پاک قرآن مترجم کی طباعت شروع کی۔ اس کا ہدیہ بے حد کم تھا لیکن تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے منافع بخش ثابت ہوا۔ اس کے منافع سے ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا جس کا مقصد غربا کے لیے امدادی ہسپتال کا قیام تھا۔ اس ٹرسٹ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار کی رقم داتا دربار کی ڈسپنسری کو عطیہ کے طور پر دیا۔ ۱۹۷۱ء میں فاطمہ فیروز ہسپتال کے نام سے ایک میٹرنٹی ہسپتال قائم کیا گیا جس کا افتتاح ۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو گورنر پنجاب کے ہاتھوں سے ہوا۔

مولوی فیروزالدین کی تصانیف میں سب سے اہم "جہاد زندگی" ہے جو خود نوشت سوانح عمری ہے۔ اس کے علاوہ بیان المطلوب ترجمہ کشف المحجوب، تجرید بخاری، منظوم ترجمہ مثنوی مولانا روم، سلام فیروز جو نعتیہ کلام پر مشتمل ہے، تسہیل القرآن تفسیر قرآن مجید اور کشف الاسرار کا اردو ترجمہ اہم تصانیف ہیں۔

مولوی صاحب کے فرزند اول عبدالحمید خان نے جو کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر تھے انہوں نے مولوی صاحب کے ٹرسٹ کو مزید ترقی اور تقویت دی۔ آپ کے دوسرے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالوحید خاں نے بھی اس میں بہت دلچسپی لی۔ مولوی صاحب کے پوتے عبدالسلام خان نے ریحانہ سلام ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے جس کے تحت فیروز پور روڈ پر ایک ادارہ بحالی معذوران کے نام سے کام کر رہا ہے۔ مولوی صاحب کے دوسرے پوتے خالد وحید صاحب فیروز سنز لیبارٹیز کے نام سے دوائیں تیار کرنے کا کارخانہ چلا رہے

ہیں ان کی قابلیت سے متاثر ہو کر صدر پاکستان نے ۱۹۷۲ء میں انہیں پاکستان ٹوزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا منیجنگ ڈائریکٹر مقرر کیا۔ انہوں نے فیض آباد راولپنڈی میں ایک دارالیتامی کے قیام کا بندوبست کیا ہے۔

مولوی فیروزالدین اسلامی ذہن رکھنے والے سچے اور پکے مسلمان تھے۔ ۱۹۳۰ء میں مولوی صاحب نے حج کا سفر اختیار کیا اور بذریعہ بحری جہاز ایس ایس دارا کراچی سے جدہ پہنچے۔ یہاں انہوں نے معلم عبدالرزاق فارسی کے ساتھ قیام کیا۔ یہ حضرت کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد مدینے میں آٹھ دن کے قیام کے بعد مکے تشریف لے گئے اور ارکان حج ادا کئے۔ حج کے اژدہام کے باعث حجراسود کو بوسہ نہ دے سکے اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اسے چوم لیا۔ اس زمانے میں سرزمین عرب میں سڑکیں کچے راستے پر مشتمل تھیں اونٹوں کی قطاروں کے ساتھ ساتھ موٹروں کی قطار بھی چلتی رہتی تھی۔ معلم صاحبان کا رویہ بھی حاجیوں کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ مولوی صاحب کا خیال تھا کہ حج ایسا موقع ہے جس پر اسلامی ممالک کے سربراہوں کو ہر سال ایک جگہ مل بیٹھنا چاہیے اور عالم اسلام کے مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ ایک سچے اور پکے مسلمان ہونے کی وجہ سے مولوی صاحب بزرگان دین اور صوفیائے کرام کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ خود بھی ایک خدا رسیدہ صوفی سے کم نہ تھے۔ انہیں ہمیشہ ایک روحانی رہنما کی تلاش رہی۔ اس تلاش میں انہوں نے بے شمار پیر صاحبان کے پاس حاضری دی۔ لیکن مولوی صاحب حضرت داتا گنج بخش کے بڑے معتقد تھے۔ پچاس سال سے ان کا یہ معمول تھا کہ روزانہ مزار پر فاتحہ کے لئے حاضری دیتے۔ اپنے خرچ پر مزار کی سنگ مرمر کی جالیاں لگوائیں۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ انہوں نے دوبار خواب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی۔

مولوی فیروزالدین کا انتقال ۲ اپریل ۱۹۴۹ء کو ہوا اور آپ دربار حضرت داتا گنج بخش کے احاطے میں دفن ہوئے۔

مولانا غلام رسول مہر

مولانا غلام رسول مہر ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء کو جالندھر کے گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا چودھری نظام الدین اور والد چودھری محمد علی خاں زمیندار تھے۔ اگرچہ ان پڑھ تھے لیکن اپنے ذاتی اوصاف اور برادری کے لیے خدمات کی بناپر جالندھر کے اعوانوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ چودھری محمد علی نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر توجہ دی اور قریب کے گاؤں کے دیہاتی مدرسے سے تعلیم کی ابتدا ہوئی۔ گیارہ سال کی عمر میں والد صاحب خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس کے بعد والدہ نے بیٹے کی تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی۔ پرائمری کے بعد مشن ہائی سکول جالندھر میں داخلہ لے لیا۔ میٹرک پاس کر کے مولانا مہر لاہور آ گئے اور اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور تقریباً ۵ سال کے بعد ۱۹۱۵ء میں یہاں سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔

شاعری سے فطری لگاؤ تھا اور نویں جماعت سے شعر گوئی شروع کر دی تھی۔ کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کرتے۔ مباحثوں بھی شریک ہوا کرتے۔ کرکٹ سے بھی دلچسپی تھی اور کالج کی کرکٹ الیون میں شامل تھے۔ کالج کی تعلیم کے دوران کالج کے پرنسپل ہنری مارٹن، پروفیسر ایم اے غنی، خواجہ دل محمد اور مولانا محمد عمر خاں سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔

علامہ اقبال اور ظفر علی خاں کے بعد مولانا مہر جس تیسری عظیم شخصیت سے متاثر ہوئے وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا آزاد سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ نہ صرف مولانا آزاد کی قائم کردہ جماعت حزب اللہ کے ممبر بن گئے بلکہ مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی۔ انگریز دشمنی کے جذبے کی

وجہ سے سرکاری ملازمت نہ کرنے کا عہد کر لیا اور صحافت کا پیشہ اپنے لئے منتخب کیا۔ اتفاقاً" دو تین دوستوں کے ہمراہ حیدر آباد دکن کا سفر اختیار کیا اور وہاں وقار الدولہ کی پائیگاہ کے محکمہ تعلیم کے انچارج بنا دیئے گئے۔ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کا عرصہ حیدر آباد میں گزارا۔ حیدر آباد سے واپسی پر روزنامہ زمیندار لاہور سے منسلک ہو گئے۔ تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اور زمیندار کا عملہ گرفتار تھا اور ایڈیٹر کی جگہ خالی تھی۔ چنانچہ بطور ایڈیٹر کام شروع کر دیا اور طلوع صبح امید کے عنوان سے اخبار کا ایڈیٹوریل لکھا۔ اسی مقالے سے یعنی ۱۸ نومبر ۱۹۲۱ء سے ان کی صحافت کا آغاز ہوا۔ اخبار زمیندار سے تقریباً" ۵ سال وابستہ رہنے سے مولانا نے اخبار نویسی میں کافی تجربہ حاصل کر لیا تھا۔ یہیں مولانا عبدالحمید سالک سے ملاقات اور تعارف ہوا اور یہ برادرانہ رفاقت تادم آخر قائم رہی۔

اپریل ۱۹۲۷ء میں مولانا مہر اور مولانا سالک دونوں اخبار زمیندار سے علیحدہ ہو گئے اور "انقلاب" کے نام سے بڑی آن بان کے ساتھ ایک روزانہ اخبار کا اجرا کیا۔ اخبار انقلاب ۱۹۴۹ء تک افق صحافت پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکتا رہا۔

مولانا مہر علامہ اقبال سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ان کی رہائش علامہ اقبال میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے بہت قریب تھی۔ اس لئے تقریباً" روزانہ علامہ کی خدمت میں جاتے اور اکثر وہ بھی بلا بھیجتے۔ روزنامہ انقلاب کی اشاعت وسیع ہوئی تو معاشی آسودگی بھی حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں مولانا مہر اور مولانا سالک نے مسلم ٹاؤن میں اپنی کوٹھیاں بنوالیں اور اخبار کا دفتر اور پریس بھی دوسری بلڈنگ میں منتقل ہو گیا۔

۱۹۳۴ء میں مولانا کو آشوب چشم کی شکایت پیدا ہوئی جس نے کافی طول کھینچا اور کافی عرصہ شملے میں گزارا۔ ایک ایسا دور بھی آیا جو مولانا مہر نے اخبار نویسی ترک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس بیماری کی عطا کردہ فراغت کے باعث مولانا مہر ایک محقق کی حیثیت سے سامنے آئے اور اس زمانے میں اردو

کی چند اچھی نظمیں بھی لکھیں جو انقلاب میں شائع ہوئیں۔ چنانچہ سیرت امام ابن تیمیہ اور "غالب" کے نام سے دو کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کتب کی اشاعت کے بعد ان کا شمار کہنہ مشق صحافیوں میں ہونے کے ساتھ ساتھ محققین میں بھی شامل ہو گیا۔ "غالب" کی اشاعت نے مہر کی تحقیق اور تمحیصی میدان میں کامیابی کے دروازے کھول دیئے۔

روزنامہ انقلاب کی بندش کے بعد علم و ادب سے ان کی گہری وابستگی کے باعث تحقیق و تصنیف ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ مولانا مہر کو سیاسی آزادی اور بیداری کی تحریکوں سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کا اظہار ان کی تصانیف "سید احمد شہید" "سرگذشت مجاہدین" "جماعت مجاہدین" اور "انقلاب ۱۸۵۷ء" سے بخوبی ہوتا ہے۔ مولانا مہر کی لکھی ہوئی نصابی کتب کی تعداد تقریباً ۳۵ کے قریب ہے۔ ان نصابی کتب میں سے دو کتابیں "سرور عالم" اور مختصر تاریخ اسلام کی افادیت کے باعث انہیں مستقل کتب کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ جن کتابوں پر آپ نے نظر ثانی کی ان میں "اورنگ زیب پر ایک نظر" "سیرۃ النبی ابن ہشام" "دیوان غالب فارسی" "سورۃ یوسف کی تفسیر الجمال و الکمال" "اسلامی فنون کی داستان" "مکتوبات سعد اللہ خان اور عظما" کے معاشی نظریات وغیرہ شامل ہیں۔

سیرت امام ابن تیمیہ کو مولانا مہر کی دیگر تصانیف پر فوقیت حاصل ہے۔ یہ ان کی پہلی کتاب ہے۔ ان کی دوسری تصنیف غالب ہے جس میں مہر خود مرزا غالب کے خطوط میں موجود آثار سے کام لے کر ان کی مفصل سوانحی حالات مرتب کئے ہیں۔ "غالب" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں باتصویر شائع ہوا لیکن بعد کے ایڈیشنوں میں تصویریں حذف کر دی گئیں۔ البتہ مولانا ابوالکلام کی وہ آراء اور تحریریں جو انہوں نے غالب کے متعلق وقتاً فوقتاً تحریر کی تھیں جابجا موقع محل کے مطابق کتاب کے حاشیوں میں درج کر دی ہیں جن کے باعث کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

"سیاست اسلامیان ہند" ۶۸ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے۔ اس کا

مقصد یہ تھا کہ بیرونی اسلامی دنیا تک مسلم لیگ کی آواز پہنچائی جائے۔ اس لیے اس رسالے کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرایا گیا اور اسے اسلامی ممالک میں تقسیم کیا گیا۔

"آزادی کی جنگ" نام کی کتاب مولانا مہر اور مولانا سالک کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں جنگ عظیم اول اور یورپ میں وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات سے اس طرح بحث کی گئی ہے کہ جنگ عظیم دوم کے تمام اسباب کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

جوزفین، نپولین بوناپارٹ کی پہلی بیوی کی سوانح حیات ہے جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی۔ "۱۸۵۷ء کے مجاہد" کے نام سے کتاب ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ "تاریخ سندھ" سندھی ادبی بورڈ کی تحریک پر لکھی گئی۔ دو جلدوں میں یہ کتاب کلہوڑا خاندان کی مفصل تاریخ ہے۔ "سرور عالم" بطور نصابی کتاب کے شائع ہوئی اور بعد ازاں اردو داں طبقے کے لیے باقاعدہ کتاب کی صورت میں اسے شائع کیا گیا۔ جنرل سر عمر حیات ٹوانہ کی سوانح حیات بھی فرمائش پر ترتیب دی۔

مولانا مہر نے جو کتابیں ترتیب و تالیف کی ہیں ان میں خطوط غالب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ "سرود رفتہ" کے نام سے کتاب میں علامہ اقبال کا وہ کلام ہے جو علامہ نے قلمزد کر دیئے تھے۔ "نقش آزاد" کے نام سے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا اور اس کے بعد "تبرکات آزاد" کے نام سے کتاب مولانا آزاد کے مضامین اور کچھ مکاتیب پر مشتمل ہے۔ "باقیات ترجمان القرآن" میں ۷۶ سورتوں کی تشریح و تفسیر شامل ہے۔ "دیوان غالب" کو بھی مرتب اور ۱۹۶۷ء میں شائع کی۔ علامہ اقبال کی کتب کے مطالب "مطالب" "بانگ جبریل" "مطالب ضرب کلیم" "مطالب اسرار رموز" "مطالب بانگ درا" اور غالب کے کلام کی تشریحات "نوائے سروش" کے نام سے شائع ہوئی۔

مولانا مہر نے جن کتابوں کے تراجم کئے ان کی تعداد ۵۰ کے لگ بھگ

ہے ان میں نمایاں کتب طبقات ناصری، فکر جدید کے سانچے، مطالعہ تاریخ، تاریخ تہذیب، قسطنطنیہ، تاریخ شام، جزیہ اور اسلام، اسلام صراط مستقیم، پاکستانی معاشرہ و ثقافت وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا مہر کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ مگر ان کی تحریروں اور اسلوب نگارش کی دلکشی یہ ہے کہ انہوں نے کسی جگہ انگریزی الفاظ استعمال نہیں کیے۔ حالانکہ تحریک سرسید کے رکن ہونے کے باوصف ان کی تحریروں میں انگریزی الفاظ کا شامل ہو جانا حقیقی امر تھا۔ مگر انہوں نے اسلوب نگارش پر اپنی تحریکی وابستگی کی چھاپ کبھی نہ لگنے دی۔ یہی ان کی تحریر کا خاصہ اور وصف ہے۔ وہ مختلف اصناف نثر یعنی سیرت اور سوانح نگاری، تاریخ، تحقیق، شرح، ترجمہ، سفر نامہ اور صحافت کی تحریر میں یکساں کامیاب رہے۔ یہ آپ کی علمیت اور جامعیت کی سب بڑی مثال ہے۔ مولانا مہر نے بیرون ملک بھی کئی سفر کیے۔ دو تین بار افغانستان گئے۔ لندن گئے، فلسطین گئے، فرانس گئے اور حجاز کا سفر اختیار کیا۔ ان کے سفرنامے روزنامہ انقلاب کی زینت بنے۔ ایوب خان کے دور میں حکومت نے پرائڈ آف پرفارمنس اور دس ہزار روپے بطور انعام دینا منظور کیا۔ لیکن مولانا مہر نے انکار کر دیا۔

بالآخر ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو علم و قلم کا مہر درخشاں غروب ہو گیا اور مسلم ٹاؤن قبرستان میں آسودۂ خاک ہوا۔

میاں بشیر احمد

میاں بشیر احمد مارچ ۱۸۹۳ء میں باغبانپورہ میں پیدا ہوئے ان کا تعلق باغبانپورہ کے معروف و مشہور ارائیں خاندان سے تھا جن میں جسٹس شاہ دین، میاں سر شفیع جسٹس سر عبدالرشید، بیگم شاہ نواز، میاں افتخار الدین جیسے مشاہیر پیدا ہوئے میاں بشیر احمد کے والد جسٹس شاہ دین ہمایوں تھے جو اپنے گوناگوں اوصاف کی بناء پر ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ جسٹس شاہ دین علامہ اقبال کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔

میاں بشیر احمد نے گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آکسفورڈ کا رخ کیا اور بیس سال کی عمر میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ چند برس وکالت کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں اعزازی لیکچرار مقرر ہوئے۔ وہ سیاست اور اسلامی تاریخ جیسے اہم مضامین کی تعلیم طلبہ کو دیتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد کالج سے الگ ہو گئے مگر اسلامیہ کالج کے ساتھ ان کا تعلق تاحیات قائم رہا۔ ۱۹۲۲ء میں مشہور ادبی جریدے ہمایوں کی بنیاد رکھی جو باقاعدگی سے ۱۹۵۷ء تک شائع ہوتا رہا ہمایوں علمی متانت اور ادبی پاکیزگی کا امتزاج تھا۔ ہمایوں کے ادارہ میں شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی، حامد علی خاں، حفیظ ہوشیار پوری اور ناصر کاظمی جیسے ادیبوں نے کام کیا۔

میاں بشیر احمد قائداعظم کی دعوت پر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کے مشہور اجلاس لکھنؤ میں شریک ہوئے۔ انہوں نے باغبانپورہ میں مسلم لیگ کی شاخ قائم کی۔ ۱۹۴۱ء میں قائداعظم کی ہدایت پر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر بنے۔ ڈیڑھ سال تک اس عہدے پر کام کیا اور ان کے بعد حمید نظامی نے یہ

ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۴۲ء میں جالندھر میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو میاں بشیر احمد صدر استقبالیہ تھے انہوں نے جو خطبہ استقبالیہ پڑھا اس میں ملی مسائل کا نہایت دلاویز انداز میں تجزیہ کیا گیا تھا۔ ۱۹۴۲ء ہی میں قائداعظم نے انہیں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔ وہ ۱۹۴۷ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۶۴ء کے الیکشن میں آپ فیروز پور کے حلقہ "زیرہ موگا" سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں انہیں ترکی میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا۔

میاں بشیر احمد کو قائداعظم سے بڑی عقیدت اور نیاز مندی تھی۔ اس کا ثبوت انہوں نے ہر مقام پر دیا۔ جب محترمہ فاطمہ جناح نے صدارتی الیکشن لڑا تو میاں بشیر احمد نے ان کی پرجوش حمایت کی۔ آپ نے مشہور زمانہ نظم بھی لکھی جو آج تک زبان زد عام و خاص ہے:

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح

میاں بشیر احمد کی یہ نظم ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے تاریخی جلسے منعقدہ منٹو پارک کیلئے لکھی گئی تھی۔ یہ نظم اس جلسے میں انور علی نے پڑھی اور اس کو سن کر حاضرین میں ایسا جوش پیدا ہوا جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے یہ اشعار ان کی قائداعظم کے ساتھ والہانہ محبت کے ترجمان ہیں۔

قائداعظم پر بے شمار نظمیں گذشتہ نصف صدی میں لکھی گئی ہیں لیکن میاں بشیر احمد کی اس نظم میں جو بات ہے وہ کسی اور نظم میں نظر نہیں آتی۔

میاں بشیر احمد مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے نامور رہنما تھے۔ قائداعظم اور نوابزادہ لیاقت علی خان سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ وہ ان دونوں کے ہم نوا اور ہمدم و دمساز تھے۔ انہوں نے پنجاب مسلم لیگ کی تحریک کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنے قلم سے تحریک پاکستان کو نئی زندگی بخشی اور دامے، درمے، سخنے اس کام میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

وہ اردو زبان کے پرستار تھے اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے ساتھ مل کر انہوں نے اردو کی ترویج و اشاعت کیلئے بڑا کام سرانجام دیا۔ وہ انجمن ترقی اردو کی پنجاب شاخ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنے رسالے "ہمایوں" اور اپنی عملی کوششوں سے اردو کو خاصا فروغ دیا۔

میاں بشیر احمد نے ترکی میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کو فروغ دینے کیلئے جو کام کیا ہے۔ اس کو ہماری تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ "ہمایوں" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اتنی بڑی تعداد میں مضامین لکھ کر شائع کئے کہ اگر ان کو یک جا کیا جائے تو کئی کتابیں بن سکتی ہیں۔

اس عظیم علمی، ادبی اور سیاسی شخصیت کا انتقال ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو ہوا اور آپ کو ان کے خاندانی قبرستان میاں فیملی قبرستان نزد مسجد تالاب والی خواجہ ایاز سٹریٹ باغبانپورہ میں دفن کیا گیا۔

میر غلام بھیک نیرنگ

سید غلام بھیک نیرنگ کا اصلی وطن ضلع انبالہ کی تحصیل میں واقع موضع دورالہ تھا (جسے مہدی کا دورالہ کہا جاتا تھا۔) وہ ایک کھاتے پیتے سید گھرانے میں پیدا ہوئے ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۷۵ء ہے۔ ان کے بچپن کے کوئی ایسے اہم واقعات نظر نہیں آتے ہیں جس سے ان کے روشن اور درخشاں مستقبل کا پتہ چلتا ہو۔ وہ عام بچوں کی طرح پلے بڑھے اور عام انسانوں کی طرح ابتدائی تعلیم مکمل کی ان کی طبیعت میں شوخی کم اور سنجیدگی و متانت زیادہ تھی۔ اس کے باوجود وہ یاسیت اور قنوطیت کا پیکر نہ تھے۔ زندہ دلی ان کے چہرے سے ٹپکتی تھی ان کا سراپا دلکش شخصیت کا حامل تھا۔

میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ۱۸۹۵ء میں میں پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آکر مختلف وظائف حاصل کیے۔ ایف۔ اے اور بی اے کے امتحانات گورنمنٹ کالج لاہور سے امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ کالج کے زمانے میں علامہ اقبال، چوہدری جلال الدین، سر فضل حسین اور میاں عبدالعزیز فلک پیا ان کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ گریجویشن کرنے کے بعد نامساعد حالات کے باوجود نیرنگ نے عزم و حوصلے کے ساتھ تعلیمی سفر جاری رکھا اور ۱۸۹۹ء میں قانون کا امتحان لاہور سے پاس کرنے کے بعد انبالہ میں وکالت شروع کر دی اپنی قابلیت اور ذہانت کی بدولت وہ نوجوانی میں ہی سرکاری وکیل کے منصب پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک سرکاری وکیل رہے لیکن بعد میں یہ منصب چھوڑ کر پریکٹس شروع کر دی۔ اس عرصے کے دوران وہ ملت کی رہنمائی بھی کرتے رہے اور قومی خدمات کے فرائض بھی

سرانجام دیتے رہے۔ آپ مرکزی اسمبلی ہندوستان اور مجلس دستور ساز پاکستان کے بھی ممبر رہے۔

مشہور شاعر حضرت اکبر الہ آبادی بھی اس خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ اکبر اور نیرنگ کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ ایک ہی خاندان کے برگ و بار اور ایک ہی تسبیح کے دانے تھے۔

سید غلام بھیک نیرنگ ایک بلند پایہ ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔ شاعری میں نیرنگ کو فصیح الملک مرزا داغ دھلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ اور طالب علمی کے زمانے میں موزوں کلام ان کی زبان سے نکلنے لگا تھا۔ آپ کی نظموں کی زبان سادہ اور چست ہوتی تھی۔ ان دنوں لاہور میں بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں ہر ہفتے مختصر سی بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ نیرنگ بھی گاہے بگاہے اپنے ہم مذاق اور ہم سبق دوست اقبال کے ہمراہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں سر شیخ عبدالقادر نے جن دوستوں اور رفیقوں کی اعانت اور مشورے سے اپنا مشہور ادبی مجلہ مخزن جاری کیا ان میں سرفہرست نیرنگ کا نام نظر آتا ہے۔

مخزن کے اجراء کے ساتھ ہی نیرنگ کی شاعری ملک کے عام پڑھے لکھے طبقے سے روشناس ہوئی۔ نیرنگ نے نہ صرف نظمیں اور غزلیں مخزن کے لیے لکھیں بلکہ ان کے بہت سے نثری مضامین بھی مخزن کی زینت بنے۔ ۱۹۰۶ء میں شیخ عبدالقادر بیرسٹری کی تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے تو مخزن کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داریوں کا بوجھ سید بھیک نیرنگ کے کندھوں پر ڈال گئے۔ نیرنگ بھی شیخ عبدالقادر کی طرح ادب شناس اور جوہر شناس تھے۔ ۱۹۰۹ء میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں اور ادبی مضامین کا مجموعہ "خیالستان" کے نام سے شائع ہوا، کتاب کا نام "خیالستان" نیرنگ نے تجویز کیا تھا۔ اور اس کا دیباچہ بھی انہوں نے لکھا تھا۔

نیرنگ کو ادبی مشورے اور علمی سرگرمیوں سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ وہ ہمیشہ جہاں ادبی تعمیر کا ملبہ پاتے وہیں ایک دلفریب تاج محل تعمیر کر دیتے۔ نیرنگ

نے بحیثیت مدیر مخزن رسالے کی اشاعت میں غیر معمولی دلچسپی لی اور اس کی کامیابی کے لیے انتھک محنت کی۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ عبدالقادر انگلستان میں تھے اور یہاں رسالہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنا صحافتی سفر طے کر رہا تھا۔ مخزن میں سید غلام بھیک نیرنگ بطور ایک ادیب ایک شاعر ایک نقاد کے چھپتے رہے۔ ان کی ادبی کاوشیں ملک کے عام پڑھے لکھے طبقے میں پھیلیں اور اس طرح ان کا ایک ادبی وجود معاشرے میں پھیلتا گیا۔ آپ میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ آپ ادیبوں اور نئے لکھنے والوں کی تعریف دل کھول کر کرتے تھے اور ان کی نظروں میں نئے جہان معانی پیدا کرتے۔

نیرنگ ان چند شعراء میں سے ہیں۔ جنھوں نے شاعری کو نہ صرف فنی لحاظ سے عظمت و واقفیت بخشی بلکہ اپنے منفرد انداز سے مردہ روحوں میں زندگی کی ایک نئی روح ایک تازہ لہر پھونک دی۔ آپ بالغ النظر شاعر ہیں۔ علم کے لحاظ سے مشرق و مغرب کا دلفریب سنگم ہیں۔ لیکن روایت کا احترام کرتے ہیں۔ نیرنگ کا کلام قدماء کے رنگ تغزل میں اپنے اندر اپنے دور کے کئی افق لیے ہوئے تھے۔ روایت کا احترام ضرور سہی مگر انداز بیان جدا جدا ہے۔ نیرنگ کا کلام جدید و قدیم رنگ میں رنگا ہوا ہے گو کہ ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ اپنے دور کی جدید شاعری کی تمام خوبیوں کا حامل ہے۔ آپ کی نظموں کے مجموعے "کلام نیرنگ" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی نثری نگارشات دل اور دماغ پر یکساں اثر انداز ہوتی ہیں۔

نیرنگ نے صنف اردو افسانہ پر عمومی تنقید کی ہے۔ ان کی نثر کے سلسلے میں ان کے خطوط کو بھی بڑی اہمیت ہے۔ جس طرح غالب کے خطوط کو اپنے دور کے تہذیبی' سیاسی' سماجی' ادبی اور معاشرتی مسائل کا "تصویری خبرنامہ" سمجھتے ہیں اسی طرح نیرنگ کے خطوط ذاتی مسائل اور خانگی حالات کے علاوہ ان کے زمانے میں تحریکوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ نیرنگ کے مختصر مضامین اردو ادب اور زبان میں تنقید ادب کا سنگ بنیاد ہیں۔ انہوں نے بڑی خوبی اور سلاست سے ادب کے معیار قائم کئے ہیں گو ان کی نظم و نثر وقت کے تقاضوں

سے ہم آہنگ ہے۔

ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ نیرنگ کی قومی خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد ۱۹۳۸ء میں نیرنگ مرکزی مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر قرار پائے۔ نیرنگ نے قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا اور ان کے اعتماد اور بھروسے کو تقویت دی۔ ابتدا سے مسلم لیگ سے وابستہ تھے۔ انبالہ میں مسلم لیگ کی شاخ انہی کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ وہ سالہا سال تک ہندوستان کی مرکزی دستور ساز اسمبلی کے رکن رہے۔ آخری بار ۱۹۴۶ء مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انبالہ ڈویژن سے بھاری اکثریت سے مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ انہوں نے مرکزی اسمبلی میں ایک مسودہ قانون بھی پیش کیا۔ جسے عرف عام میں شریعت بل کہا جاتا ہے۔ اس بل کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں میں وراثت شرع اسلام کے اصولوں کے مطابق ہونی چاہیے۔ پاکستان میں جب مجلس دستور ساز کا قیام عمل میں آیا تو میر غلام بھیک نیرنگ اس کے بھی رکن تھے۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب فسادات کی قیامت صغریٰ برپا ہوئی تو اپنے متعلقین کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے۔ پاکستان میں انہوں نے ہر موقعہ پر اس نوزائیدہ مملکت کی ترقی و کامرانی کے لیے کام کیا۔ انہوں نے نوجوانوں میں سیرت و کردار کے جوہر نکھارے۔

اس جید شخصیت کا انتقال ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ہوا۔ آپ کی آخری آرامگاہ علاقہ بڑا مکان طاہر بندگی روڈ قبرستان میانی صاحب میں موجود ہے۔

محمد طفیل (نقوش)

محمد طفیل ۱۴ اگست ۱۹۲۳ء کو جوگی محلہ بازار حکیماں اندرون بھاٹی گیٹ لاہور میں پیدا ہوئے ان کے والد محترم میاں عمرالدین بھاٹی گیٹ میں میوہ فروش تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم ایم سی ہائی سکول نور محمد اندرون بھاٹی گیٹ میں حاصل کی۔ پرائمری کے بعد اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ کے بھی طالب علم رہے لیکن والد کی بیماری اور گھریلو اخراجات میں اضافے کے سبب تعلیم کو ادھورا چھوڑنا پڑا۔ حالات کے پیش نظر اس وقت کے مشہور خوش نویس تاج الدین زریں رقم کے شاگرد ہو گئے اور محنت اور لگن کی وجہ سے بہت جلد اس قابل ہو گئے کہ کتابت کے ذریعے کچھ رقم کما سکیں۔ محمد طفیل کتابت بہت عمدہ کرتے تھے۔ ان کے کام میں اغلاط نہ ہونے کے برابر ہوتی تھیں۔ ان کے استاد محترم تاج الدین زریں رقم ان کی محنت سے بہت متاثر تھے۔

محمد طفیل کی شادی ان کی ماموں زاد سے ۳۱ اگست ۱۹۴۰ء میں ہوئی۔ ان سے صاحبزادگان فاروق احمد، جاوید طفیل، پرویز احمد اور اخلاق احمد ہیں جو آج کل ادارہ فروغ اردو اور نقوش کی ادارت و اشاعت کا کام مل جل کر سرانجام دے رہے ہیں۔

محمد طفیل نے ۱۹۳۸ء میں لطیف فاروقی کے اشتراک سے مکتبہ شعر و ادب کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ ۱۹۴۴ء میں ادارہ فروغ اردو کے نام سے۔ یک شخصی فرم کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک نئے ادارے "الناشر لمیٹڈ" کی بنیاد رکھی۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت ان کے ایک ہندو دوست نے اپنی

کتابوں کی دکان جو لاہور میں تھی محمد طفیل کے حوالے کر دی آج کل ادارہ فروغ اردو اسی دوکان میں قائم ہے۔ ۱۹۴۸ء میں لاہور سے رسالہ "نقوش" کا اجراء کیا۔ ادارت احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کے ذمے تھی اور محمد طفیل رسالے کے پبلشر تھے۔ یکم مئی ۱۹۵۱ء سے محمد طفیل نے ادارت کے فرائض خود انجام دینا شروع کر دیئے اور جہد مسلسل و عمل پیہم کے سبب نقوش کو ادب کے اعلیٰ ترین معیار سے ہمکنار کر دیا کہ آج تک پاکستان اور ہندوستان میں اس پایہ کا ادبی رسالہ نہیں۔ "نقوش" سے محمد طفیل کی وابستگی کی وجہ سے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے انہیں "محمد نقوش" کا نام دیا۔

محمد طفیل تمام عمر ادب کے ادنیٰ اور سچے طالب علم رہے۔ انہوں نے کبھی تبحر علمی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا اور نہ بے جا تعلی سے کام لیکر دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

انہیں ادیبوں اور شاعروں سے والہانہ لگاؤ تھا اور پھر ان دانشوروں کو جن میں خداداد صلاحیتیں ہوتی تھیں بڑی فراخدلی سے ادبی سطح پر متعارف کراتے تھے۔

محمد طفیل نے جدید خاکہ نگاری میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ انہوں نے اردو خاکہ نگاری میں ادب کی بے نظیر خدمت سرانجام دی۔ ان کی خاکہ نگاری کے بارے میں مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں کہ "ان کے شخصی مضامین کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اردو میں اس نوع کی ادبی تحریریں پہلے نہیں تھیں۔ مگر اب تک کسی نے اس اہتمام اور درد کے ساتھ اسے اپنا فن نہیں بنایا تھا اور یہی بات ہمیں محمد طفیل کے خاکوں کا مطالعہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔" انکے خاکے ایک عہد کی زندہ تاریخ ہیں۔ انہوں نے کم و بیش تمام علمی و ادبی شخصیات کی خوبصورت تصویریں کھینچی ہیں۔ ان کی خاکوں کی کتابوں آپ، صاحب، محترم، مکرم، معظم وغیرہ میں منٹو، احمد ندیم قاسمی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، مولوی عبدالحق، پطرس بخاری، قدرت اللہ شہاب، حفیظ ہوشیارپوری، انتظار حسین، اختر شیرانی، مصطفیٰ زیدی، حفیظ

جالندھری وغیرہ کے خاکے موجود ہیں۔ انہوں نے فن خاکہ نگاری کو درجہ کمال تک پہنچایا اور اس صنف میں نمایاں مقام حاصل کیا۔

انہوں نے نقوش کے ذریعے اردو ادب کے فن پاروں کو نہ صرف صفحہ قرطاس پر محفوظ کر لیا بلکہ اس طرح اردو کے فروغ میں معاونت بھی کرتے رہے۔ نقوش کے چند خاص شمارے مندرجہ ذیل ہیں: افسانہ نمبر' غزل نمبر' شخصیات نمبر' مکاتیب نمبر' پطرس بخاری نمبر' طنز و مزاح نمبر' ادب عالیہ نمبر' آپ بیتی نمبر' خطوط نمبر (تین جلدیں)' غالب نمبر (تین جلدیں) اقبال نمبر' عصری ادب نمبر' میر تقی میر نمبر' ادبی معرکے نمبر' رسولؐ نمبر تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ رسولؐ نمبر کی تیرہ جلدیں ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک منظر عام پر آئیں۔ رسولؐ نمبر کی تکمیل کے بعد ان کی تحریر کے مطابق انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد پا لیا تھا۔ خود لکھتے ہیں کہ

"میں نے جتنا کام کرنا تھا جو کچھ کرنا تھا وہ سب کچھ کر لیا۔ اب مجھے کچھ نہیں کرنا۔ اب مجھ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ کام کی ایک حد ہوتی ہے انسانی توفیق اتنی ہی ہو سکتی تھی"

جولائی ۱۹۸۶ء میں کسی کام سے پشاور جانے کا قصد کیا اور راستے میں اختر جمال کے گھر واقع اسلام آباد میں ۵ جولائی ۱۹۸۶ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے راہی ملک عدم ہو گئے۔ علم و دانش کا یہ خزینہ قبرستان میانی صاحب احاطہ گاڑیاں نزد دربار حاجی مولا بخش بہاولپور روڈ میں دفن ہے۔ آپ کی قبر کے ساتھ آپ کے والد میاں عمرالدین وفات یکم فروری ۱۹۴۳ء اور والدہ صاحبہ بھی محو آرام ہیں۔

maablib.org

محمد حسین آزاد

آزاد دلی کے ایک مشہور اور مستند خانوادۂ علم و فضل سے تعلق رکھتے تھے۔ عام طور پر یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک ایرانی عالم مولانا محمد شکوہ جن کا سلسلہ نسب حضرت سلمان فارسی سے ملتا تھا عہد شاہ عالم میں ہمدان سے ہجرت کر کے دلی آ بسے۔ مولانا محمد شکوہ علوم متداولہ میں دستگاہ کامل رکھتے تھے اور علوم مذہبی کی اسناد بھی ان کے پاس تھیں۔ مولانا محمد شکوہ نے اپنے فرزند محمد اشرف کو علوم دین کی تعلیم خود دی اور ان کے انتقال کے بعد مولانا محمد اشرف ہی ان کے جانشین ہوئے۔ مولانا محمد اشرف کی شادی ایران میں ہوئی۔ انہوں نے اپنے فرزند محمد اکبر کی شادی بھی ایران ہی میں کی۔ مولانا محمد اکبر بھی عالم اور مجتہد تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ درست اردو نہ بول پاتے تھے لیکن ان کے فرزند مولوی محمد باقر نے شمالی ہند میں اردو اخبار نویسی کو بام عروج پر پہنچایا اور پھر مولوی باقر کے فرزند ارجمند مولوی محمد حسین آزاد نے اردو ادب میں جو پھول کھلائے ان کی مہک آج بھی قائم ہے۔

محمد حسین آزاد ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۴۵ھ بمطابق ۱۰ جون ۱۸۳۰ء کو پیدا ہوئے۔ مکتبی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آزاد دہلی کالج میں داخل ہو گئے۔ دہلی کالج اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ وہاں قدیم و جدید کی تعلیمی آمیزش موجود تھی۔ آزاد دہلی کالج میں نمایاں اور ممتاز رہے۔ آزاد کو بچپن ہی سے مطالعے کا شوق تھا اور ان کا مطالعہ محض نصاب تک محدود نہ تھا بلکہ وہ ہر قسم کی کتب، اخبار و رسائل پڑھتے تھے۔ کالج میں آزاد کو ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور خواجہ ضیاء الدین جیسے ہم جماعتوں سے واسطہ پڑا جو ماپنی تیزی اور

براقی طبع کے سبب مشہور تھے۔ منشی ذکاء اللہ سے ان کے تعلقات تاحیات رہے۔ آزاد کو ایک طرف ذہین ہم جماعتوں کی محبت ملی اور دوسری طرف فاضل اساتذہ کی شفقت میسر آئی۔ ان دونوں عناصر نے آزاد کے ذہن کو پوری طرح بیدار کر دیا۔ دہلی کالج کے ساتھ ساتھ آزاد کو استاد ابراہیم ذوق کا سایہ عاطفت بھی مل گیا۔ اس سلسلے میں وہ اپنے تمام ہم جماعتوں میں منفرد اور ممتاز نظر آتے ہیں۔ دیوان ذوق میں آزاد نے متعدد ایسے واقعات لکھتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ استاد ذوق ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آزاد اکثر شام کے وقت استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوتے اور تعطیل کے روز سارا دن ان کے ساتھ گزارتے۔ پندرہ برس کی عمر میں آزاد استاد ذوق کے ساتھ دلی کے مشاعروں میں بھی جانے لگے اور اس طرح انہیں ہوش سنبھالتے ہی دلی کی بزم سخن تک رسائی حاصل ہو گئی۔

استاد ذوق کے انتقال کے بعد آزاد جہاں آباد کے ایک اور خوش گو شاعر حکیم آغا جان عیش کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے استفادہ کرتے رہے۔

کالج کی تعلیم سے فراغت کے بعد وہ دہلی اردو اخبار سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کی نثری تحریریں اور شاعری مختلف اخبارات و جرائد میں شائع ہونے لگی۔ آزاد کی عمر کم و بیش ۲۷ سال کی تھی کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے ایک ایسا شعلہ بھڑکا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۱ مئی کو دلی میں بھی ہنگامے شروع ہو گئے۔ آزاد دلی سے نکل کر لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ لکھنؤ میں اب بھی پرچم حریت لہرا رہا تھا اور دلی کے باکمالوں کو اپنے دامن عافیت و قدر شناسی میں پناہ دینے کی مستحسن روایت بھی لکھنؤ میں موجود تھی۔ میر، سودا، مصحفی اور انشاء اللہ خاں انشاء جیسے استادان فن نے لکھنؤ ہی کو اپنا ملجا و ماویٰ بنایا تھا۔ آزاد کو بھی لکھنؤ کی آغوش میں پناہ ملی۔ آزاد تقریباً دس سال بعد لکھنؤ سے لاہور آ گئے اور یہاں آ کر گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ وہ کالج میں عربی پڑھاتے تھے اس دوران انہوں

نے متعدد تعلیمی تصانیف تخلیق کیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے ان دنوں جی۔ ڈبلیو لائٹنر پرنسپل تھے۔ ان کی رفاقت اور حوصلہ افزائی نے آزاد کے حوصلے بلند کر دیئے اور وہ نئے عزائم کے ساتھ کارزار حیات میں صف بستہ ہو گئے۔ ادھر لائٹنر نے ادبی فضا کی سازگاری کو دیکھتے ہوئے "انجمن پنجاب" کی بنا ڈال دی۔ آزاد اس انجمن کے سرگرم رکن رہے اور اس انجمن کے ذریعے اپنی خداداد صلاحیتوں کو باذوق افراد کے سامنے پیش کیا۔

آزاد کالج میں انجمن کے جلسوں میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھا رہے تھے کہ اچانک ذوق سیاحت کی تکمیل کا ایک نادر موقع ہاتھ آگیا اور وہ ایران، افغانستان، ترکستان اور وسطی ایشیاء کے سفر پر روانہ ہو گئے آزاد مختلف ملکوں کے سفر سے واپس آکر دوبارہ ملازمت پر آ گئے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

۱۸۸۵ء میں ان کی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی شخصیت میں پہلے سے موجود معمولی دیوانگی نے جنون کی شکل اختیار کر لی۔ بے خوابی کا شکار ہو گئے۔ آزاد عالم جنون میں لاہور سے دلی اور پھر لکھنؤ پیدل گئے اور سرسید احمد خان سے ملاقات کی۔ آزاد کی زندگی کے آخری بیس سال اسی مجبوری اور بے چارگی میں گزرے۔ عالمی ادب میں اس قسم کی مثالیں کم یاب ہیں کہ عالم جنون میں کسی ادیب نے تصانیف تخلیق کی ہوں لیکن آزاد نے اس دور میں بھی ایسی کتاب تحریر کیں جو اپنے موضوع اپنی نوعیت اور بوقلمونی کی وجہ سے ہمیشہ دلچسپی کا باعث رہی ہیں۔

آزاد کی نثری اور شعری تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ آب حیات
۲۔ نیرنگ خیال
۳۔ نگارستان فارس
۴۔ دربار اکبری

۵۔ ڈرامہ اکبر
۶۔ اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب
۷۔ قصص ہند
۸۔ جامع القواعد
۹۔ آئینہ صحت
۱۰۔ نصیحت کا کرن پھول
۱۱۔ فارسی قواعد
۱۲۔ اردو قواعد
۱۳۔ قند پارسی
۱۴۔ آموز گار پارسی
۱۵۔ کائنات عرب
۱۶۔ تذکرہ علماء
۱۷۔ مکاتیب آزاد
۱۸۔ شہزادہ ابراہیم کی کہانی
۱۹۔ نعت آزاد
۲۰۔ سیر ایران
۲۱۔ مکتوبات آزاد
۲۲۔ مکاشفات آزاد
۲۳۔ سیاک و نمک
۲۴۔ فلسفہ الہیات
۲۵۔ جانور ستان
۲۶۔ فارسی کی پہلی، دوسری کتاب
۲۷۔ بیاض آزاد
۲۸۔ دیوان ذوق
۲۹۔ نظم آزاد

۳۰۔ خم کدہ آزاد

ان کے علاوہ بے شمار غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔

آزاد کی ادبی شخصیت بڑی پہلودار ہے۔ اگرچہ ان کی شخصیت کا دار و مدار انشاء پردازی پر ہے لیکن وہ اردو کے اولین محقق' ادبی' مورخ' نقاد' ڈرامہ نویس' لسانی مفکر' تعلیمی مصنف اور جدید اردو شاعری کے اولین معمار بھی ہیں۔ ان کی شخصیت کے یہ تمام پہلو بہت اہم ہیں لیکن انشاء پردازی ان سب پر غالب آگئی ہے۔

آزاد اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز ہیں۔ ان کا اسلوب اور زبان اردو ادب میں منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ آزاد نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ اردو نثر کا پرتکلف دور تھا۔ میرامن کی "باغ و بہار" وجود میں آچکی تھی لیکن ارباب علم ظہوری اور بیدل کے اتباع پر فخر کرتے تھے۔ آزاد ایک طرف اس رجحان سے متاثر ہوئے اور دوسری طرف انہوں نے دہلی اردو اخبار کی سادگی اور دلی کالج کی سلیس نثر سے بھی استفادہ کیا۔ آزاد نے ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش کی۔ سادگی اور سلاست کی فضا میں پرورش پانے کے باوجود وہ ابوالفضل' ظہوری' بیدل اور نعمت خاں عالی سے بھی بہت متاثر تھے۔ ظہوری کی نازک خیالی نے انہیں خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کے ساتھ انہیں فارسی زبان و ادب سے بھی والہانہ محبت تھی۔ آزاد نے اپنے اسلوب کے ذریعے قدیم انداز اور طرز جدید میں مفاہمت پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ نہ پورے طور پر جدید انداز کے ہیرو ہیں اور نہ لکیر کے فقیر۔ انہوں نے دونوں کے حسن کو یکجا کیا ہے۔ ذہنی اعتبار سے وہ ماضی پرست تھے لیکن ماحول کے تقاضوں سے مجبور ہو کر انہوں نے طرح نو کا راگ الاپا۔ ذہن اور ماحول کی اس متضاد کشمکش نے ان کے اسلوب میں ایک خاص طرح کی توانائی پیدا کی ہے۔

آزاد کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان کی شخصیت کا مکمل اور بھرپور اظہار ہے۔ آزاد اپنی ہر تحریر میں سانس لیتے' چلتے

پھرتے اور باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ آزاد خیال اور جذباتی انسان تھے۔ طرز نو کے مبلغ ہوتے ہوئے بھی وہ ذہنی طور پر ماضی کے باشندے تھے۔ انہیں ماضی اور اس کی ہر چیز سے عشق تھا۔ ان کی دنیا خیالی دنیا تھی۔ وہ اپنے ذہن کی تراشی ہوئی دنیا میں مگن تھے۔ ان کی شخصیت میں نرمی، دھیما پن اور وقار تھا۔ کم و بیش یہی کیفیت ان کے اسلوب میں بھی پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب بھی خیالی اور جذباتی ہے۔ آزاد کی فطرت میں جرات رندانہ بالکل نہ تھی۔ وہ کھل کر طنز و تعریض نہیں کرتے بلکہ اس کیلئے لطیف پیرایہ اظہار تلاش کرتے ہیں۔ آزاد کا اسلوب ان کی شخصیت کا مکمل ترجمان ہے۔ آزاد کا اسلوب اور شخصیت دونوں ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔

آزاد اپنی مصوری کے ذریعے جذبات و احساسات کو جیتا جاگتا روپ عطا کرتے ہیں انہیں تجسیم و تشخص کا بڑا شوق تھا اور اس میں انہیں ملکہ بھی حاصل تھا۔ آزاد کا ذخیرہ الفاظ بڑا وسیع تھا۔ ذخیرہ الفاظ کے سلسلے میں اردو ادب کا کوئی انشاء پرداز ان کے مقابلے پر نہیں آتا۔ ان کی انشاء پردازی میں بہتے ہوئے دریا کی روانی اور شعلے کی سی لپک ہے۔ آزاد کی زبان میں کلاسیکی رچاؤ اور تہذیبی شعور ہے۔ لسانی مفکر ہونے کی وجہ سے انہیں اردو زبان کے ارتقاء کا صحیح اندازہ تھا۔ وہ اردو کو اس کے سرچشمے سے دور نہیں کرنا چاہتے تھے اس بناء پر انہوں نے بڑی پاکیزہ اور خوبصورت زبان استعمال کی ہے۔ ان کی تحریریں پڑھنے والے کو مکمل طور پر اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہیں۔ اردو ادب ان کے لفظوں کے باغات سے ہمیشہ مہکتا رہے گا۔

اردو ادب کی یہ عظیم ہستی ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو قید جنون سے آزاد ہو کر ملک عدم کے سفر پر روانہ ہوئی۔ آپ کا مدفن احاطہ کربلا گامے شاہ میں واقع ہے۔

ایم۔ ڈی۔ تاثیر

محمد دین تاثیر ۱۹۰۲ء میں قصبہ اجنالہ ضلع امرتسر کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے اپنی پیدائش کے صرف دو سال بعد ۱۹۰۴ء کی وبائے طاعون کے سبب والد اور والدہ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ اس کم سن یتیم کی پرورش کی ذمہ داری تاثیر کی خالہ اور خالو میاں نظام الدین رئیس لاہور نے اپنے ذمہ لی۔ قدرت نے جس گھرانے کا انتخاب تاثیر کی پرورش کیلئے کیا وہ بڑا قابل رشک تھا۔ میاں نظام الدین بڑے اعلیٰ پائے کے بزرگ تھے۔ تدبر اور نیکی ان کی طبیعت کا جزو تھی۔ وہ عربی اور فارسی کے فاضل تھے اور عبادت گزار انسان تھے ان تمام اوصاف کو میاں نظام الدین نے نوعمر محمد دین کی شخصیت کا جزو بنانے کیلئے بھرپور کردار ادا کیا اور آپ کی ابتدائی عمر قرآن پاک کے مطالعے اور نمازوں کی ادائیگی میں گزری تاثیر نے پہلی جماعت سے میٹرک تک اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ سے تعلیم حاصل کی۔ اس سکول میں ان کے خالہ زاد بھائی معروف ناول نگار ایم۔ اسلم بھی ان کے ساتھ پڑھتے تھے بچپن میں سے تاثیر انتہائی ذہین اور زیرک تھے۔ ان کے ساتھ بحث میں کامیاب ہونا ناممکن تھا۔ ان کے ساتھی طالب علم ان کی باتوں کے ذریعے لاجواب کر دینے والی صلاحیت سے بہت مرعوب رہتے تھے۔

اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایف۔ سی کالج میں داخل ہوئے اور وہیں سے ایم۔ اے تک تعلیم مکمل کی۔ ایم۔ اے انگریزی کا امتحان ۱۹۲۶ء میں پاس کیا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد لاء کالج میں داخلہ لیا مگر یہ صورت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور تعلیم چھوڑ

کر اسلامیہ کالج میں معلم کے طور پر ملازمت کا آغاز کیا۔ تھوڑے عرصہ بعد اسلامیہ کالج کی ملازمت سے الگ ہو کر چوہدری محمد حسین کے محکمہ پریس برانچ میں علامہ اقبال کے توسط سے ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۲۸ء میں یہ ملازمت چھوڑ کر دوبارہ اسلامیہ کالج میں تدریس کا آغاز کر دیا۔ ۱۹۳۴ء کے اواخر میں انگلستان چلے گئے۔ ۱۹۳۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر کے وطن واپس آئے۔ اسی سال آپ کی شادی ایک انگریز بلقیس نامی خاتون سے ہو گئی (بلقیس شادی سے پہلے مسلمان ہو گئیں تھیں) تاثیر اور فیض احمد فیض ہم زلف تھے۔ ۱۹۳۶ء ہی میں ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر میں پرنسپل ہو گئے۔ تین سال تک اس درسگاہ سے ان کا تعلق قائم رہا۔ ۱۹۴۰ء میں سری پرتاپ کالج سری نگر (مقبوضہ کشمیر) کے پرنسپل مقرر ہو گئے۔ جنگ عظیم دوم کے زمانے میں بتعلیمی زندگی سے الگ ہو کر حکومت ہند کی ملازمت اختیار کی اور ۱۹۴۷ء تک مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۴۷ء میں اس ملازمت سے الگ ہو کر سری نگر چلے گئے۔ وہاں سے کچھ عرصہ بعد پاکستان آ گئے اور آزاد کشمیر کے محکمہ نشرواشاعت میں ملازمت اختیار کر لی۔ پاکستان آنے کے بعد تاثیر کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔ پاکستان میں جہاں ہر شخص بدلی ہوئی زندگی کے مطابق اپنے آپ کو خاص حالات میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا' وہاں تاثیر کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں بھی بڑا تغیر پیدا ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے اور زندگی کے آخری دن تک اسی ادارہ سے وابستہ رہے۔

تاثیر اردو قبیلہ کے ان نابغوں میں سے ہیں جنہوں نے ادب کی خدمت کو مقصد حیات بنائے رکھا۔ انہوں نے اردو کو ترقی کیلئے "بزم فروغ اردو" کی بنیاد ڈالی اور اس کی ترقی کیلئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ تاثیر نے ادیب کے طور پر نثر اور نظم کے دونوں میدانوں میں اپنی کامیابی اور برتری ثابت کی۔

تاثیر نے اپنی غزلوں میں زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے دور حاضر کو موضوع بنایا۔ کلاسیکی انداز اپنانے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ جدت

طرازی مواد اور اسلوب دونوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی شاعری میں ایک نیاپن ہے جو پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مثلاً"

غیر کے خط میں مجھے ان کے پیام آتے ہیں
کوئی مانے کہ نہ مانے مرے نام آتے ہیں
داور حشر میرا نامہ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

تاثیر کی شاعری میں رومانویت اور ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے شعری نظریات کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ان کا طبعی میلان نظم کی طرف زیادہ تھا۔ نظموں کے مقابلے میں ان کی غزلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ انہوں نے جتنی نظمیں کہیں ان میں جدت کسی نہ کسی زاویے سے اپنے آپ کو ضرور نمایاں کرتی ہے۔

ترقی پسند شاعر کے طور پر تاثیر نے عوام کی زندگی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں سرمایہ داری کے خلاف صف آراء ہونے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ معاشرے کو سرمایہ داری کی لعنتوں سے پاک کر دینے کے خواہاں ہیں۔ ان کے خیال میں فرقہ پرستی، نسلی جھگڑے اور غربت و افلاس سرمایہ داری ہی کے پروردہ ہیں۔ تاثیر کی امیدیں مزدور اور کسان سے وابستہ ہیں۔ وہ ان کے پرامید مستقبل کی پیشگوئی کرتے ہیں۔ وہ اخوت، آزادی اور مساوات کے قائل ہیں۔

تاثیر بحیثیت شاعر اور نقاد زیادہ مشہور ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے علمی مضامین، خطوط اور ایک ناول بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

تاثیر کا ناول "کنول" ایک ایسی جاندار تخلیق ہے جو اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ اس ناول میں تاثیر نے اعلیٰ طبقوں کی ہوٹلوں اور کلبوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے اور اس سے پیدا شدہ اختلاط کے برے نتائج دکھائے ہیں۔

تاثیر کے خطوط کا مجموعہ بھی چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ یہ خطوط

انہوں نے اپنے شاگرد محمود نظامی کے نام لکھے تھے جنہیں ان کی وفات کے بعد شائع کیا گیا۔ ان خطوط نے غالب اور ابوالکلام آزاد کے خطوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ان خطوط میں بے تکلفی، بے ساختگی، عالمانہ و فاضلانہ بحثیں اور جزئیات نگاری جیسے عناصر موجود ہیں جو ان کو ادبی خطوط میں ممتاز مقام و مرتبہ عطا کرنے کا سبب ہیں۔

نقاد کے طور پر تاثیر کا مقام بہت اہم ہے۔ ان کی تنقید نگاری، ادبی تنقید اور علمی تنقید پر مشتمل ہے۔ تاثیر کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معاشرتی دبستان تنقید سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ دبستان تنقید معاشرے کے ساتھ ادب کے رشتے کی وضاحت کرتا ہے۔

تاثیر نے جس زمانے میں تنقید نگاری کی ابتدا کی اس وقت تک اردو تنقید میں بہت سا سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔ نظریاتی اور عملی تنقید پر مربوط کتابوں کی تو یقیناً کمی تھی مگر تنقیدی مضامین کے مجموعے شائع ہونے لگے تھے۔ تاثیر نے بھی کوئی مربوط کتاب لکھنے کے بجائے مختلف مضامین تحریر کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ ان کے ہاں نظریاتی اور عملی تنقید کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ آزاد اور شبلی، نذیر احمد "اقبال کا نظریہ" اور "داغ" ایسے مضامین ہیں جن میں تاثیر نے شعرا اور ادباء کی فنی تخلیقات کا جائزہ بھی لیا ہے اور ان کے بارے میں تنقیدی آراء بھی پیش کی ہیں۔ تاثیر کی تنقید کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی گرفت سخت ہے بات دوٹوک کرتے ہیں اور رائے قطعی دیتے ہیں۔

ادبی تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے علمی مضامین تاثیر کی دقت نظر، وسعت، علمی دستگاہ اور فنی بصیرت کے شاہد ہیں۔ ادب سے لے کر آرٹ تک، موسیقی سے لے کر مصوری تک ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ "نثر تاثیر" میں شامل ان کے علمی مضامین "دی سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" اردو رسم خط کی بحث، "مغل اور ہندوستان" اور "مصوری" وغیرہ اہم ہیں۔

دی سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام مولوی عبدالحق نے ترجمہ کی تھی لیکن مولوی عبدالحق اور ان کے معاونین

انگریزی کے ماہر نہیں تھے جس کے سبب اس لغت میں بعض الفاظ کا درست مفہوم متعین نہیں ہو سکا تھا۔ تاثیر نے ان خامیوں کی نشاندہی اور درستگی کیلئے جس طریقے سے اس تصنیف کا جائزہ لیا وہ قابل تحسین ہے۔ علمی مضامین میں اسلوب عام طور پر خشک ہوتا ہے لیکن تاثیر کی طبعی شوخی اور شگفتگی مضمون کو پرلطف بنا دیتی ہے۔

تاثیر کی تصانیف درج ذیل ہیں:

۱۔ آتش کدہ (شاعری) ۲۔ تاثیر کے خطوط (مرتبہ محمود نظامی) ۳۔ نثر تاثیر (مرتبہ فیض احمد) ۴۔ مقالات تاثیر

اس عظیم علمی و ادبی شخصیت کا انتقال۔ ۲ نومبر ۱۹۵۰ء کو لاہور میں ہوا اور قبرستان میانی صاحب میں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر اپنی شاعری، تنقید اور علمی مضامین کی شگفتگی اور تاثیر کے سبب ہمیشہ ہمارے ساتھ موجود رہیں گے۔

ایم اسلم

ایم اسلم کا پورا نام میاں محمد اسلم تھا۔ آپ ۶ اگست ۱۸۸۳ء کو لاہور کے معزز کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میاں نظام الدین تھا جن کا شمار لاہور کے روساء میں ہوتا تھا۔ آبائی مکان بارود خانہ اندرون شہر لاہور ہے۔ میاں امیرالدین صاحب ایم اسلم کے چچازاد بھائی تھے۔ ابتدائی تعلیم لنگے منڈی کے پرائمری سکول اور اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ سے حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ اس زمانہ میں علامہ اقبال گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور فلسفے کے پروفیسر تھے۔ ایم اسلم نے اپنے ادبی لگاؤ کی وجہ سے جلد ہی امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ آپ روزانہ حضرت علامہ اقبال کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوتے کیونکہ اس وقت علامہ اقبال کی رہائش گاہ بازار حکیماں ایم اسلم کے گھر کے راستے میں پڑتی تھی۔ ان کے ادبی ذوق کو نکھارنے میں علامہ اقبال کا خاص حصہ ہے۔ علامہ اقبال کی ہدایت پر نثر نگاری کی طرف توجہ رکھی اور ابتداء افسانہ نگاری سے کی۔ ان کے افسانے رسالہ "مخزن" اور "زمانہ" میں شائع ہونے لگے۔ ۱۹۱۰ء میں لائل پور (فیصل آباد) میں ایگریکلچرل کالج قائم ہوا تو گورنمنٹ کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اس کے اولین طلبہ میں شامل ہو گئے۔ وہاں کی تعلیم سے فارغ ہو کر محکمہ انہار میں ضلع دار مقرر ہو گئے۔ لیکن یہاں ایم اسلم جیسے باکردار آدمی سے اس بدنام زمانہ محکمہ کی ملازمت نہ نبھ سکی اور انہوں نے یہ ملازمت چھوڑ دی اور اپنی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مرکوز کر لی۔ اسی زمانے میں مشہور امریکی ادیب مارک ٹوئین کے ایک انشائیے کا اردو

ترجمہ "مرزا مینڈکی" کے نام سے کیا۔ پھر مزاحیہ انداز میں کئی مضامین لکھے جسے انہوں نے "مرزا جی" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا۔

ایم اسلم کی شادی ملازمت چھوڑنے کے بعد ہوئی۔ بیوی کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ لیکن اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ انہوں نے اپنی بھتیجی اصغری کو گود لیا تھا لیکن وہ چھ سال کی عمر میں نہایت مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی۔ اس کی جدائی نے ایم اسلم کے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ ایم اسلم کو پرندے پالنے کا شوق تھا۔ شکار کے بھی شوقین تھے۔ ہرن' مرغابی اور تیتر کا شکار پسند کرتے۔ مچھلی کے شکار سے بھی دل بہلاتے۔ دریا میں کشتی رانی کا بھی شوق تھا اور اپنی کشتی رکھتے تھے۔ شکار کے شوق کی وجہ سے انہیں دیہاتی زندگی کا قریب سے مطالعہ کا خوب موقع ملا۔ شعر و ادب اور شکار کے بعد تیسرا شوق موسیقی کا تھا۔ ہلکی پھلکی موسیقی کے گراموفون کے سینکڑوں ریکارڈ جمع کر رکھے تھے۔ سگریٹ' پان اور حقے سے بیزار رہتے۔ چائے سے بھی کوئی رغبت نہ تھی۔ ایم اسلم کا لباس سب سے منفرد ہوتا تھا۔ شلوار قمیض پہنتے اور ساتھ ہی شاندار ٹائی لگاتے اور ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ نماز پنج گانہ کے سختی سے پابند تھے۔ پورے روزے رکھتے۔ صبح کو روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے۔ بہت مہمان نواز تھے۔ ہر اتوار کو اور بعد میں ہر جمعہ کے دن دوست احباب کا مجمع رہتا اور گھنٹوں محفل جمی رہتی۔ ۱۹۶۸ء میں اپنی دوسری اہلیہ کی وفات کے بعد بہت اداس اور ملول رہنے لگے تھے اور حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور یہ فرض بھی پورا کیا۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا انعقاد ہوا جس نے مغربی اثرات و رجحانات اردو ادب میں رائج کرنے پر زور دیا۔ ایم اسلم ترقی پسند تحریک کے خلاف تھے۔ چنانچہ ان کی تخلیقات کی طرف توجہ بہت کم ہوئی اور نقادوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں اسلامی تہذیب و تمدن کے زندہ مرقعے کھینچے جاتے ہیں اور ہر افسانے میں ایک اخلاقی سبق ضرور ملتا ہے۔ ایم اسلم کی تحریروں کا سرچشمہ اسلامی احساس ہے۔ انہیں

نقادوں کی بیجا تنقید اور ادبی دنیا میں نظر انداز کئے جانے کا شدید احساس تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب کی ساٹھ ستر سال خدمت کرنے کے بعد اس صورت حال سے بددل ہونا ایک قدرتی امر تھا۔

ایم اسلم کے افسانوں کے اہم مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تفسیر حیات۔ یہ چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے انعام یافتہ ہے۔

۲۔ کارزار حیات۔

۳۔ قاتل۔ اس میں سات افسانے شامل ہیں۔

۴۔ خار و گل۔ ۱۶ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

۵۔ پیغام سروش

۶۔ راوی کے رومان۔ بار کے علاقے کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔

۷۔ خون مسلم۔ تقسیم ہند کے فسادات کے پس منظر میں افسانوی مجموعہ۔

۸۔ مزاحیہ تخلیقات "مرزا جی" "لاجواب الو" ٹھونگے اور نمستے علیکم بہت مقبول ہوئیں۔

۹۔ تگ و تاز۔ ان کی یہ آخری تصنیف ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی

ایم اسلم کے چند اہم ناول مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) زوال الحمراء (۲) رقص زندگی (۳) مرزا جی (۴) گناہ کی راتیں (۵) رقص بسمل (۶) شمسہ (۷) جہنم (۸) حسن سوگوار (۹) ثمر گناہ (۱۰) خار و گل (۱۱) شام غریباں

زندگی کے آخری تین چار برسوں میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا کیونکہ حافظہ جواب دے گیا تھا۔ ایم اسلم نے سو سال کی طویل عمر پائی اور ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء کو لاہور میں انتقال کیا اور قبرستان میانی صاحب میں آسودۂ خاک ہوئے۔

مولانا صلاح الدین احمد

مولانا صلاح الدین احمد ۲۵ مارچ ۱۹۰۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی احمد بخش تھا اور وہ ایچی سن کالج میں عربی' فارسی کے استاد تھے۔ آپ راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ قرآنی تعلیم اونچی مسجد اندرون بھاٹی دروازہ سے حاصل کی اور ۱۹۰۷ء کے لگ بھگ سرکاری مدرسے میں داخل ہوئے۔ چوتھی جماعت میں اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں اسی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ بی۔ اے کا امتحان گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۲۲ء میں پاس کیا۔

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز دس برس کی عمر سے ہوا۔ اس دور میں وہ ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے شیدا تھے۔ ایف اے کے زمانے میں رابندر ناتھ ٹیگور اور شیکسپیئر کے نہ صرف مداح تھے بلکہ ان کے مضامین اردو زبان میں ڈھالنے شروع کر دیئے تھے اور ان پر مقالے بھی لکھے۔ اس دور میں "ثناء" کے تخلص سے شاعری بھی کرتے تھے۔ گریجوایشن کے دوران آپ نے ادبی رسالہ "خیالستان" جاری کیا اور اس کو ایک سال تک شائع کرتے رہے۔ مختلف وجوہ کی بناء پر یہ رسالہ بند ہو گیا اور آپ گریجوایشن مکمل کر کے محکمہ پولیس میں ڈی۔ ایس۔ پی کے عہدے پر بھرتی ہو گئے۔ مگر صرف چھ ماہ بعد انگریز سرکار کی مسلمان دشمنی کے سبب اس نوکری سے احتجاجاً مستعفی ہو گئے۔ اس ملازمت کو خیرباد کہنے کے بعد آپ دوبارہ ادبی زندگی کی طرف لوٹ آئے اور آئندہ تمام عمر ادب کی خدمت میں گزاری۔ پولیس کی ملازمت سے مستعفی

ہو کر آپ نے اپنے بچپن کے دوست منصور احمد کے ساتھ مل کر "اسلامک لٹریچر کمپنی" کی بنیاد رکھی اس کمپنی کے تحت انہوں نے دنیا کے مسلمان لیڈروں کا سب سے پہلا البم "اسلامک البم" کے نام سے شائع کیا اور نبی کریمؐ کی نادر سوانح عمری فرانس سے منگوا کر فروخت کی۔ اس کے بعد پبلٹی لمیٹڈ اور لارلز لمیٹڈ (جو اشتہاری کمپنیاں تھیں) میں بھی ملازم رہے۔

۱۹۳۴ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے اپنا رسالہ "ادبی دنیا" لارلز لمیٹڈ کے ہاتھ بیچ دیا تو اس کی ارادت مولانا صلاح الدین احمد اور منصور احمد کے سپرد ہوئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۷ء تک دونوں نے مل کر اس رسالے کے لیے دن رات کام کیا اور اسے مقبول بنایا۔ ۱۹۳۷ء میں منصور احمد کا انتقال ہو گیا اور اور صلاح الدین احمد نے مکمل طور پر اس کی ادارت سنبھال لی اور تادم مرگ "ادبی دنیا" کے ذریعے اردو ادب کے فروغ کیلئے کوشاں رہے۔

رسالہ "ادبی دنیا" کا آغاز تاجور نجیب آبادی نے ۱۹۲۹ء میں کیا تھا اور اس کا نام سر شیخ عبدالقادر نے تجویز کیا تھا۔ میرا جی نے بھی اس رسالے کیلئے کافی عرصہ کام کیا۔ یہ رسالہ انقلابی ادبی پروگرام کا نقیب تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے ادبی دنیا اس روایت کو آخر دم تک قائم رکھا۔

مولانا صلاح الدین احمد نے ادبی دنیا کی ادارت کے ساتھ دوسرے ادبی رسائل کیلئے بھی مضامین و مقالات لکھے اور ادب کی مختلف اصناف افسانہ، ناول، غزل، سوانح عمری وغیرہ پر لاجواب تنقید بھی کی۔ ان کی تنقید سے ان فن پاروں کی افادیت میں اضافہ ہوا اور ان اصناف کو ارتقائی مراحل طے کرنے کے مواقع میسر آئے۔ مترجم کے طور پر بھی انہوں نے اردو زبان کی ناقابل فراموش خدمت کی۔

مولانا صلاح الدین احمد دل سوزی، جاں فشانی اور ریاضت کو علم و ادب کی سچی خدمت کیلئے لازمی قرار دیتے تھے اور خود بھی اس پر عمل پیرا تھے۔ یہی وجہ ہے وہ مترجم بھی تھے اور مصنف بھی، ادیب بھی تھے اور نقاد بھی، صحیفہ نگار بھی تھے اور خطیب بھی، ادبی اور تنقیدی میدان میں راہرو بھی تھے اور

راہبر بھی۔ انہی صفات نے انہیں تاریخ زبان و ادب کا غیر فانی جزو بنا دیا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے مختلف اصناف ادب کیلئے اصول تنقید مرتب کئے۔ مترجم کی حیثیت سے انہوں نے غیر زبانوں کو اردو کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ غیر زبان کا آب و رنگ اور اردو زبان آپس میں مل کر شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ بطور مترجم انہوں نے سائنس، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی موضوعات پر لکھی گئی تحریروں کو اردو کی خوبصورت شکل دی ہے۔ سائنسی ترجموں میں زوالوجی، کیمیا، فزکس اور فزیالوجی سے متعلق موضوعات زمانہ قدیم کے جانور، زندہ اشیاء، زندگی منزل بہ منزل، زمین کی بدلتی ہوئی سطح، حرارت، پھل اور بیج کے علاوہ بے شمار مضامین شامل ہیں۔

ان کے سیاسی موضوع پر کئے گئے ترجمے "امریکہ کا سیاسی نظام" جو ڈیوڈ کشمین کائل کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس ترجمے کے ذریعے امریکہ کے عروج کا راز منکشف ہوتا ہے۔ امریکہ کی خارجہ حکمت عملی اور ان کا آئین، بین الاقوامی سیاست میں امریکیوں کے طرز فکر کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغاز، مولانا صلاح الدین احمد کے بارے مین کہتے ہیں کہ

"اردو کے انشاء پرداز صرف تین ہیں۔ محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد اور مولانا صلاح الدین احمد"۔

مولانا اہل نظر حلقوں میں صاحب طرز نثر نگار کے طور پر مشہور تھے۔ مولانا زبردست تخیل کے مالک تھے اس لئے شبلی اور آزاد کی طرح شاعرانہ وسائل سے بہت کام لیتے تھے۔ آپ کی ادبی خدمات کے پیش نظر ۱۹۶۴ء میں حلقہ ارباب اردو پاکستان کی طرف سے آپ کو "ناخدائے اردو" کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔

آپ کے مضامین و مقالات اپنے دور کے معروف اخبارات و رسائل، نوائے وقت، امروز، زمیندار، پاکستان ٹائمز، ہمایوں، نصرت، خیالستان، تہذیب الاخلاق، نقوش میں باقاعدگی سے چھپتے تھے اور انہیں ادبی حلقوں میں

خوب پسند کیا جاتا تھا جب تک اردو زبان و ادب موجود ہے اس وقت تک مولانا صلاح الدین احمد کا نام زندہ و تابندہ رہے گا۔

آپ نہ صرف صاحب طرز انشاء پرداز تھے بلکہ ایک کامل انسان بھی تھے۔ عجز و انکسار اور خلوص کا پیکر تھے۔ ان کے مزاج میں اقبال کے تصور "فقر" کی سی شان بے نیازی تھی۔ وہ توکل و استغناء اور صبر و قناعت کی دولت سے مالا مال تھے۔ فیض رسانی کی خوبی ان کے کردار کی نمایاں ترین خصوصیت تھی' جو ان کے قریب آیا فیض یاب ہوا۔ مولانا نے تمام زندگی اسلام' جمہوریت اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی بھرپور کوشش میں بسر کی۔

آپ کا انتقال ۱۴ جون ۱۹۶۴ء کو ہوا اور قبرستان میانی صاحب میں حضرت طاہر بندگی کے مزار کی مشرقی دیوار کے ساتھ مدفون ہوئے۔

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی یکم دسمبر ۱۹۲۳ء کو محلہ قاضی واڑہ شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام محمد سلطان کاظمی تھا اور وہ رائل انڈین فورس میں صوبیدار میجر تھے۔ ناصر کاظمی کا اصل نام ناصر رضا تھا۔ انہوں نے اپنے بچپن کے ایام انبالہ ہی میں گزارے۔ ناصر کاظمی نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے دادا اور نانا کے گھروں پر حاصل کی۔ سکول کی ابتدائی تعلیم نوشہرہ سے حاصل کی کیونکہ ان دنوں ان کے والد بسلسلہ ملازمت نوشہرہ میں تھے۔ ناصر کاظمی جب چوتھی جماعت میں تھے تو ان کے والد کا تبادلہ پشاور ہو گیا اور وہ یہاں آکر نیشنل ہائی سکول پشاور میں داخل ہو گئے چھٹی تک اسی سکول میں زیر تعلیم رہے اور مڈل کا امتحان ڈی بی مڈل سکول ڈکشائی سے پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان انبالہ مسلم ہائی سکول (انبالہ) سے پاس کیا۔ لاہور آکر گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔

ناصر کاظمی نے اپنی تخلیقی زندگی کی ابتدا تیرہ برس کی عمر میں کی اور ابتدا میں نظمیں اور پھر غزلیں کہیں۔ انہیں بطور شاعر مقبولیت اس وقت حاصل ہوئی جب وہ ایف۔ اے کے طالب علم تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے اشعار کی مہک گوشے گوشے میں پھیل گئی اور پاکستان کو ناصر کاظمی کے روپ میں ایک نیا شاعر نصیب ہوا۔

ناصر کاظمی ۱۹۳۹ء میں لاہور ریڈیو کے ساتھ بطور سکریٹ رائٹر منسلک ہو گئے۔ یہ ملازمت انہیں صرف سولہ برس کی عمر میں حفیظ ہوشیارپوری اسٹیشن ڈائریکٹر کے توسط سے ملی تھی۔ ریڈیو پر ناصر کاظمی کا پروگرام "سفینہ

غزل" بہت مقبول ہوا تھا جس میں وہ پروگرام کا سکرپٹ خود لکھتے تھے اور مختلف کلاسیکی شعراء کا کلام منتخب کر کے بڑے گلوکاروں کی آواز میں پیش کیا جاتا تھا۔

ادب، آرٹ، موسیقی اور فلسفہ سے ان کی خصوصی دلچسپی کا اظہار تخلیقی اعتبار سے ریڈیو پر بھی ہوا اور انہوں نے ریڈیو کی ملازمت کے دوران اپنے اس خوبصورت شغف کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ وہ مختلف ادبی جریدوں "اوراق نو"، "ہمایوں" اور "خیال" کے مدیر بھی رہے وہ محکمہ سماجی بہبود آبادی میں ملازم رہے اور ۱۹۵۹ء سے لیکر ۱۹۶۴ء تک ولیج ایڈ محکمہ میں رسالہ "ہم لوگ" کے نائب مدیر اور اسسٹنٹ پبلسٹی آفیسر رہے۔ ۱۹۶۴ء تا دم آخر ریڈیو پاکستان کے سٹاف آرٹسٹ رہے۔

ناصر کاظمی نے نثر لکھی، روزنامچے تحریر کئے۔ پرندوں، درختوں، ستاروں، آبشاروں، دریاؤں، ندیوں، پہاڑوں، کبوتروں، چڑیوں اور فطرت کے ایک ایک رنگ کو اپنا ہمراز بنایا اور موسیقی، شطرنج، پتنگ، گھڑسواری، سیر سپاٹے اور شکار سے اپنا دل بہلایا۔

ناصر کاظمی کا پہلا شعری مجموعہ "برگ نے" کے نام سے ان کی زندگی میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں اور غزلیں مختلف معروف ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔

ان کی شعری اور نثری تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ برگ نے (غزلیں) ۱۹۵۲ء

۲۔ دیوان (غزلیں) ۱۹۷۲ء

۳۔ پہلی بارش (غزلیں) ۱۹۷۵ء

۴۔ نشاط خواب (نظمیں) ۱۹۷۷ء

۵۔ سر کی چھایا (منظوم ڈرامہ) ۱۹۸۱ء

۶۔ خشک چشمے کے کنارے (نثری تحریریں) ۱۹۹۰ء

۷۔ کلیات ناصر

اس کے علاوہ ان کا انتخاب کردہ کلام میر، نظیر، ولی اور انشاء بھی شائع

ہو چکا ہے۔

ناصر کاظمی متنوع موضوعات کے شاعر تھے۔ انہوں نے زندگی کے حسن کے سینکڑوں پہلوؤں اور رنگا رنگی کو عام کر دیا ہے۔ اس کے لہجے میں کھنک ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان کے بسنے والے اپنے دلوں کی دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں۔

ناصر کاظمی کا نظریے سے زیادہ زمین کے ساتھ گہرا رشتہ تھا۔ اس زمین کے توسط سے اس کی پرندوں، درختوں، پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں، دریاؤں، باغوں اور ہر اس شے سے قربت تھی جس کے بدن سے اسے اپنی مٹی کی خوشبو آتی تھی۔ ان کی تمام شاعری اس خوشبو کی بازیافت کا نام ہے۔

جب سے ناصر کاظمی نے اس خوشبو سے آشنائی حاصل کی وہ اس کی مہک کے رسیا رہے۔ اسی خوشبو کے سبب ان کی زندگی کے رویے ہجر و وصال کے موسموں سے آشنا ہوئے۔ ان ہی موسموں کے سبب ناصر کاظمی کے یہاں اداسیوں، یادوں، ریجگوں، سرسوں کے پھولوں، ستاروں، بسوں، چاند، بارشوں، پت جھڑوں، پرندوں اور درختوں کے استعاروں کے رنگ نمایاں ہوئے۔ انہوں نے اپنی غزل میں تخلیقی بازیافت اور خود آگاہی کی خوشبو سے ماضی حاصل اور مستقبل کی تہذیبی اور ثقافتی مہکاروں کو یکجا کیا۔ ناصر کاظمی کی شاعری یادوں اور خوابوں کا بیان ہے۔ ان کی شاعری کے موسم ان کے اپنے اندر کے موسموں پر مشتمل ہے۔ یہ ایسے موسم ہیں جن کا تعلق روح اور دل سے ہے۔

ناصر کاظمی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اقبال کے بعد غزل کو نہ صرف نیا پیراہن عطا کیا بلکہ اسے استحکام بھی عطا کیا۔ اردو شاعری میں ناصر کاظمی کا نام تابندہ و پائندہ رہے گا۔

ناصر کاظمی نے ۲ مارچ ۱۹۷۲ء کو معدہ کے کینسر کی وجہ سے وفات پائی اور قبرستان مومن پورہ، میکلوڈ روڈ لاہور میں دفن ہوئے۔

مرزا سلطان بیگ المعروف نظام دین

مرزا سلطان بیگ ۱۹۲۳ء میں گاؤں "اٹاری شام سنگھ" (امرتسر) میں مرزا فرمان بیگ کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق مغل برادری سے تھا۔ مرزا فرمان بیگ اپنے گاؤں کے ذیلدار تھے اور ان کا پیشہ زمینداری تھا۔ مرزا سلطان بیگ نے ابتدائی قرآنی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر اپنے گاؤں کے سکول میں داخلہ لے لیا۔ اسی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پنجابی میں منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد دہلی چلے گئے اور دیوان سنگھ کے دہلی سے چھپنے والے جریدے میں ملازمت اختیار کر لی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران محکمہ فوج میں ملازم ہو گئے اور کچھ عرصہ بعد ۱۹۴۳ء میں محکمہ راشننگ میں ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۹۴۳ء میں پہلی مرتبہ ریڈیو پر متعارف ہوئے اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈرامے "نیت کا پھل" میں تھانیدار کا کردار ادا کیا۔ ریڈیو پر باقاعدہ کام کا آغاز ۱۹۴۶ء میں ریڈیو جالندھر کے ایک پروگرام سے کیا۔ ریڈیو جالندھر سے پیش کئے جانے والے اس پروگرام میں آپ کے ساتھ اوم پرکاش (بھارتی) پیارے لال سود اور اچلا سچدیو (فلم ایکٹرس) شامل تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے موقع پر آپ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے اور شیش محل روڈ نزد مزار حضرت داتا گنج بخشؒ رہائش اختیار کی۔

پاکستان آ کر مرزا سلطان بیگ نے محکمہ خوراک کی ملازمت چھوڑ دی اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور پنجابی زبان کے دیہاتی پروگرام "دیہاتی بھائیوں کیلئے" کے کمپیئر منتخب ہوئے۔ ریڈیو پاکستان سے یہ وابستگی تادم مرگ برقرار رہی۔ پروگرام "دیہاتی بھائیوں کیلئے" میں آپ کے ساتھ دوسرے

فنکاروں میں سلطان کھوسٹ (نوردین)، طفیل فاروقی (مولا بخش) اور مرحوم رشید (قائم دین) شامل تھے۔ یہ پروگرام بہت مقبول ہوا اور اس کی بدولت ریڈیو کے سامعین کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ اس پروگرام کی مقبولیت کا سبب اس کا ہلکا پھلکا طنز و مزاح، معاشرتی زندگی کے مسائل کی عکاسی اور ان کے حل کا بیان تھا۔ ان عناصر کے علاوہ اس پروگرام کی مقبولیت کا بنیادی جزو مرزا سلطان بیگ (نظام دین) کی منفرد آواز اور دل پذیر انداز تھا۔ اس پروگرام میں اپنے دور کے دوسرے معروف فنکاروں رشید حبیبی، اداکار اجمل اور شیخ عبداللطیف (چوہدری صاحب) نے بھی کام کیا اور عوام سے خوب داد حاصل کی لیکن اس پروگرام کی بدولت جو عزت، شہرت اور مقبولیت مرزا سلطان بیگ کے حصے میں آئی اس کی نظیر ریڈیو اور ٹیلی وژن پاکستان کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ پروگرام مختلف وقتوں میں نام کی تبدیلی کے ساتھ مسلسل پیش کیا جاتا رہا اور اس نے ناقابل بیان کامیابی حاصل کی۔ "دیہاتی بھائیوں کیلئے" کے بعد اس کا نام "جمہور کی آواز" رکھا گیا اور آخر میں "سوہنی دھرتی" کے نام سے یہ پروگرام اس خوبصورت خطے کی ثقافت کی پہچان بن گیا۔ نظام دین اس پروگرام کے سرپنچ اور اس کی بنیادی روح تھے۔ اس پروگرام کے ذریعے مرزا سلطان بیگ کا کردار نظام دین اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے۔ مرزا سلطان بیگ کو اللہ تعالیٰ نے زبردست حافظے، گہرے مشاہدے اور شیریں گفتار سے نوازا ہوا تھا جس کے سبب ان کی زبان سے ادا شدہ الفاظ نہ صرف کانوں میں رس گھولتے تھے بلکہ ایک پیغام بھی دیتے تھے۔

مرزا سلطان بیگ نے اس پروگرام کے ذریعے بات چیت کے انداز میں اصلاحی نکتہ نظر سے لوگوں کو معاشرتی برائیوں سے آگاہ کیا۔ زندگی کے معمولی مسئلے سے لیکر بہت بڑی خامی پر اظہار خیال کیا۔ مرزا سلطان بیگ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ اس پروگرام کو فی البدیہہ پیش کرتے تھے۔ ہر موضوع پر ان کے ذہن میں اسقدر ذخیرہ موجود تھا کہ دریاؤں کی روانی کی مانند الفاظ بہتے جاتے تھے۔ ان کو ہزاروں ضرب الامثال اور پنجابی زبان کے محاورے و روزمرہ

زبانی یاد تھے۔ مرزا سلطان بیگ اپنے دل کش انداز کی بدولت ہر ریڈیو سننے والے کے دل کی دھڑکن تھے۔ ان کا پروگرام سننے والے ہر شخص کو یہی گمان ہوتا تھا کہ جیسے وہ صرف اسی کے ساتھ مخاطب ہوں۔ انہوں نے سامعین کے روزمرہ کے معمولات کو زیر بحث لاتے ہوئے ریڈیو پروگراموں کی کمپیرنگ میں نیا انداز پیدا کیا۔

۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں اپنے ریڈیو پروگرام "سوہنی دھرتی" کے ذریعے وطن عزیز کے خلاف بھارت کی طرف سے کئے جانے والے پراپیگنڈہ کا بھرپور جواب دیا اور پاکستانی افواج و عوام کے دلوں میں نیا عزم و ولولہ پیدا کیا۔ ان کی گرانقدر فنی خدمات کی بدولت انہیں ۱۹۶۵ء میں تمغہ خدمت اور ۱۹۷۹ء میں تمغہ امتیاز سے نوازا گیا۔ ان اعزازات کے علاوہ بے مثال کارکردگی پر بے شمار گولڈ میڈل اور انعامات حاصل کئے۔ ان کے ساتھ ساتھ سب سے بہت بڑا اعزاز پوری پاکستانی قوم کی محبت کی صورت میں حاصل کیا۔

۱۹۸۳ء میں آل ورلڈ پنجابی کانفرنس منعقدہ بھارت میں مرزا سلطان بیگ کو اس وقت کے وزیر اعلیٰ دربارہ سنگھ نے خصوصی ایوارڈ سے نوازا اور بھارتی حکومت کی طرف سے آپ کو جو تعریفی خط دیا گیا اس میں تحریر تھا کہ آپ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا حکومت پاکستان کو چاہیے کہ آپ کو بھارت میں پاکستان کا سفیر مقرر کر دے۔

مرزا سلطان بیگ "سوہنی دھرتی" کے "سوہنے" فنکار تھے انہوں نے تمام عمر فن اور ثقافت کی خدمت کیلئے وقف کئے رکھی۔ ریڈیو کے توسط سے انہوں نے پنجاب کی ثقافت کو فروغ دیا اور پنجاب کے تہذیبی سرمائے کو اگلی نسلوں تک منتقل کیا۔ ان کی آواز کا بدل ایشیا کی ریڈیائی دنیا میں ابھی تک نہیں مل سکا۔ ان جیسے فنکار واقعی کئی سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً ۴۲ برس تک فن کی خدمت کی۔ ان کی پنجابی زبان و ادب کے فروغ کیلئے محنت و کاوش اور خدمات کو جس قدر خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے

آواز کے میدان میں ایسے معیار قائم کئے جو ناقابل تقلید ہیں۔

نظام دین ریڈیو پروگراموں کے علاوہ ٹیلی ویژن کیلئے بھی کام کرتے رہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر پیش ہونے والے پروگراموں میں "نظام دین دی بیٹھک" نے خاص شہرت حاصل کی۔ پاکستان ٹائمز کیلئے کچھ عرصہ تک پنجابی کالم بھی لکھتے رہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل دو تصانیف ان کے زور قلم کی یادگار ہیں۔

۱۔ کھلرے موتی ۲۔ پنجابی دے اکھان

مرزا سلطان بیگ پنجابی زبان کا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ وہ اعلیٰ قوت حافظہ کے مالک تھے۔ انہیں ہیروارث شاہ تقریباً" مکمل طور پر زبانی یاد تھی اور لگ بھگ پانچ ہزار پنجابی اشعار ان کے حافظہ میں محفوظ تھے۔ اپنے اس حافظے کا مظاہرہ ریڈیو پروگرام "سوہنی دھرتی" میں روزانہ کرتے تھے اور لوگ ان کی باتیں سن کر نہ صرف محظوظ ہوتے تھے بلکہ ان کی قوت مشاہدہ اور حافظے کی بھرپور داد دیتے تھے۔ ان کے پروگرام باقاعدگی سے سماعت کرنا لوگوں کے معمول میں شامل تھا۔

اس عظیم فنکار اور محب وطن، درویش منش شخصیت کا انتقال ۴ جولائی ۱۹۹۱ء کو لاہور میں ہوا۔ آپ کی آخری آرام گاہ قبرستان شیر شاہ ولی نزد ڈسٹرکٹ کیمپ جیل اچھرہ میں واقع ہے۔

مرزا سلطان بیگ کی وفات سے ریڈیو سننے والوں کی تعداد مین واضح کمی پیدا ہوئی اور وہ اپنے پیچھے ایسا خلاء چھوڑ گئے ہیں کہ آئندہ آنے والے کئی سالوں میں اسے پر کرنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ وہ آج ہم میں موجود نہیں لیکن ان کی آواز آج بھی کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ ہماری باتوں میں اور ہماری یادوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

واصف علی واصف

واصف علی واصف کا تعلق کنڈان (اعوان) خاندان سے ہے۔ اس خاندان کا سلسلہ حضرت گل شاہ سے شروع ہوتا ہے اور مستند حوالوں سے حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے۔ یہ اولاد حضرت علیؓ کی ان بیویوں میں سے تھی جو سید نہ تھیں۔ یہ لوگ سعودی عرب سے آکر درہ خیبر کے قریب پہاڑوں کے پاس آباد ہوئے۔ ایک خاندان سون سکیسر (ضلع خوشاب) میں آباد ہوا۔ دوسرا خاندان شاہ پور (ضلع سرگودھا) کے جنوب میں سکونت پذیر ہوا اور تیسرے خاندان نے خوشاب شہر میں رہائش اختیار کی اور اس محلے کا نام کنڈانوالہ مشہور ہوا۔ واصف علی واصف کنڈان خاندان کے اس مہاجر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو خوشاب شہر میں آکر آباد ہوا۔ یہ خاندان خوشاب میں تقریباً" تین صدیوں سے آباد ہے۔

واصف علی واصف کی پیدائش کنڈانوالہ میں ہوئی۔ آپ کی مستند تاریخ پیدائش ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء ہے۔ ان کا اصل نام محمد واصف ملک تھا۔ آپ کے والد کا نام محمد عارف تھا اور وہ پیشہ کے اعتبار سے آرٹ ٹیچر تھے۔ واصف علی واصف کا خاندان سالہا سال سے چشتیہ سلسلے سے بیعت تھا اور اس خاندان کے بیشتر افراد حافظ قرآن تھے۔ ان کے خاندان میں ذکر و اذکار کی محافل کا باقاعدہ انعقاد ہوتا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف خود صاحب علم تھے بلکہ دوسروں کو بھی دینی تعلیم سے آراستہ کرتے تھے۔

واصف علی واصف نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ انہوں نے گورنمنٹ ہائی سکول

خوشاب میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اس سکول سے میٹرک کرنے کے بعد آپ جھنگ چلے گئے اور وہاں سے ایف۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور سے ایم۔ اے انگریزی کا امتحان پاس کیا۔

واصف علی واصف نے ساری زندگی ملازمت نہ کی بلکہ اپنے طور پر خود مختار رہ کر اتنا کما لیتے تھے جس سے گھر کا نظم و نسق بخوبی برقرار رہتا تھا۔ انہوں نے ساری زندگی ٹیوشن پڑھانے میں بسر کی۔ پرانی انار کلی لاہور میں ان کا قائم کردہ ٹیوشن سنٹر "لاہور انگلش کالج" بہت مشہور ہوا۔ اس کے علاوہ ایک پرائیویٹ سکول "واصف آئیڈیل سکول" بھی قائم کیا۔ انہوں نے دو شادیاں کی ہوتی تھیں جن سے تین بیٹے اور سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ واصف علی واصف کی ادبی زندگی کا آغاز کالج کے زمانہ سے ہوا۔ لیکن انہوں نے باقاعدہ طور پر ۱۹۶۷ء میں لکھنا شروع کیا۔ آپ ادبی دنیا میں شاعر اور کالم نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

واصف علی واصف کی نثر کا آغاز اس طرح ہوا کہ آپ ذکر و اذکار کی محافل میں جو گفتگو فرماتے تھے۔ آپ کے ان اقوال کو ایک معتقد نے لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیا جسے آپ نے قبول فرمایا اور یہ اقوال "کرن کرن سورج" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔

آپ کی کالم نگاری کا آغاز ۱۹۸۶ء میں ہوا۔ ان کا پہلا کالم "محبت" کے عنوان سے روزنامہ "نوائے وقت" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ "گفتگو" کے عنوان سے نوائے وقت کے ادبی صفحہ میں آخری عمر تک لکھتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ روزنامہ "جنگ" "پاکستان" اور "خبریں" میں بھی آپ کی تحریر چھپتی رہیں۔

آپ کی مطبوعہ تصانیف درج ذیل ہیں۔

۱۔ شب چراغ (اردو شاعری) ۱۹۷۸ء

۲۔ کرن کرن سورج (نثر پارے) ۱۹۸۶ء

۳۔ دل دریا سمندر (کالک) ۱۹۸۷ء
۴۔ قطرہ قطرہ قلزم (کالم) ۱۹۸۹ء
۵۔ حرف حرف حقیقت (کالم) ۱۹۹۴ء
۶۔ بھرے بھڑوے (پنجابی شاعری) ۱۹۹۶ء
۷۔ شب زار (اردو شاعری) ۱۹۹۶ء
۸۔ بات سے بات (نثرپارے) ۱۹۹۵ء
۹۔ گفتگو (سوالات و جوابات) ۱۹۹۶ء

کرن کرن سورج کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ واصف علی واصف نے چونکہ اپنے خاندان کے متصوفانہ ماحول میں پرورش پائی تھی اس لیے تصوف اور فقر ان کے خون میں شامل تھا۔ آپ صوفی منش انسان تھے۔ خود کو کسی خاص سلسلے سے منسوب نہیں کرتے تھے۔ اللہ کی ذات اور صفات کے ذکر پر بے خود ہو جاتے تھے۔ عشق رسولؐ سے ان کا دل لبریز تھا۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ وہ ایک چمن تھے اور چمن کی بہار بھی تھے۔

واصف علی واصف صوفی بزرگ تھے۔ تصوف اپنے نفس پر قابو پا کر قرب حق حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے' جسے طریقت کہتے ہیں اور اس پر عمل کرنے والے کو صوفی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اس عمل میں خدا کی طرف سفر کیا جاتا ہے اس لیے اسے سلوک کہتے ہیں اور صوفی کو سالک کا نام دیا جاتا ہے۔ تصوف میں عبودیت' ذوق و وجدان اور محبت و شیفتگی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے صوفیاء کے کلام میں عام طور پر جذبات کی آمیزش نظر آتی ہے واصف علی واصف نے اردو شاعری میں موجود تصوف اور صوفیانہ عقائد و نظریات کی اسی مستحکم روایت کو آگے بڑھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدید اردو شاعری کے تقاضوں کو بھی بخوبی نبھایا۔

نثر نگار کے طور پر وہ منفرد کالم نگار تھے۔ ان کے کالموں کو ادبی' دینی' روحانی' معاشرتی' اصلاحی اور صوفیانہ ہر طرح کی صنف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے انداز تحریر کے سبب جہاں تصوف کے بہت سے عقدے وا کئے

ہیں وہاں اپنے ملک کی بہتری اور معاشرے کی گرتی ہوئے اقدار کو بہتر بنانے کے گر بھی بتائے ہیں۔ اس کے علاوہ آج کا انسان جن نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے اس کی وجہ اور علاج باتوں باتوں میں بیان کر دیا ہے۔ اپ کی نثر دل میں اترتی چلی جاتی ہے اور باذوق لوگوں کیلئے انمول تحفہ ہے۔

علم و فضل کا یہ منبع ۱۸ جنوری ۱۹۹۳ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ آپ کا مدفن قبرستان میانی صاحب بہاولپور روڈ پر مرجع خلائق ہے۔ واصف علی واصف اپنی تحریروں، کتابوں، دوستوں کے دلوں، شاگردوں کے دماغوں اور عقیدت مندوں کے ذہنوں میں تادیر زندہ رہیں گے۔

maablib.org

استاد اللہ بخش

استاد اللہ بخش ۱۸۹۲ء میں وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام کرم دین تھا وہ محکمہ ریلوے میں ملازم تھے اور ریل گاڑیوں پر نقش نگاری کا کام کرتے تھے۔ استاد اللہ بخش کی ابتدائی تعلیم کا آغاز قلم دوات کے بجائے برش اور رنگ سے ہوا اور انہیں سکول کے بجائے ریلوے کے پینٹر مستری نذیر محمد کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ ۸ برس کی عمر میں لاہور کے مشہور پینٹر باباعبداللہ کے شاگرد ہو گئے۔ بارہ سال کی عمر میں اچھے کاریگروں میں شمار ہونے لگے۔ استاد اللہ بخش نے اپنی ذہانت' لگن اور فنکارانہ صلاحیتوں کے باعث نوجوانی ہی میں ناموری حاصل کر لی تھی۔ ان کی پہلی تصویری نمائش ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ میو سکول آف آرٹس میں مصوری کی تعلیم دیتے رہے۔ سیلانی طبیعت کے سبب کسی جگہ جم کر کام نہیں کرتے تھے کبھی آغا حشر کاشمیری کے سیٹ ڈیزائن کرتے اور کبھی بمبئی میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء تک حافظ آباد میں ایک تھیٹریکل کمپنی میں پردوں کی رنگ کاری اور نقش کشی کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد بمبئی چلے گئے جو اس وقت عظیم ثقافتی مرکز تھا۔ یہاں "منا جان تھیٹریکل کمپنی" میں نقش کشی کا کام کیا۔ اس عرصے میں انہوں نے بہت سی گرانقدر تصاویر بنائیں جن کی بہت تعریف کی گئی۔ ۱۹۲۸ء میں بمبئی میں ہونے والی تصویری نمائش میں ان کے شاہکار کو اول قرار دیا گیا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے بلا کر آپ کے فن کی تعریف کی اور ایک برس تک ریاست پٹیالہ کے اسٹیٹ آرٹسٹ رہے۔ اس دوران کلکتہ میں آپ کی تصویری نمائش ہوئی جسے خوب سراہا گیا اور اہل دل ان فن پاروں سے خوب متاثر ہوئے۔ ۱۹۳۰ء میں

پٹیالہ سے لاہور آ گئے اور مستقل طور پر مسلم ٹاؤن میں سکونت پذیر ہوئے اور تادم مرگ یہیں پر اپنے فن کی شمعیں روشن کرتے رہے۔

استاد اللہ بخش کی مصوری میں زندگی کے مختلف ادوار کے ملے جلے اثرات ملتے ہیں وہ روغنی رنگ، آبی رنگ، پوسٹر رنگ، ٹمپرا رنگ اور چاک وغیرہ میں بڑی خوبی سے کام کرتے تھے۔ ان کو پنسل ورک پر بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ انہوں نے کافی عرصہ رومانی تصویر کشی کی۔ جس میں دولہا، دلہن، ہیر رانجھا، جاٹ، جٹی وغیرہ کی تصویریں شامل ہیں۔ قدرتی مناظر اور روزمرہ زندگی کی تصویر کشی بھی کرتے تھے۔ انہوں نے پنجاب کے ثقافتی ماحول اور دیہاتی زندگی کو بڑے خوبصورت انداز سے اجاگر کیا ہے۔ ان تصاویر میں پنجاب کی رعنائیوں اور دیہاتوں کے ماحول کو بڑی خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ ان کی بنائی ہوئی تصاویر دیکھ کر انسان مبہوت ہو جاتا ہے۔ ان شاہکاروں میں چلتی پھرتی متحرک زندگی نظر آتی ہے۔ کوئی نثر نگار یا شاعر جو خیال لفظوں میں بیان کرتا ہے وہ استاد اللہ بخش کے فن پاروں میں موجود ہے اور فن کے قدر شناسوں کو دعوت ذوق جمال دیتا ہے۔

اگر وہ نوجوان دوشیزہ کی تصویر بناتے ہیں تو اس کے خدوخال، چہرے کی شادابی، آنکھوں کی چمک، خم دار زلفیں، ہونٹوں کا مسکان اور الڑ جوانی بھرپور انداز سے عیاں ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے، ان کی دیہی زندگی سے متعلق بنائی ہوئی تصاویر میں سرسبز کھیت، کھلیان، جیالے کسان، چلتا ہوا شفاف پانی، کھانا لے کر جاتی ہوئی مٹیاریں، درختوں کی اوٹ میں ڈوبتا ہوا سورج، دور دھرتی سے گلے ملتا ہوا آکاش، کھیت چرتے ہوئے جانور غرضیکہ اس زندگی کا ہر رنگ ہر انداز سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کے تصویری موضوعات زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں ان کی بنائی ہوئی تصویر "مہاجر" نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ان کی بنائی ہوئی تصاویر آفاقی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان کی نصف صدی پہلے کی بنائی ہوئی تصاویر بھی آج کے دور کے تمام تقاضوں پر پورا اترتی ہیں۔

آپ کی بنائی ہوئی تصاویر بلاکم و کاست اپنے فن کے نادر نمونے ہیں۔ ان فن پاروں میں پاکستان کی ثقافت کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کے تمام رنگوں اور حسن و دلکشی کو استاد اللہ بخش نے جاوداں کر دیا ہے۔

استاد اللہ بخش کو ان کی خدمات کے صلے میں حکومت پاکستان کی طرف سے "تمغہ خدمت" اور "تمغہ حسن کارکردگی" سے نوازا گیا۔ پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس کے شعبہ بصری فنون کے پاس استاد کی زندگی اور فن پر مبنی فلم رپورٹ موجود ہے۔

استاد اللہ بخش کا انتقال ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو ہوا۔ آپ کی آخری آرامگاہ قبرستان مسلم ٹاؤن بلاک اے بالمقابل مسجد بلال میں واقع ہے۔

استاد اللہ بخش اپنے دور کے عظیم مصور تھے وہ آج ہم میں موجود نہیں لیکن ان کا فن رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ وہ اپنے فن کی بدولت ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ ان کا نام مصوری کی دنیا میں ہمیشہ تابندہ و پائندہ رہے گا۔

maablib.org

اینا مولکا احمد

اینا مولکا ۱۳ اگست ۱۹۱۷ء کو لندن میں پیدا ہوئیں۔ والدہ کا تعلق پولینڈ اور والد کا روس سے تھا۔ بچپن ہی سے سیماب صفت، تخلیقی اور متجسس ذہن کی مالک تھیں۔ ہوش سنبھالتے ہی اپنے اشتیاق کے سبب مختلف ادیان کا مطالعہ کیا اور جس مذہب نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اسلام تھا۔ ابتدائی تعلیم کا آغاز گوڈالفن اینڈ لیٹی مارگرلز ہائی سکول لندن Godolphin and Latinar Girls High School سے حاصل کیا۔ اس کے بعد Hammersmith College ہیر سمتھ کالج میں کاونٹی کونسل لندن کی طرف سے منعقدہ فائن آرٹ کے امتحان میں سکالرشپ حاصل کی۔ آرٹ کی باقاعدہ تعلیم سینٹ مارٹن سکول آف آرٹ (Martin School of Art St.) چیرنگ کراس لندن سے حاصل کی اور اور پھر لندن کونسل سے سینئر سکالرشپ آف فائن آرٹ (Senior Schalarship of Fine Art) لینے کے بعد رائل کالج آف آرٹ (Royal College of Art) لندن میں داخل ہوئیں۔ رائل کالج سے اپنی آرٹ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہیں رائل کالج میں ایسوسی یٹ ان ڈیزائن (Associate in Design) مقرر ہوئیں۔ رائل کالج سے انہوں نے لیتھو گرافی (Letho graphy) لائن انگریونگ (Line Engraving) ڈرائی پوائنٹ (Dry point) ایچنگ اینڈ ایکواٹنٹ (Etching and aquatint) اور وڈ انگریونگ (Wood Engraving) میں سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ان کی شادی مسٹر شیخ احمد سے ہوئی۔ شیخ احمد خود بھی

آرٹسٹ تھے۔ اینا لندن سے امرتسر آگئیں۔

اسی دوران پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ضرورت آرٹ ٹیچر کا اشتہار جاری کیا تو مسز اینا مولکا احمد اپنے خاوند کے ساتھ لاہور چلی آئیں اور اس پوسٹ کے لیے منتخب ہو گئیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے کیریر کا باقاعدہ آغاز کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں انہوں نے برطانوی طرز کے سلیبس کی بجائے امریکی سلیبس رائج کروایا کیونکہ برطانوی سلیبس میں ان کے خیال کے مطابق یہ خامی تھی کہ تھیوری اور پریکٹیکل الگ الگ کروائے جاتے تھے۔ لیکن امریکن طرز کے مطابق تھیوری اور پریکٹیکل اور آرٹ کی تاریخ ایک ساتھ ہی پڑھائے جاتے تھے جس سے طلبہ زیادہ مستفید ہوتے تھے اور ان کی دلچسپی برقرار رہتی تھی۔ انہوں نے آرٹ کی کلاسز کے فروغ کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کوششوں سے پنجاب یونیورسٹی فائن آرٹ ڈیپارٹمنٹ جلد ہی مستحکم ہو گیا اور طلبہ کو آرٹ کے فن سے خصوصی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ یہ شعبہ ابتدا میں صرف طالبات کے لیے محدود تھا لیکن ۱۹۵۶ء میں لڑکوں کو بھی داخلے کی اجازت دے دی گئی۔ ان کی کوششوں سے ۱۹۵۸ء میں ایم۔ اے فائن آرٹس کی کلاسز کا اجراء ہوا اور ۱۹۶۰ء میں بی۔ اے آنرز کا تین سالہ کورس بھی شروع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں مسز انیا مولکا نے پینٹرز اور گرافک ڈیزائنرز کے لیے پیشہ ورانہ کورسز کا اجراء کیا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں وہ اپنے خاوند کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے جاتیں اور قدرت کے حسین مناظر کو اپنے برش کی گرفت میں لا کر نہ صرف دیکھنے والوں کی آنکھوں کو جمال نظارہ فراہم کرتیں بلکہ ساتھ ساتھ فن کی خدمت کے گرانقدر نمونے بھی جمع کرتی جاتیں۔ ان کے بعد آنے والے فنکاروں نے ان شہ پاروں نے بہت استفادہ کیا اور آرٹ کی ترقی کا باعث بنے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ نے انہیں انتہائی ذہنی صدمے سے دوچار کیا اور انہوں نے اپنے فن کے ذریعہ جنگ اور اس کے نقصانات سے لوگوں کو آگاہ کر کے یہ درس دیا کہ جنگ صرف نقصان ہی نقصان ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے

دوران پاکستانی فوجیوں کی شجاعت اور بہادری کے واقعات کو اپنے فن پاروں کے ذریعے نمایاں کیا۔ ان کی یہ تصاویر دار میوزیم میں لگی ہوئی ہیں۔ ان کی پاکستانی افواج کے لئے بنائی ہوئی تصویر "قیصرالہند" کو بہت سراہا گیا۔ اور یہ تصویر انہوں نے مسلح افواج پاکستان کے لئے تین مرتبہ تیار کی۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ فائن آرٹ سے ۱۹۷۵ء میں ریٹائر ہو گئیں لیکن اپنے تجربے اور مہارت کی بدولت انہوں نے اپنی خدمات مسلسل جاری رکھیں اور ۱۹۸۳ء میں انہیں تاحیات پروفیسر امیریٹس (Professor Emerates) مقرر کیا گیا۔

۱۹۷۷ء میں انہوں نے علامہ اقبال اور قائداعظم کے دو بہت بڑے پورٹریٹ بنائے جو فضل آڈیٹوریم پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس میں آویزاں ہیں۔ اس طرح مسز اینا مولکا احمد نے تقریباً" نصف صدی تک فن مصوری کی خدمت کی۔ انہوں نے لینڈ سکیپ' پورٹریٹ' فیگر پینٹنگ' لارج کمپوزیشن' وار پینٹنگ' فلاسوفیکل اور مذہبی پینٹنگ' ڈرائنگ اور مونو مینٹل پینٹنگ کے بے شمار نمونے بطور یادگار چھوڑے اس کے علاوہ شیخ سعدی کی کتاب گلستان' رباعیات عمر خیام' فردوسی کے شاہنامہ کے لیے تصاویر بنائیں۔ بے شمار اسکلپچر اس پر مستزاد ہیں۔ پاکستان کی دیہاتی زندگی کی عکاسی اور قدرتی مناظر ان کے دلپسند موضوعات میں سے تھے۔

حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے ۱۹۶۳ء میں ستارہ امتیاز سے نوازا۔ ۱۹۶۹ء میں پرائڈ آف پرفارمنس ایوارڈ ملا۔ ۱۹۸۲ء میں قائداعظم آرٹسٹس ایوارڈ اور ۱۹۸۳ء میں پاکستان فیڈریشن آف بزنس اینڈ پروفیشنل وومنز کلب کی طرف سے گولڈ میڈل دیا گیا۔

اینا مولکا ۲۱ اپریل ۱۹۹۴ء کو وفات پا گئیں اور میانی صاحب قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئیں لیکن ان کے بے شمار شاہکار اور لاتعداد شاگرد انہیں زندہ جاوید بنانے کے لیے کافی ہیں۔

شاکر علی

شاکر علی ۴ مارچ ۱۹۱۶ء کو رام پور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ سکول کی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آرٹ کے ساتھ دلچسپی کے سبب اس شعبہ کی طرف آ گئے اور ۱۹۳۷ء میں UKIL برادر سٹوڈیو' نئی دہلی میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۸ء میں جے۔ جے سکول آف آرٹس بمبئی میں داخلہ لے لیا اور سات سال تک یہاں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۴۵ء میں اس سکول سے میورل ڈیکوریشن میں پوسٹ ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ء مین لندن چلے گئے اور سلیڈ سکول آف آرٹ یونیورسٹی کالج لندن سے فائن آرٹس میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۱۹۴۹ء میں فرانس چلے گئے اور آندرے لوتھ (Andre Lhote) کے ساتھ ایک سال کام کرنے کے بعد ۱۹۵۰ء میں سکول آف انڈسٹریل ڈیزائننگ پیراگوئے سے ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں ڈپلومہ حاصل کیا اور پاکستان آ گئے پاکستان آکر ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۸ء تک میوسکول آف آرٹس (موجودہ نیشنل کالج آف آرٹس) میں لیکچرار رہے۔

۱۹۵۸ء میں یہیں پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں نیشنل کالج آف آرٹس لاہور کے پرنسپل ہو گئے اور ۱۹۷۳ء تک اس کالج میں بطور پرنسپل خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۴ء میں انہیں نیشنل کالج آف آرٹس کا تاحیات پروفیسر منتخب کیا گیا۔

شاکر علی فن خطاطی کو تجریدی آرٹ کے طور پر متعارف کرانے والے پاکستانی مصوروں میں سے تھے۔ بعد میں یہ روایت بہت مقبول ہوئی۔ آپ کی تصاویری نمائش کا باقاعدہ آغاز پاکستان ہی سے ہوا۔ آپ کی پہلی تصویری نمائش

۱۹۵۶ء میں شعبہ فائن آرٹ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ہوئی۔ ۱۹۵۷ء میں آرٹ کونسل کراچی اور لاہور میں آپ کی تصویری نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں نیشنل کالج آف آرٹس لاہور میں آپ کی بنائی ہوئی تصاویر کی نمائشیں ہوئیں۔ پاکستان کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک امریکہ' برازیل' اٹلی' ایران اور انگلستان میں بھی آپ کے فن پاروں کی نمائشیں ہوئیں۔

شاکر علی کو ان کی فنی خدمات (مصوری) کے اعتراف کے طور پر ۱۹۶۷ء میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۱ء مین فائن آرٹ کیلئے آپ کی گرانقدار تدریسی اور فنی خدمات کے صلے میں آپ کو "ستارہ امتیاز" عطا کیا گیا۔ شاکر علی پاکستان میں فن مصوری کا اہم نام ہے۔ انہوں نے ایک ایسے عہد میں اپنے کردار کا آغاز کیا جب گردو پیش مجموعی طور پر جمود اور بے خصوصیت کا دور دورہ تھا۔ شاکر علی وہ پہلے پاکستانی مصور میں جنہوں نے فن مصوری کو جدید مغربی تکنیک سے مالا مال کیا۔ انہوں نے روایت اور جدت کے آمیزے سے ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جو جمود اور بے معنویت کے خاتمے کا باعث بنی۔ مصوروں اور ہنرمندوں کی ذہن کشائی کا عمل شروع ہوا اور پاکستانی مصوری کا جہان نت نئے تجربات سے سجتا چلا گیا۔

شاکر علی نے پاکستانی مصوروں کو اعتماد' یقین اور آگہی کے اوصاف سے مالا مال کیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ جدت کے ساتھ روایت کو بھی نبھایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جو مصور بے یقینی اور بے معنویت میں مبتلا تھے وہ شاکر علی کے زیر اثر یقین اور اعتماد کی فضا میں جدت اور تجرید کے آہنگ میں اپنے قومی گردو پیش اور دوسرے موضوعات کو کینوس پر منتقل کرنے لگے۔

شاکر علی پاکستان میں "تجریدی آرٹ" کی تحریک کا پیشوا ہے۔ اس کی تصویروں میں حقیقی جذبہ اور کائنات سے متعلق ایک خاص انداز نظر موجود ہے۔ وہ انسانی تجربے اور کائنات کو ایک کشمکش اور تصادم کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ شاکر علی کے تجریدی کام کی خاص بات اس کا منفرد زاویہ فکر ہے۔

شاکر علی کے تخلیقی کام میں خاکہ کشی، رنگ و روغن کی تصاویر اور دیواری تصاویر اپنے اندر زندگی کے تمام رنگ سموئے ہوئے ہیں شاکر علی کا برش تصویروں میں روح پھونک دیتا ہے اور جیتی جاگتی زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آ موجود ہوتی ہے۔ وہ خطاطی اور مصوری کی صناعی خصوصیات کو اپنے تصویری موضوعات پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بنائی ہوئی تصاویر اس کے موضوع کی خود ترجمانی کرتی ہیں۔

لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری میں بیت القرآن کے مقام پر بنی ہوئی دیواری تصویر اس کی نہایت اہم تصویر ہے۔ یہاں شاکر علی یہ احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ گویا ایک کٹے پھٹے بوسیدہ چیتھڑے پر قرآنی آیات تحریر ہیں۔

شاکر علی اپنی تصویروں میں ہنرمندی کا جوہر پیدا کرتے وقت اس کی ذاتی تخلیقی شناخت پر بھرپور توجہ دیتے تھے اور اس میں وہ مکمل طور پر کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ لاہور میں شاکر علی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں گارڈن ٹاؤن میں ایک گھر تعمیر کیا تھا۔ یہ گھر شاکر علی کی تصویروں کی طرح سنگ و خشت کی جیتی جاگتی ایک پرجمال تصویر ہے۔ شاکر علی کی وفات کے بعد پاکستان نیشنل کالج آف آرٹس کے زیر انتظام "شاکر علی میوزیم" قائم کیا گیا ہے۔ سرکاری اور قومی سطح پر کسی مصور کی یاد میں قائم ہونے والا یہ پہلا میوزیم ہے۔ یہ میوزیم اب تشنگان فن کیلئے درسگاہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ شاکر علی تصویروں کا جو بھاری خزانہ چھوڑ گئے تھے وہ اس میوزیم میں موجود ہے حسن کے مشاہدے سے اہل نظر افراد کو تسکین حاصل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فن مصوری کی آبیاری کا عمل بھی جاری ہے۔

شاکر علی نے زندگی کے فطری رنگوں، چڑیوں، پھولوں، چاند ستاروں کو ایسے خوبصورت رنگوں سے نوازا ہے کہ ان پر حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ چڑیوں، پھولوں اور چاند کا مصور شاکر علی ۲۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو اس فانی دنیا سے کوچ کر کے قبرستان اے بلاک گارڈن ٹاؤن نزد کلمہ چوک میں دفن ہوا۔

آپ کی قبر جنازگاہ قبرستان کے سامنے مشرقی دیوار کے ساتھ موجود ہے جس پر شاکر میوزیم کے ڈیزائن کی طرز پر چھت ڈالی گئی ہے۔

شاکر علی کا فن آج بھی مختلف رویوں میں زندہ ہے اور اس کے اثرات آنے والے دنوں میں بھی محسوس کئے جاتے رہیں گے۔ اس کے فن پاروں کا تنوع اور رنگا رنگی اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

maablib.org

عبدالرحمٰن چغتائی

عبدالرحمٰن چغتائی ۲۱ ستمبر ۱۸۹۷ء میں محلہ چابک سواراں اندرون لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام میاں کریم بخش تھا۔ ابتدائی قرآنی تعلیم مسجد چینیے والی اندرون لاہور سے مکمل کرنے کے بعد چھ سال کی عمر میں مسجد وزیر خاں (حجرہ) میں میران بخش نقاش کے شاگرد ہو گئے اور ان سے فن نقاشی کی تربیت حاصل کی۔ نصابی تعلیم کے حصول کے لئے سکول میں داخل ہوئے لیکن اپنی فنی سرگرمیوں کی بدولت صرف مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ پھر سکول آف آرٹس (موجودہ N.C.A) میں داخل ہو گئے اور فوٹولیتھو گرافی میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد ملازمت کا آغاز کیا اور گوجرانوالہ کے ایک سکول میں ڈرائنگ ماسٹر ہو گئے۔ یہاں ایک سال گزارنے کے بعد میو سکول آف آرٹس میں استاد مقرر ہوئے لیکن تھوڑے عرصے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے کر آزادانہ طور پر اپنا کام شروع کر دیا ان کے بنائے ہوئے فن پاروں کی پہلی نمائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ اس نمائش میں پیش کی جانے والی تصاویر کو خوب پسند کیا گیا ار نواب آف بہاولپور نے ان کی فنی مہارت کو سراہتے ہوئے تمام تصاویر خرید لیں۔ اس کے بعد بطور مصور برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں آپ کی شہرت پھیل گئی اور کلکتہ، مدراس اور بمبئی سے نکلنے والے مختلف آرٹ میگزینوں میں آپ کے بنائے ہوئے فن پارے شائع ہونے شروع ہو گئے جن کی بدولت عوامی سطح پر ان کے فن کی خوب پذیرائی ہوئی۔

۱۹۲۳ء میں لندن میں آپ کی بنائی ہوئی تصاویر کی نمائش ہوئی۔

۱۹۲۴ء میں "ویمبلے" میں عالمی مصوروں کے فن پاروں کی نمائش ہوئی۔ اس نمائش میں عبدالرحمٰن چغتائی کو

"The newer and modern school of art"

کا خطاب دیا گیا۔

۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سے مشاورت کے بعد دیوان غالب کے تصویری ایڈیشن کیلئے کام شروع کیا اور ۱۹۲۸ء میں یہ کتاب "مرقع چغتائی" کے نام سے چھپی۔ غالب کی شاعری پر دوسری کتاب "نقش چغتائی" کے نام سے چھپی۔ "مرقع چغتائی" کا دیباچہ علامہ اقبال نے لکھا اور اس منفرد تجربے کو خواب سراہا گیا اور اس کتاب پر امریکہ، جرمنی اور برطانیہ کے مختلف اخبارات و رسائل میں تبصرے شائع ہوئے۔

۱۹۳۱ء میں عبدالرحمٰن چغتائی لندن گئے اور وہاں آرٹ سے متعلق معلومات حاصل کیں اور مختلف مصوروں کے فن پاروں کا مشاہدہ کیا۔ اس سفر کی بدولت آپ کے فن میں مزید پختگی پیدا ہوئی اور آپ کے نظریہ فن میں تنوع پیدا ہوا۔

۱۹۳۶ء میں سنٹرل سکول آف آرٹس اینڈ کرافٹس لندن سے "اپچنگ اینڈ ایکوینٹنگ" کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ آپ الحمرا آرٹس کونسل کے بانیوں میں سے ہیں۔ عبدالرحمٰن چغتائی نے امتیاز علی تاج، ایم ڈی تاثیر اور بیگم جہاں آراء شاہنواز کی کوششوں سے الحمرا آرٹس کونس کا قیام عمل میں آیا اور اس کا باقاعدہ افتتاح ۱۹۴۹ء میں عبدالرحمٰن چغتائی تصویری نمائش سے ہوا۔ اس نمائش کا افتتاح وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے کیا اور اس میں شہنشاہ ایران کے علاوہ امریکہ، چین اور لندن کے مختلف وفود نے شرکت کی۔ الحمراء آرٹس کونسل کا مونوگرام بھی عبدالرحمٰن چغتائی نے تیار کیا ہے۔

۱۹۵۹ء میں کراچی آرٹس کونسل کا قیام عمل میں آیا تو اس کا افتتاح بھی عبدالرحمٰن چغتائی کے بنائے ہوئے فن پاروں کی نمائش سے ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی فنی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت پاکستان کی طرف سے

انہیں پرائیڈ آف پرفارمنس اور ۱۹۶۰ء میں ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے شہ پاروں کی نمائش دنیا کے بڑے بڑے آرٹ مراکز میں منعقد ہوئیں۔ ان کی تصاویر برٹش میوزیم لندن' وکٹوریہ البرٹ میوزیم لندن' نیشنل میوزیم آف دہلی' اقوام متحدہ ہیڈکوارٹر نیویارک' یو ایس اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ واشنگٹن' کینیڈی میوزیم بوسٹن اور انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کی عمارت ہالینڈ میں آویزاں ہیں جو کہ پاکستان کیلئے بہت بڑا اعزاز ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی نے تقریباً" دو ہزار آرٹ کے شہ پارے بنائے۔ ۱۳۰۰ اسکیچنگ اور ایکوائنٹ کے نمونے اور ہزارہا پنسل اسکیچ تخلیق کئے۔ عبدالرحمٰن چغتائی نہ صرف لاہور سکول آف آرٹ کے بانی ہیں بلکہ اس سکول کے واحد نمائندے اور فنکار ہیں۔ ان کا آرٹ بین الاقوامی سطح پر مانا گیا لیکن اس کی پیروی میں ان کے بعد کوئی آگے نہ بڑھا۔ ان کے انفرادی سکول آف آرٹ پر ترکی' ایران' ہندو پاک' چین اور جاپان کے آرٹ کے اثرات ہیں۔ انہوں نے اپنی تصاویر میں مشرقی تہذیب و تمدن اور فکر و نظر کو اجاگر کیا۔ انہیں انفرادیت اور فنی پختگی کی بدولت "مصور مشرق" کے خطاب سے نوازا گیا۔ حکومت برطانیہ نے انہیں ۱۹۳۴ء "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا۔

ان کی مصوری کی کتب مرقع چغتائی' نقش چغتائی' عمل چغتائی' (کلام اقبال کا مصور ایڈیشن) اور چغتائی ببینٹنگز لافانی تخلیقات ہیں۔ پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ اور سکے ڈیزائن کرنے کا اعزاز بھی عبدالرحمٰن چغتائی کو حاصل ہے۔ مصوری کے علاوہ انہوں نے بے شمار مضامین' افسانے اور فلم اسکرپٹ تحریر کئے۔ انہیں آرٹ کے نوادرات جمع کرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ان کے اس مجموعے میں ہندو پاک کے مصوری کے نمونے' مغربی مصوروں کے فن پارے جاپانی لکڑی کا کام' مسلمانوں کی خطاطی کے نمونے اور آرٹ پر بے شمار نادر کتابیں شامل ہیں۔

عبدالرحمٰن چغتائی کا انتقال ۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو ہوا۔ آپ کو قبرستان میانی صاحب میں امانتاً" سپرد خاک کیا گیا اور بعد ازاں آپ کے جسد خاکی کو ان

کے قائم کردہ میوزیم "عبدالرحمٰن چغتائی میوزیم" واقع گارڈن ٹاؤن نزد کلمہ چوک۔ فیروز پور روڈ منتقل کر دیا گیا۔ اس میوزیم کے نگران ان کے اکلوتے صاحبزادے عارف رحمان چغتائی ہیں جو اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھائے ہوئے ہیں۔

عبدالرحمٰن چغتائی اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی تصاویر میں آج بھی زندہ ہیں اور جب تک یہ فن موجود ہے ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

رستم زماں گاما پہلوان

گاما پہلوان ۱۸۸۶ء کو ریاست دیتا (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عزیز پہلوان تھا اور وہ بھوانی سنگھ راجہ دیتا کے ہاں ملازم تھے۔ گاما پہلوان کے دادا شال بانی کا کام کرتے تھے۔ گاما کے والد عزیز پہلوان ۳۵ برس کی عمر میں اس وقت انتقال کر گئے جب گاما کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ والد کی وفات کے بعد ان کی پرورش راجہ دیتا نے اپنے ذمے لے لی۔ سات برس کی عمر میں گاما اپنے ماموں بوٹا پہلوان کے پاس جودھپور چلے گئے۔ بوٹا پہلوان اس وقت ہندوستان کے مشہور معروف پہلوان تھے۔

جودھپور آکر گاما پہلوان راجہ صیسونت سنگھ مہاراجہ جودھپور کے زیر نگرانی آ گئے اور استاد مادھو سنگھ پہلوان کے شاگرد ہو گئے۔ بہت چھوٹی عمر ہی میں بڑے تنومند اور طاقتور تھے۔ بچپن ہی میں ۱۸۰۰ بیٹھک لگا کر مہاراجہ سے انعام حاصل کیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں نامی گرامی پہلوان کا روپ دھار چکے تھے۔

گاما پہلوان نے اپنی زندگی کا پہلا قابل ذکر مقابلہ ریاست دیتا میں ہندوستان کے نامی پہلوان للہ آگرہ والد سے کیا اور تین منٹ میں کامیابی حاصل کر کے اپنی شہرت کے ہر طرف جھنڈے گاڑ دیئے۔ اس کے چھ ماہ بعد ہزارہ سنگھ پہلوان المعروف تکڑ سنگھ جٹ کو بھی تین منٹ میں جت کر دیا اور پھر کامیابیوں کا ایک مسلسل سلسلہ چل نکلا۔ لاہور کے اس وقت کے مشہور پہلوان علی سائیں کے ساتھ اندور میں کشتی لڑی اور سات منٹ میں مقابلہ جیت لیا۔ اس کے علاوہ خلیفہ غلام محی الدین پہلوان، حسن بخش پہلوان ملتانیا کو شکست

دی۔ لاہور میں بہت بڑی نمائش کے موقع پر مہاراجہ پٹیالہ کے پہلوان چندرا سنگھ اور رحیم سلطانیے کو شکست دی۔

۱۹۱۰ء میں لندن میں نمائشی کشتیوں کے مقابلے منعقد ہوئے۔ ان مقابلوں میں فتح حاصل کرنے والے کو رستم زماں کے اعزاز سے نوازا جانا تھا۔ گاما پہلوان چھ پہلوانوں کے ساتھ لندن روانہ ہوئے۔ وہاں انہیں رستم زماں کے مقابلوں میں شامل کرنے سے انکار کر دیا گیا کیونکہ وہ لائٹ ویٹ تھے۔ گاما پہلوان نے اپنی طرف سے اخبار میں چیلنج چھپوا دیا کہ جو پہلوان اس کے ساتھ پانچ منٹ تک کشتی لڑے اور شکست نہ کھائے اسے انعام سے نوازا جائے گا۔ لندن کے ایک تھیٹر نے ان چیلنجی کشتیوں کا انتظام کیا۔ گاما پہلوان نے لندن میں آئے ہوئے تقریباً" پانچ سو (۵۰۰) پہلوانوں کو پانچ منٹ کے اندر اندر شکست دی۔ شکست کھانے والے پہلوانوں میں زلسبکو (روس)' ہیکن سمھ (انگلستان)' جان سیم (اٹلی) اور کھری (انگلستان) جیسے مشہور پہلوان شامل تھے۔

گاما کی ان ناقابل یقین کامیابیوں کی وجہ سے رستم زماں کے مقابلے کروانیوالی انتظامیہ کو انہیں مجبوراً" ہیوی ویٹ کلاس میں شامل کرنا پڑا۔ گاما نے زلسبکو کو کشتی کا چیلنج کیا۔ وہ روس کا مشہور پہلوان تھا۔ پہلی چیلنجی کشتی تین گھنٹے تک جاری رہی اور زلسبکو نے خود ہی شکست تسلیم کر لی اور گاما کو آٹھ دن بعد کشتی کرنے کا چیلنج دیدیا۔

آٹھ دن بعد یہ مقابلہ دیکھنے کیلئے ہزاروں کی تعداد میں تماشائی جمع ہوئے لیکن زلسبکو میدان میں نہ آیا۔ اس طرح گاما کو فاتح تسلیم کر لیا گیا اور رستم زماں کے اعزاز سے نوازا گیا۔

اس کے بعد رستم زماں گاما پہلوان نے پوری دنیا کے پہلوانوں کو چیلنج کیا لیکن ان کے ساتھ کسی کو مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

طاقت اور قوت کا یہ عظیم مجسمہ لاہور میں ۲۳ مئی ۱۹۶۰ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گیا اور قبرستان پیر مکی کے احاطے میں دفن ہوا۔

میجر شبیر شریف شہید

(ستارہ جرات' نشان حیدر)

شبیر شریف ۲۸ اپریل ۱۹ء کو کنجاہ (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد شریف فوج میں میجر تھے۔ ابتدائی تعلیم پریزنٹیشن کانونٹ Perentation convent سکول راولپنڈی سے حاصل کی۔ والد کی ٹرانسفر کوئٹہ ہوئی تو سینٹ فرانسس گرائمر سکول (St. Francis grammar school) کوئٹہ میں داخل ہو گئے اور پھر لاہور کے سینٹ انتھونی (St Anthony) سکول کے طالب علم رہے۔ سکول میں ہاکی اور کرکٹ کے ساتھ ساتھ بہت اچھے اتھلیٹ بھی تھے۔ سینٹ انتھونی ہائی سکول سے ۱۹۶۰ء میں سینئر کیمرج کا امتحان پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج میں زیر تعلیم تھے کہ انہیں فوج میں کمیشن مل گیا۔ اور وہ ملٹری اکیڈمی کاکول میں تربیت حاصل کرنے لگے۔

شبیر شریف مقررانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھے اور انگریزی بول چال پر انہیں ملکہ حاصل تھا۔ انہی خوبیوں کی بناء پر ملٹری اکیڈمی میں لٹریری اینڈ ڈبیٹنگ کلب کے صدر مقرر ہوئے۔ کورس کی تکمیل کے بعد بٹالین سینئر انڈر آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اعزازی شمشیر حاصل کی' بعدازاں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے ۶ ایف ایف (فرنٹیئر فورس رجمنٹ) میں پوسٹ ہو گئے اور کوہاٹ چلے گئے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے ان کی رجمنٹ ۶ ایف ایف جھمب جوڑیاں سیکٹر میں متعین تھی۔ ۴ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اس رجمنٹ کو دشمن کے علاقوں ٹروٹی چوٹی اور جک بھگوان پر حملے کا حکم ملا۔ شبیر شریف ڈی کمپنی میں تھے جس کا ٹارگٹ ٹروٹی چوٹی تھا۔ میدان جنگ میں چاروں طرف بم پھٹ رہے تھے۔ گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ لیکن سیکنڈ لیفٹیننٹ شبیر پورے سکون سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ توپ کے گولے کا ایک ٹکڑا اس کے دائیں بازو میں آ کر لگا۔ درد کی شدید لہر اٹھی۔ لیکن اس کی رفتار میں کمی نہ آئی۔ اس نے اپنے تھیلے سے ڈریسنگ نکالی' چلتے چلتے اسے زخم پر لپیٹا اور ایڈوانس جاری رکھا۔ وہ واحد افسر تھا جو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ٹارگٹ تک پہنچا اور ٹروٹی چوٹی کے بائیں کونے پر قابض ہو گیا۔ تین گھنٹے گھمسان کا رن رہا۔ بالآخر ۶ ایف ایف کو حکم ملا کہ وہ واپس آ کر چک بھگوان کے پیچھے دفاعی پوزیشن سنبھالے۔ شبیر شریف بھی چوٹی سے نیچے اتر آئے۔ زخموں اور شہیدوں کو اکٹھا کرنے کا کام شروع ہوا۔ شبیر شریف میدان جنگ سے شہیدوں کو کمر پر لاد کر اور زخمیوں کو سہارا دے کر لائے۔

حملے میں یونٹ کے دس افراد شہید اور چون زخمی ہوئے تھے۔ یونٹ کی تمام گاڑیاں دریائے توی کے اس پار چھوڑ دی گئی تھیں۔ لہٰذا اب شہداء اور زخمیوں کو واپس لے جانے کا مسئلہ در پیش تھا۔ شبیر شریف نے ایڈجوٹنٹ سے درخواست کی کہ اگر اسے اجازت دی جائے تو وہ دشمن کی کوئی گاڑی چھین لاتا ہے لیکن ایڈجوٹنٹ نے اس کی اجازت نہ دی۔

شبیر شریف اجازت نہ ملنے کے باوجود دو جوانوں کے ساتھ دشمن کے توپ خانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ شبیر شریف توپ خانے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک مرسڈیز ٹرک میں بھارتی ڈرائیور بیٹھا ہے۔ یہ اس کے قریب گئے اور اسے ٹرک سے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ شبیر شریف کی وردی خون آلود تھی اس لیے کوئی واضح شناخت نہ تھی۔ ڈرائیور نے ان کے حکم کی فوراً تعمیل کی۔

شبیر نے اپنے دونوں ساتھیوں کو زخمیوں کی تلاش میں روانہ کیا اور ڈرائیور سے پچپن پونڈ کا گولہ پھینکنے والی ایک توپ اور ایمونیشن گاڑی کو ٹرک کے ساتھ بند ہوایا۔ اس دوران زخمیوں کو لے کر دونوں جوان بھی پہنچ چکے تھے۔ شبیر نے زخمیوں کو ٹرک میں سوار کرایا اور دونوں ساتھیوں کو زیر لب بتایا کہ اس ڈرائیور کو اپنے درمیان بٹھالیں۔ ایک ہاتھ سے سٹیرنگ سنبھالا اور اپنی پوزیشن کی طرف روانہ ہوئے۔

بھارتی ڈرائیور کچھ دیر تو حیران حیران چپ چاپ بیٹھا رہا پھر چلایا سر! "آپ کدھر جا رہے ہیں" شبیر نے جواب دیا "ہاں ادھر ہی جانا ہے" اب بھارتی ڈرائیور کو علم ہوا کہ وہ بلاچون و چرا جس افسر کے احکامات کی تعمیل کرتا رہا ہے وہ بھارتی نہیں بلکہ پاکستانی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی احتجاج کرتا شبیر کے ساتھی اس کی مشکیں کس چکے تھے۔

۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ۶ ایف ایف نے دوبارہ ایڈوانس شروع کیا اور نہ صرف ٹروٹی فتح کر لیا گیا بلکہ جوڑیاں بھی سرنگوں ہو گیا۔ ۶ ستمبر کی صبح شبیر کے چہرے پر نقاہت کی زردی دیکھتے ہوئے ایڈجوٹنٹ نے ان کے بازو کی پٹی کھولی تو حیرت سے ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کہ بم کا جو ٹکڑا ان کے بازو میں لگا تھا وہ بدستور بازو کے اندر تھا زخم بگڑ چکا تھا۔ اور اس میں پیپ پڑ گئی تھی۔ شبیر شریف کو ڈریسنگ سٹیشن کی طرف مرہم پٹی کے لیے بھجوایا گیا۔ یہاں ان کے بازو سے بم کا ٹکڑا نکالا گیا۔ زخم صاف کر کے مرہم پٹی کی گئی اور ۶ ستمبر ہی کو انہیں سی ایم ایچ کھاریاں میں داخل کروا دیا گیا۔ اس دوران بھارت نے لاہور اور سیالکوٹ پر حملہ کر دیا اور ۶ ایف ایف نے بھی پوزیشن سنبھال لی۔

اس سیکٹر میں ۹ ستمبر کی دوپہر کا ذکر ہے کہ ایک شخص کو ہیڈکوارٹر کی طرف آتے دیکھا گیا۔ وہ شبیر شریف تھے۔ استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ ہسپتال سے بھاگ آیا ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ یونٹ ایکشن میں ہو اور شبیر بستر پر پڑا رہے۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنگ بندی کا حکم ہوا۔ یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء کو شبیر شریف کو لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ملی اور کشمیر میں دلیری و شجات کے

مظاہرے پر حکومت نے ستارہ جرات کے اعزاز سے نوازا۔

۱۹ اپریل ۱۹۶۶ء کو شبیر شریف کو کیپٹن کے عہدہ پر ترقی دے کر سگنل آفیسر کے فرائض سونپے گئے۔ یکم جون ۱۹۶۶ء کو ایڈجوٹنٹ مقرر ہوئے اور ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء کو شبیر شریف میجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنگ اپنے عروج پر تھی اور شبیر شریف کی کمپنی سیونہ بند پر اپنی پوزیشن خاصی مستحکم کیے ہوئے تھے۔ رات کو دشمن نے سخت ترین حملہ کیا۔ ہوائی' انفنٹری اور توپ خانے کے حملے نے سردی کے موسم کو شدید گرمی میں تبدیل کر دیا۔ میجر شبیر کی کمپنی نے دشمن پر فائر کھول دیا مگر جلد ہی شبیر نے فائرنگ روکنے کا حکم دیا اور ہدایت کی کہ دشمن کو قریب آنے دیا جائے۔ دشمن افواج بدستور پیش قدمی کر رہی تھیں۔ دشمن فوج کے ایک آفسر نے فاسفورس گرینڈ شبیر کی طرف اچھال دیا۔ یہ گرینڈ میجر شبیر کے بالکل قریب پھٹا اور ان کی جرسی کو آگ لگ گئی۔ شبیر نے آگ کی پرواہ نہ کی۔ ان کے ساتھیوں نے ان کے جسم پر مٹی ڈال کر آگ بجھائی۔ تھوڑی دیر کی کشمکش کے بعد دشمن کے سپاہی بھاگ گئے۔

فاسفورس کے گرینڈ سے شبیر کا چہرہ دائیں جانب سے زخمی ہو گیا تھا۔ ان کو بٹالین ہیڈکوارٹر نے ہدایت کی کہ وہ پیچھے چلے آئیں اور ان کی جگہ کوئی دوسرا افسر بھیج دیا جائے لیکن انہوں نے اپنے جوانوں کو چھوڑ کر پیچھے آنے سے انکار کر دیا اور وہیں پر ان کی مرہم پٹی کی گئی۔ ۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو دن کے گیارہ بجے بھارتیوں نے ٹینکوں کی مدد سے دوبارہ بھرپور حملہ کیا۔ اس سے پہلے بھارتی توپ خانے نے تقریباً" چار گھنٹے تک زبردست آگ برسائی تھی۔ اسی دوران ٹینک کا ایک گولہ ان کے بالکل قریب آ کر پھٹا اور میجر شبیر اور ان کے دو ساتھیوں کو کئی فٹ تک فضا میں اچھال گیا۔ میجر شبیر کا جسم تو زمین پر آ گیا لیکن روح وہیں قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور شبیر شریف اس فانی زندگی کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی زندگی کی سرحدوں میں داخل ہو گئے۔

میجر شبیر شریف کے جسد خاکی کو قبرستان میانی صاحب میں طاہر بندگی روڈ پر سپرد خاک کیا گیا۔ یہ واحد نشان حیدر کا اعزاز پانے والے شہید ہیں جن کا مدفن لاہور ہے۔ ان کے آبائی گاؤں کے بجائے انہیں لاہور میں ان کی وصیت کے مطابق دفن کیا گیا۔

میجر شبیر شریف کی پوری زندگی پامردی، دلیری اور استقلال کے جذبوں سے عبارت ہے۔ اس نامور سپوت کا نام ابد تک زندہ و پائندہ رہے گا۔

کتابیات

کتب:

- خفتگان خاک لاہور، پروفیسر محمد اسلم، ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور
- کاروان شوق، حکیم آفتاب احمد قریشی، ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور
- تاریخ لاہور، کنہیال لال ہندی، مجلس ترقی ادب لاہور۔
- فیض صاحب شخصیت اور شاعری، مرتب امتیاز علی، مکتبہ فیاض، اردو بازار لاہور۔
- تذکرہ حضرت شاہ عنایت قادری، قاری غلام فرید الحسن، جہانگیر کاپی ہاؤس، اردو بازار لاہور۔
- جدید تذکرہ اولیاء پاک و ہند، ڈاکٹر ظہور الحسن شارب، حامد اینڈ کمپنی لاہور۔
- صوفیائے پنجاب، اعجاز الحق قدوسی، سلمان اکیدمی کراچی۔
- سیدی ابوالبرکات، مرتب سید محمود احمد رضوی، دارالعلوم حزب الاحناف لاہور۔
- دامن دے موتی، مرتب سائیں اختر حسین وحید مرزا، فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور۔
- مشاہیر علماء، ڈاکٹر قاری فیوض الرحمٰن، فرنٹیئر پبلشنگ کمپنی اردو بازار لاہور۔

- فاتح سبونہ، میجر اشفاق حسین، آرمی ایجوکیشن پریس راولپنڈی۔
- غازی علم دین شہید، میاں محمد ابوالفتح ایڈووکیٹ، مکتبہ میری لائبریری لاہور۔
- وفیات مشاہیر پاکستان، پروفیسر محمد اسلم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔
- شاکر علی فن اور شخصیت، پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس لاہور۔
- جالب بیتی، حبیب جالب، جنگ پبلشرز لاہور۔
- فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، بزم اقبال لاہور۔

مقالات:

- محمد طفیل عبث خاکہ نگار، مقالہ نگار نزہت زہرا گردیزی، اورینٹل کالج لاہور۔
- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مقالہ نگار ممتاز اختر مرزا، " "
- سجاد باقر رضوی فن اور شخصیت، مقالہ نگار محمد اسلم شاہد " "
- چوہدری افضل حق، مقالہ نگار شمیم منیر " "
- سید وقار عظیم، مقالہ نگار محمد ارشد عثمان " "
- صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مقالہ نگار نثار احمد قریشی " "
- ساغر صدیقی، مقالہ نگار، پرویز احمد چوہدری " "
- سید ابوالاعلیٰ مودودی، مقالہ نگار طلعت ظہور " "
- میر غلام بھیک نیرنگ، مقالہ نگار گیتی آراء سالک " "
- فیض کی غزل گوئی، مقالہ نگار، ماہرہ خانم " "
- علامہ عنایت اللہ مشرقی، مقالہ نگار کثیر ساجد " "
- چوہدری افضل حق، مقالہ نگار شمیم منیر " "
- ڈاکٹر تصدق حسین خالد، مقالہ نگار عاتکہ صدیقہ " "
- آغا شورش کاشمیری بحیثیت صحافی، مقالہ نگار وتار اللہ باز " "
- سیف اللہ سیف، مقالہ نگار نوشیلہ فرحت " "
- چراغ حسن حسرت، مقالہ نگار ایم عبدالماجد " "

- سید امتیاز علی تاج، مقالہ نگار عبدالحفیظ " "
- ایم اسلم کے افسانے، خاکے اور مضامین، مقالہ نگار شہناز کوثر " "
- حفیظ جالندھری، (شاعری) مقالہ نگار سیدہ ناصرہ خاتون " "
- احسان دانش، مقالہ نگار کوثر تسنیم " "
- چراغ دین دامن (حیاتی کے کلام)، مقالہ نگار محمد ظہیر اختر " "
- سید عبداللہ بطور نقاد، مقالہ نگار مصباح اکرام " "
- سعادت حسن منٹو سوانح اور ادبی کارنامے، مقالہ نگار ثناء بخاری " "
- شوکت تھانوی سوانح اور ادبی خدمات، مقالہ نگار سعید مرتضیٰ زیدی۔
- خواجہ دل محمد، مقالہ نگار فریدہ خانم۔
- حفیظ جالندھری مقالہ نگار سیدہ فرخ تبسم
- آغا حشر کاشمیری مقالہ نگار افسانہ کمال۔
- خدیجہ مستور کی ناول نگاری، مقالہ نگار سیدہ عظمت۔
- اختر شیرانی، مقالہ نگار روزینہ سعید اورنٹل کالج لاہور۔

حمیرہاشمی

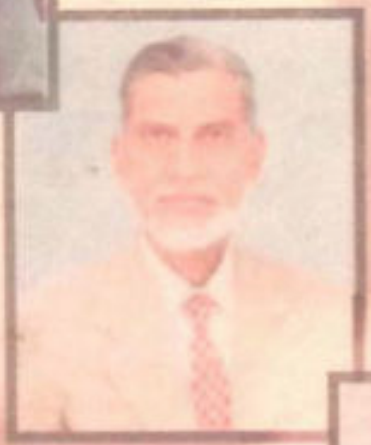

محمد اسلم انصاری

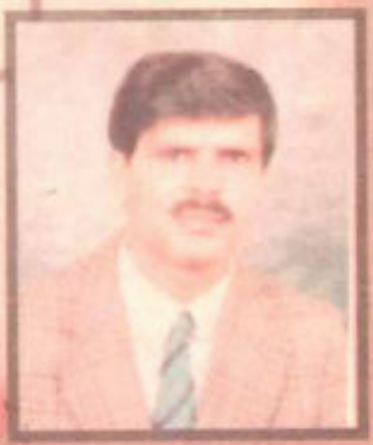

ممتاز حسین نعیم

علم و عرفان پبلشرز